دینی تعلیم

محمد حسین طباطبائی

مفسر تفسیر المیزان

مرتبہ: سید مہدی آیت اللہی

مترجم: سید قلبی حسین رضوی

مجمع جہانی اہل بیت علیہم السلام

فہرست مطالب

حرف اول

جب آفتاب عالم تاب افق پر نمودار ہوتا ہے کائنات کی ہر چیز اپنی صلاحیت و ظرفیت کے مطابق اس سے فیضیاب ہوتی ہے حتی ننھے ننھے پودے اس کی کرنوں سے سبزی حاصل کرتے اور غنچہ و کلیاں رنگ ونکھار پیدا کرلیتی ہیں تاریکیاں کافور اور کوچہ و راہ اجالوں سے پرنور ہوجاتے ہیں، چنانچہ متمدن دنیا سے دور عرب کی سنگلاخ وادیوں میں قدرت کی فیاضیوں سے جس وقت اسلام کا سورج طلوع ہوا، دنیا کی ہر فرد اور ہر قوم نے قوت و قابلیت کے اعتبار سے فیض اٹھایا۔

اسلام کے مبلغ و موسس سرور کائنات حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم غار حراء سے مشعل حق لے کر آئے اور علم و آگہی کی پیاسی اس دنیا کو چشمہ حق و حقیقت سے سیراب کردیا، آپ کے تمام الٰہی پیغامات، ایک ایک عقیدہ اور ایک ایک عمل فطرت انسانی سے ہم آہنگ ارتقائے بشریت کی ضرورت تھا، اس لئے ۲۳ برس کے مختصر عرصے میں ہی اسلام کی عالمتاب شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں اور اس وقت دنیا پر حکمراں ایران و روم کی قدیم تہذیبیں اسلامی قدروں کے سامنے ماند پڑگئیں، وہ تہذیبی اصنام جو صرف دیکھنے میں اچھے لگتے ہیں اگر حرکت و عمل سے عاری ہوں اور انسانیت کو سمت دینے کا حوصلہ، ولولہ اور شعور نہ رکھتے تو مذہب عقل و آگہی سے روبرو ہونے کی توانائی کھودیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ایک چوتھائی صدی سے بھی کم مدت میں اسلام نے تمام ادیان و مذاہب اور تہذیب و روایات پر غلبہ حاصل کرلیا۔

اگر چہ رسول اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی یہ گرانبہا میراث کہ جس کی اہل بیت علیہم السلام اور ان کے پیروؤں نے خود کو طوفانی خطرات سے گزار کر حفاظت و پاسبانی کی ہے، وقت کے ہاتھوں خود فرزندان اسلام کی بے توجہی اور ناقدری کے سبب ایک طویل عرصے کے لئے تنگنائیوں کا شکار ہوکر اپنی عمومی افادیت کو عام کرنے سے محروم کردئی گئی تھی، پھر بھی حکومت و سیاست کے عتاب کی پروا کئے بغیر مکتب اہل بیت علیہم السلام نے اپنا چشمۂ فیض جاری رکھا اور چودہ سو سال کے عرصے میں بہت سے ایسے

جلیل القدر علماء و دانشور دنیائے اسلام کو تقدیم کئے جنھوں نے بیرونی افکارو نظریات سے متاثر اسلام و قرآن مخالف فکری و نظری موجوں کی زد پر اپنی حق آگیں تحریروں اور تقریروں سے مکتب اسلام کی پشت پناہی کی ہے اور ہر دور اور ہر زمانے میں ہر قسم کے شکوک و شبہات کا ازالہ کیاہے، خاص طور پر عصر حاضر میں اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد ساری دنیا کی نگاہیں ایک بار پھر اسلام و قرآن او رمکتب اہل بیت علیہ السلام کی طرف اٹھی او رگڑی ہوئی ہیں، دشمنان اسلام اس فکر و معنوی قوت و اقتدار کو توڑنے کے لئے اوردوستداران اسلام سے اس مذہبی اور ثقافتی موج کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑنے اور کامیاب و کامران زندگی حاصل کرنے کے لئے بے چین و بے تاب ہیں، یہ زمانہ عملی اور فکری مقابلے کا زمانہ ہے اورجو مکتب بھی تبلیغ او رنشر و اشاعت کے بہتر طریقوں سے فائدہ اٹھا کر انسانی عقل و شعور کو جذب کرنے والے افکار و نظریات دنیاتک پہنچائے گا، وہ اس میدان میں آگے نکل جائے گا۔

(عالمی اہل بیتؑ کونسل) مجمع جہانی اہل بیت علیہم السلام نے بھی مسلمانوں خاص طور پر اہل بیتؑ عصمت و طہارت کے پیروؤں کے درمیان ہم فکری و یکجہتی کو فروغ دینا وقت کی ایک اہم ضرورت قرار دیتے ہوئے اس راہ میں قدم اٹھایاہے کہ اس نورانی تحریک میں حصہ لے کر بہتر اندازسے اپنا فریضہ ادا کرے، تا کہ موجود دنیا ئے بشریت جو قرآن و عترت کے صاف وشفاف معارف کی پیاسی ہے زیادہ سے زیادہ عشق و معنویت سے سرشار اسلام کے اس مکتب عرفان و ولایت سے سیراب ہوسکے، ہمیں یقین ہے عقل و خرد پر استوار ماہرانہ انداز میں اگر اہل بیتؑ عصمت و طہارت کی ثقافت کو عام کیا جائے۔

اور حریت و بیداری کے علمبردار خاندان نبوتؐ و رسالت کی جاوداں میراث اپنے صحیح خدو خال میں دنیا تک پہنچادی جائے تو اخلاق وانسانیت کے دشمن، انانیت کے شکار، سامراجی خون خواروں کی نام نہاد تہذیب و ثقافت اور عصر حاضر کی ترقی یافتہ جہالت سے تھکی ماندی آدمیت کو امن و نجات کی دعوتوں کے ذریعہ امام عصر (عج) کی عالمی حکومت کے استقبال کے لئے تیار کیا جاسکتا ہے۔ ہم اس راہ میں تمام علمی و تحقیقی کوششوں کے لئے محققین و مصنفین کے شکر گزار ہیں اور خود کو مؤلفین و مترجمین کا ادنی خدمتگار تصور کرتے ہیں، زیر نظر کتاب، مکتب اہل بیت علیہم السلام کی ترویج و اشاعت کے سلسلے کی ایک کڑی ہے، علامہ طباطبائی کی

گرانقدر کتاب ''دینی تعلیم'' کو مولانا سید قلبی حسین رضوی نے اردو زبان میں اپنے ترجمہ سے آراستہ کیا ہے جس کے لئے ہم دونوں کے شکر گزار ہیں اور مزید توفیقات کے آرزومند ہیں، اسی منزل میں ہم اپنے تمام دوستوں او رمعاونین کا بھی صمیم قلب سے شکر یہ ادا کرتے ہیں کہ جنھوں نے اس کتاب کے منظر عام تک آنے میں کسی بھی عنوان سے زحمت اٹھائی ہے، خدا کرے کہ ثقافتی میدان میں یہ ادنی جہاد رضائے مولی کا باعث قرار پائے۔

والسلام مع الاکرام

مدیر امور ثقافت، مجمع جہانی اہل بیت علیہم السلام

دینی معلومات

لفظ ''دین'' کثیر الاستعمال الفاظ میں سے ایک ہے ۔عام طور پر دیندار اسے کہتے ہیں جو کائنات کے لئے ایک خدا کا قائل ہو اور اس کی خوشنودی کے لئے خاص قسم کے اعمال بجا لاتا ہو۔ ممکن ہے ہر معاشرے اور ملت میں،قانون کے مطابق معاشرہ کے ہر فرد کے لئے فرائض معین ہوئے ہوں،اور ان پر لوگ عمل کرتے ہوں، تو یہ تصور کیا جائے کہ وہاں پھر ''دین'' کی ضرورت نہیں ہے ،لیکن اسلام کے احکام اور ضوابط پر سنجیدگی سے غور کرنے سے اس معنی کے خلاف ثابت ہوتا ہے،کیونکہ دین اسلام صرف خدا کی عبادت و ستائش تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اس میں انسان کے تمام انفرادی و اجتماعی مسائل کے لئے جامع قواعد و ضوابط اور مخصوص قوانین وضع کئے گئے ہیں اور بشریت کی وسیع دنیا کے بارے میں حیرت انگیز صورت میں تحقیق کی گئی ہے۔اور انسان کی ہر انفرادی و اجتماعی حرکت و سکون کے لئے مناسب قوانین وضع کئے گئے ہیں ۔ایسے دین کو تکلفاتی اور رسمی دین سے تشبیہ یا نسبت نہیں دی جا سکتی ہے ۔

خدائے متعال نے قرآن مجید میں دین اسلام کو مذکورہ بیان شدہ کیفیت میں توصیف فرمائی ہے اور اس کے علاوہ یہودیت و نصرانیت کو کہ جن کی آسمانی کتابیں توریت و انجیل ہیں اور ان میں اجتماعی احکام وقواعد وضوابط ہیں ۔اسی صورت میں بیان فرمایا ہے، چنانچہ فرماتا ہے:(وکیف یحکّمونکَ وعندہم التّورٰۃ فیہا حکم اللّٰہ۔ انا انزلنا التورٰۃ فیہا ھدیً وّ نور یحکم بہا النّبیّون الّذین اسلموا للّذین ھادوا والرّبّنیون والاحبار۔وقفینا علی اٰثارہم بعیسیٰ ابن مریم ۔وءاتینہ الانجیل فیہ ھدی وّنور و مصدقاً لما بین یدیہ من التورٰۃ و ھدی وّ موعظۃ للمتّقین و لیحکم اھل الانجیل بما انزل اللّٰہ فیہ۔ و انزلنا الیک الکتٰب بالحق مصد قاً لما بین یدیہ من الکتب و مھیمنا علیہ فاحکم بینہم بما انزل اللّٰہ[1]) ''اور یہ کس طرح آپ سے فیصلہ کرائیں گے جب کہ ان کے پاس توریت موجود ہے جس میں حکم خدا بھی ہے...بیشک

---

[1] مائدہ۴۳۔۴۸

ہم نے توریت کو نازل کیا جس میں ہدایت اور نور ہے اور اس کے ذریعہ اطاعت گزار انبیاء یہودیوں کے لئے فیصلہ کرتے ہیں اور اللہ والے علماء یہود... اور ہم نے انھیں انبیاء کے نقش قدم پر عیسی بن مریم کو چلا یا ۔..اور ہم نے انھیں انجیل دیدی جس میں ہدایت اور نور تھا اور وہ اپنے سامنے کی توریت کی تصدیق کر نے والی اور ہدایت تھی اور صاحبان تقوی کے لئے سامان نصیحت تھی ...اہل انجیل کو چاہئے کہ خدا نے جو حکم نازل کیا ہے اس کے مطابق فیصلہ کریں ۔اور اے پیغمبر!ہم نے آپ کی طرف کتاب نازل کی ہے جو اپنے پہلے کی توریت اور انجیل کی مصداق اور محافظ ہے لہذا آپ ان کے درمیان تنزیل خدا کے مطابق فیصلہ کریں ''توریت اور انجیل ۔ جو اس وقت یہودو نصاری کے ہاتھ میں ہیں ۔ بھی اسی مطلب کی تائید کرتی ہیں،کیونکہ توریت میں بہت سے قوانین اور تعزیراتی ضوابط موجود ہیں اورظاہری طور پرانجیل بھی توریت کی شریعت کی تائید وتصدیق کرتی ہے ۔

نتیجہ

مذکورہ بیان سے واضح ہوتا ہے کہ ''قرآن مجید کی اصطلاح میں دین '' کہ وہی زندگی کی روش ہے،اور اس سے انسان پہلو تہی نہیں کرسکتا ۔دین اور ایک اجتماعی قانون کے درمیان جو فرق پایا جا تا ہے وہ یہ ہے کہ دین خدا کی طرف سے ہوتا ہے اور اجتماعی قانون لوگوں کے افکار کی پیداوار ہو تا ہے ۔دوسرے الفاظ میں دین لوگوں کی اجتماعی زندگی اور خدائے متعال کی پرستش اور اس کی فرمانبرداری کے درمیان ایک ربط پیدا کرتا ہے،لیکن اجتماعی قانون میں اس رابط کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی ہے ۔

خدا کے قانون سے رابط کا اچھا اثر

''دین''انسان کی اجتماعی زندگی اور خدائے متعال کی پرستش کے درمیان رابطہ پیدا کرنے کے نتیجہ میں انسان کے تمام انفرادی و اجتماعی اعمال کو خدائی ذمہ داری قرار دے کر اس کو خدا کے لئے جواب دہ جانتاہے ۔چونکہ خدائے متعال اپنی لامحدود قدرت اور بے پناہ علم کی بناپر ہر جہت سے انسان پر احاطہ رکھتا ہے اور اس کے دل ودماغ کے تمام اسرار و افکار سے مکمل طور پر آگاہ ہے اور اس سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے،اسی لئے دین نے بشری قانون کی طرح امور کے نظم و نسق کو باقی رکھنے کے لئے محافظ اور

نگہبان مقرر کئے ہیں اور مخالفت و سرکشی کرنے والوں کی سزا کے لئے قوانین وضع کر کے بشری قانون کی نسبت ایک اور امتیاز حاصل کیاہے اور وہ یہ کہ :دین،انسان کی حیرت اور ہوشیار ی کی باگ ڈور کو ایک باطنی و ابدی محافظ کے ہاتھ میں دیتا ہے۔کیوں کہ دین سے نہ غفلت ہوتی ہے اور نہ خطا اور اس کی جزا اور سزا سے کوئی بچ نہیں سکتا ۔خدائے متعال فرماتا ہے:(وہو معکم این ما کنتم) (حدید،۴) ''اور تم جہاں بھی ہو ،وہ تمہارے ساتھ ہے''(واللّٰہ بمایعملون محیط[1]) ''اور اللہ ان کے کام کا احاطہ کئے ہوئے ہے''(وانکلا لما لیوفینہم ربک اعمالہم[2]) ''اور یقیناًتمہارا پروردگار سب کے اعمال کاپوراپورا بدلہ دے گا۔''اگر ہم قانون کے دائرہ میں زندگی کرنے والے کے حالات کادین کے دائرہ میں زندگی کرنے والے کے حالات سے مواز نہ کریں گے تو دین کی برتری واضح اور روشن ہو جائے گی ۔کیونکہ جس معاشرے کے تمام افراد متدین ہوں اور اپنے دینی فرائض کو انجام دیں، ہر حالت میں خدائے متعال کو اپنے کاموں میں حاضر وناظر جانیں،تو وہ ایک دوسرے سے بد ظن نہیں ہوتے ہیں ۔

اس لئے ایسے ماحول میں زندگی کرنے والے عوام الناس،ایک دوسرے کی زبان اور ہاتھ سے محفوظ رہتے ہیں اور نہایت ہی آرام و مسرت کی زندگی گزارتے ہیں اور انھیں کوابدی سعادت نصیب ہوتی ہے۔لیکن جس ماحول میں صرف بشری قانون کی حکمرانی ہوتی ہے وہاں پر،جب تک لوگ اپنے کام پر کسی کو نگراں محسوس کرتے ہیں اس وقت تک وہ کام میں کوتاہی نہیں کرتے ،ورنہ ممکن ہیکہ وہ ہر طرح کی کوتاہی کے مرتکب ہوں ۔

جی ہاں،اخلاق کے پابند معاشرے میں ،جو دلی سکون پایا جاتا ہے،وہ اسی دین کا مرہون منت ہوتاہے نہ کہ قانون کا ۔دوسرے الفاظ میں ،دین،ایسے علمی و اخلاقی عقائد وضوابط کا مجموعہ ہے ،جسے انبیاء خدا کی طرف سے انسان کی راہنمائی اورہدایت کے لئے لائے ہیں ۔ان عقائد کو جاننا اور ان احکام پر عمل کرنا انسان کے لئے دونوں جہاں میں سعادت کا سبب بنتا ہے ۔اگر ہم دیندار ہوں اور خداو پیغمبرؐ کے احکام کی اطاعت کریں تو اس ناپائدار دنیا میں بھی خوش قسمت اوردوسری دنیا کی ابدی اور لامحدود زندگی میں بھی سعادت

---

[1] انفال،۴۷
[2] ہود،۱۱۱

مند ہوں گے۔وضاحت:ہم جانتے ہیں کہ سعادت مند وہ شخص ہے جس نے اپنی زندگی اشتباہ اور گمراہی میں نہ گزاری ہو،اس کے اخلاق پسندیدہ ہوں اور نیک کام انجام دیتا ہو۔خدا کا دین ہمیں اسی سعادت اور خوش بختی کی طرف ہدایت کرتا ہے اور حکم دیتا ہے کہ:اولاً:جن صحیح عقائد کو ہم نے اپنی عقل وشعور سے درک کیا ہے،انھیں مقدس و محترم جانیں ۔ثانیاً : ہم پسندیدہ اخلاق کے مالک ہوں اور حتی الامکان اچھے اور شائستہ کام انجام دیں،اس بناء پر دین تین حصوں میں تقسیم ہوتا ہے: ا۔عقائد

٢۔اخلاق

٣۔عمل

عقائد

اگر ہم اپنی عقل وشعور کی طرف رجوع کریں تودیکھیں گے کہ اس عظیم اور وسیع کائنات کی ہستی،اس حیرت انگیز نظام کے ساتھ، خود بخود وجود میں آنا ۔ اور اس کا اول سے آخر تک کا نظم و نسق،کسی منظم کے بغیر ہونا ممکن نہیں ہے۔یقیناً کوئی خالق ہے،جس نے اپنے لامحدود علم وقدرت سے اس عظیم کائنات کوپیدا کیا ہے اور تمام امور میں پائے جانے والے ثابت وناقابل تغییر قوانین کے ذریعہ کائنات کے نظام کوانتہائی عدل وانصاف کے ساتھ چلایاہے ۔کوئی بھی چیز عبث خلق نہیں کی گئی ہے اور کوئی بھی مخلوق خدائی قوانین سے مستثنیٰ نہیں ہے ۔

لہذا یہ باور نہیں کیا جاسکتا ہے کہ،ایسا مہربان خدا،جو اپنی مخلوق پر اس قدر مہربان ہے،انسانی معاشرے کوانسان جو زیادہ ترنفسانی خواہشات کا اسیر بن کر،گمراہی اور بد بختی سے دوچار ہوتا ہے ۔کی عقل کے رحم وکرم پر چھوڑدے ۔اس بناپر،معصوم انبیاء کے ذریعہ بشر کے لئے ایسے قواعد وضوابط کا بھیجنا ضروری ہے تاکہ ان پر عمل کر کے انسان سعادت و خوش بختی تک پہنچ جائے ۔چونکہ پروردگار کے احکام کی اطاعت کی جزا اس دنیا کی زندگی میں مکمل طور پر ظاہر نہیں ہو سکتی ،لہذا ایک ددوسرے جہان کا ہونا

ضروری ہے کہ جہاں پر لوگوں کا حساب و کتاب ہو،اگر کسی نے نیک کام انجام دیا ہے تو اسے اس کی جزا ملے اور اگر کسی سے کوئی برا کام سرزد ہوا ہو تو اسے اس کی سزا ملے ۔دین ،لوگوں کو ان اعتقادات اور دیگر تمام حقیقی عقائد ۔جن کو ہم بعد میں تفصیل سے بیان کریں گے ۔کی طرف تشویق کرتا ہے اور انھیں جہل و بے خبری سے پرہیز کرنے کی تاکید کرتا ہے ۔

اخلاق

دین،کا ہم سے مطالبہ یہ ہے کہ زندگی میں پسندیدہ صفات اختیار کریں اور اپنے آپ کو قابل ستائش اورنیک خصلتوں سے آراستہ کریں ۔ہم فرض شناس،خیر خواہ،انسان دوست، مہربان،خوش اخلاق اور انصاف پسند بن کر حق کا دفاع کریں ۔اپنے حدوداور حقوق سے آگے نہ بڑھیں اور لوگوں کے مال ،عزت،آبرو او رجان پر تجاوز نہ کریں ۔علم ودانش حاصل کرنے میں کسی بھی قسم کے ایثار اور فدا کاری سے دریغ نہ کریں، خلاصہ یہ کہ اپنی زندگی کے تمام امور میں عدل وانصاف اور اعتدال کو اپنا شیوہ قرار دیں ۔

عمل

دین ،ہمیںیہ حکم دیتا ہے کہ ہم اپنی زندگی میں وہ کام انجاں دیں جن میں ہماری اپنی اور اپنے معاشرے کی خیر وصلاح ہو ۔اورفساد وتباہی مچانے والے کاموں سے پرہیز کریں۔ اس کے علاوہ دین ہمیں یہ بھی حکم دیتا ہے کہ خدائے متعال کی عبادت وپرستش کے عنوان سے کچھ اعمال جیسے نماز، روزہ وغیرہ ۔جو بندگی اور فرمانبرداری کی نشانی ہے۔کو بجا لائیں۔یہ وہ قواعد وضوابط اور احکام ہیں ،جنھیں دین لے کر آیا ہے اور ہمیں ان کی طرف دعوت دیتا ہے ۔چنانچہ واضح ہے کہ ان ضوابط اور احکام میں سے کچھ کا تعلق عقیدہ سے کچھ کا اخلاق سے اور کچھ کا عمل سے ہے ،جیسا کہ بیان ہوچکا ہے کہ ان کو قبول کرنا اور ان پر عمل کرنا ہی انسان کے لئے سعادت و خوش بختی ہے ،کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ انسان کے لئے سعادت حاصل کرنا ممکن نہیں ہے مگر یہ کہ حقیقت شناس ہو اور پسندیدہ اخلاق و اعمال پر مبنی زندگی بسر کرے ۔

دین کا فطری ہونا

انسان اپنی فطرت اور خداداد طینت کے لحاظ سے دین کا خواہاں ہے،کیونکہ انسان اپنی زندگی کے سفر میں سعادت حاصل کرنے کے لئے مسلسل ہاتھ پاؤں مارتا ہے اور اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے ان اسباب ووسائل سے استفادہ کرتاہے جواس کے مقاصد میں مؤثر ہیں ،بیشک وہ ہمیشہ ایسے سبب کی تلاش میں ہوتاہے جو مؤثر ہو اور وہ ناکام نہ ہو ۔دوسری طرف ہم عالم طبیعت میں کوئی ایسا سبب نہیں پاتے ہیں جس کا اثر دائمی ہو اور وہ کبھی رکاوٹوں کے مقابلہ میں ناکام نہ ہو۔انسان فطرت کے مطابق اپنی سعادت کے لئے ایک ایسا سبب چاہتا ہے جو ناکام نہ ہو اور ایک ایسا پشت پناہ بھی چاہتا ہے کہ جو کبھی ساتھ نہ چھوڑے تاکہ اپنی زندگی کو اس سے منسلک کر دے اور باطنی آرام وسکون حاصل کر سکے ،حقیقت میں دین بھی یہی چاہتاہے۔ کیونکہ صرف خدائے متعال ہے جو اپنے ارادہ میں ہرگز مغلوب و ناکام نہیں ہوتا ہے اور عذر و قصور اس کے لئے قابل تصور نہیں ہے،اور خدائے متعال سے مربوط زندگی کے طریقوں کا نام ہی ''دین اسلام ہے''۔

اس بناء پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ انسان کی فطری خواہش ،دین کے تین بنیادی اصولوں توحید،نبوت اور معاد کو ثابت کرنے کے بہترین دلائل میں سے ایک ہے،کیونکہ فطری ادراک دوستی اور دشمنی کے مفہوم کو مخلوط نہیں کرتاہے اور تشنگی کو سیراب نہیں سمجھتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بعض اوقات انسان یہ تمنا کرتا ہے کہ پرندے کے مانند اس کے بھی پر ہوتے تاکہ پرواز کرتا یاایک ستارہ کے مانند آسمان پر ہوتااور طلوع وغروب کرتا ،لیکن ان کی حقیقت محض ایک تصور ہے یہ اور بات ہے کہ انسان دل کی گہرائیوں سے اپنی سعادت، مطلق راحت وسکون یا انسانی تقاضوں کی بناپر وہ سنجیدہ زندگی کی خاطر ایک پناہ گاہ کی تلاش میں ہے اور ہرگز اس سے منہ نہیں موڑتا ہے۔اگر کائنات میں ناقابل مغلوب سبب (خدا)نہ ہوتا تو انسان اپنی بے آلائش طبیعت سے اس کی فکر میں نہیں پڑتا اور اگر مطلق وآرام (جوآخرت کا سکون وآرام ہے)کا وجود نہ ہوتاتو انسان فطری طورپر اس کو پانے کی فکر ہی نہ کرتا اور اگر دینی طریقہ (جو نبوت کے ذریعہ ہم تک پہنچا ہے) حق نہ ہوتا ،تو انسان کے باطن میں اس کی تصویر بھی نہ ہوتی ۔انسان مختلف قسم کی جسمانی و روحانی ،مادی

و معنوی ضرورتیں رکھتا ہے کہ جس کو اجتماعی زندگی کے ذریعہ دور کیا جا سکتا ہے اور انسانی معاشرے کا ہر فرد عام و سائل کو استعمال کر کے،کسی رکاوٹ کے بغیر ،اس دنیا کی چند روزہ زندگی کو آرام وآسائش میں گزارتا ہے اور دوسری دنیا کے لئے زادراہ حاصل کرتا ہے۔پس انسانی معاشرے میں ایک ایسا قانون نافذ ہونا چاہئے جو خالق کائنات کے ارادہ کے مطابق اور فطرت و خلقت سے ہم آہنگ ہو۔ اس قانون کے مطابق ہر ایک کو اپنی جگہ پر قرار پانا چاہئے اور معاشرے میں اپنی قدر و منزلت کے مطابق اس سے استفادہ کرے اور دوسروں کے حقوق پر تجاوز کرنے سے پرہیز کرے آخر کار معاشرے کے تمام لوگ خدائے متعال کے ارادہ کے سامنے تسلیم ہو جائیں اور سب آپس میں بھائی بھائی اور حق وانصاف کے مقابلہ میں برابر ہو جائیں ۔

دین کے فائدے

مذکورہ بیانات سے ثابت ہوگیا کہ فرداور معاشرے کی اصلاح میں دین ایک گہرا اثر رکھتاہے بلکہ یہ سعادت ونیک بختی کا منفرد وسیلہ ہے ۔جو معاشرہ دین کا پابند نہ ہو وہ حقیقت پسندی اورجدت فکرسے محروم ہے،ایسے معاشرے کے لوگ اپنی قیمتی زندگی کو گمراہی اور ظاہر داری میں گزارتے ہیں ،عقل کو پامال کر کے حیوانوں کی طرح تنگ نظری اور بیوقوفی میں زندگی گزارتے ہیں اور اخلاقی انحطاط اورکردار کی پستی کا شکار ہوتے ہیں اور اس طرح انسانی خصوصیات و امتیازات سے محروم ہوجاتے ہیں ۔

اس قسم کا معاشرہ ،علاوہ اس کے کہ ابدی اور انتہائی کمال وسعادت تک نہیں پہنچتا ہے،اس دنیا کی ،اپنی مختصر اورناپائدار زندگی میں بھی انحرافات اور گمراہیوں کے منحوس نتائج سے دوچار ہوتا ہے اور کسی نہ کسی وقت اپنی غفلت کے برے نتائج کو بھگتے گا اور واضح طورپر اسے معلوم ہو گا کہ سعادت کا راستہ دین ہی تھا اور سرانجام اپنے کردارسے پشیمان ہو گا ۔ خدائے متعال قرآن مجید میں فرماتا ہے: (قد افلح من زکٰیھا *وقد خاب من دسّٰھا[۱]) ''بیشک وہ کامیاب ہوگیا جس نے نفس کو پاکیزہ بنالیا۔اوروہ نامرادرہا جس نے اسے آلودہ کرلیا'' البتہ جاننا چاہئے کہ جس چیزسے انسان کی سعادت اور فردو معاشرے کی خوش بختی وابستہ ہے،وہ دینی ضوابط پر عمل

---

[۱] شمس،۹۔۱۰

کرنا ہے ۔صرف نام سے کام نہیں چلتا،کیونکہ جس چیز کی اہمیت و قیمت ہے وہ خود حقیقت ہے نہ حقیقت کا دعویٰ۔جو شخص اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے لیکن اس کا باطن تاریک ہے اوروہ اخلاقی طور پر گراہوا اور بد کردار ہے،اس کے باوجود سعادت کے فرشتہ کا منتظر ہے،تو اسکی مثال اس بیماری کی جیسی ہے جو طبیب کے نسخہ کو جیب میں رکھ کر صحت یابی کی توقع رکھتا ہے،یقیناًایسا انسان اس فکر کے ساتھ منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتا ہے ۔خدائے متعال اپنے کلام میں فرماتا ہے:(ان الذّین ءامنوا والذّین ہادوا والنّصاٰری والصّاٰئبین من اٰمن باللہ و الیوم الاخر و عمل صاٰلحاً فلھم اجرہم عند ربّھم [۱]) ''جو لوگ بظاہر ایمان لائے یا یہودی،نصاریٰ اور صابیئن ہیں ان ا۔جنہوں نے مجوسی مذہب سے یہودی مذہب کی طرف تمائل پیدا کر کے مجوسیت اور یہودیت سے ایک درمیانی دین ایجاد کیا،انھیں صابئین کہتے ہیں ۔میں سے جو واقعی اللہ اور آخرت پر ایمان لائے گا اس کے لئے پروردگار کے یہاں اجر وثواب ہے''۔ممکن ہے اس آیہ شریفہ کے مضمون سے یہ تصور کیا جائے کہ جولوگ خدا اور قیامت کے دن پر ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال انجام دئے ہوں،اگر چہ انہوں نے تمام پیغمبروں یا بعض پیغمبروں کو قبول بھی نہ کیا ہو تب بھی وہ نجات پائیں گے ۔لیکن جاننا چاہئے کہ سورہ نساء کی آیت نمبر ۱۵۰اور۱۵۱میں پروردگار عالم ان لوگوں کو کافر جانتاہے جو تمام پیغمبروں یا بعض پیغمبروں پر ایمان نہ رکھتے ہوں ۔

تاریخ ادیان کا ایک خلاصہ

ادیان کے وجود میں آنے کے بارے میں اجمالی تحقیق، مطمئن ترین راہ ۔جس پر دینی نقطہ نگاہ سے اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ قرآن مجید ہی کا بیان ہے،کیونکہ یہ ہر قسم کی خطا،اشتباہ، تعصب اور خود غرضی سے منزّہ و پاک ہے۔(ان الدین عند اللہ الا سلام[۲]''۔۔دین خدا ، دین اسلام ہی ہے''،جوانسان کی پیدائش کے پہلے ہی دن سے اس کے ساتھ تھا ،جیسا کہ قرآن مجید میں تاکید ہوئی ہے کہ،بشر کی موجودہ نسل کی ابتداء میں دو شخص ایک مرد اور ایک عورت تھے ۔مرد کا نام ''آدم '' اور اس کی بیوی کا نام ''حوا ''تھا ۔ حضرت آدم

---

[۱] بقرہ،۶۲
[۲] آل عمران ،۱۹

پیغمبر تھے اور ان پر وحی نازل ہوتی تھی ۔ حضرت آدم کا دین بہت سادہ اور چند کلیات پر مشتمل تھا ،جیسے ،لوگوں کو خدا کو یاد کرنا چاہئے اور آپس میں، خاص کر اپنے والدین کے ساتھ احسان و نیکی کرنا چاہئے،فساد ، قتل اور برے کاموں سے پر ہیز کرنا چاہے۔آدمؑ اور اُن کی بیوی کے بعد ،ان کی اولاد انتہائی سادگی اور اتفاق و اتحاد کے ساتھ زندگی گزارتی تھی ،چونکہ دن بدن ان کی آبادی میں اضافہ ہوتا جارہا تھا ،لہذا رفتہ رفتہ انہوں نے اجتماعی زندگی اختیار کرلی۔اس طرح وہ بتدریج زندگی کے طور طریقوں کو سیکھتے تھے اور تہذیب و تمدن سے قریب ہوتے تھے ۔چونکہ آبادی بڑھتی گئی اس لئے وہ مختلف قبیلوں میں تقسیم ہوگئے اور ہر قبیلہ میں کوئی نہ کوئی بزرگ پیدا ہوتا تھا اور قبیلہ کے لوگ اس کا احترام کرتے تھے،یہاں تک کہ اس کے مرنے کے بعد اس کا مجسمہ بنا کر اس کا احترام و ستائش کرتے تھے ۔اسی زمانہ سے لوگوں میں بت پرستی کا رواج پیدا ہوا ،چنانچہ ائمہ علیہم السلام کی روایتوں میں آیا ہے کہ بت پرستی اسی طرح شروع ہوئی ہے اور بت پرستی کی تاریخ بھی اسی بات کی تائید کرتی ہے۔

رفتہ رفتہ طاقتور افراد کمزوروں اور ضعیفوں پر زیادتی کرنے لگے اور اسطرح لوگوں میں اختلاف پیدا ہوتا چلا گیا ۔ اور یہ اتفاقی طور پر پیدا ہونے والے اختلافات ان کی زندگی میں گوناگوں کشمکش اور لڑائی جھگڑے پیدا کرنے کا سبب بنے۔یہ اختلافات ۔جو انسان کو سعادت کی راہ سے منحرف کر کے بد بختی اور ہلاکت کی طرف لے جاتے تھے ۔

اس امر کا سبب بنے کہ خدائے مہربان نے کچھ انبیاء کو منتخب کر کے آسمانی کتاب کے ساتھ بھیجا تا کہ انسان کے اختلافات کو دور کریں ،چنانچہ خدائے متعال اپنے کلام میں فرماتا ہے:(کان النّاس امّۃ واحدۃ فبعث اللہ النبیّین مبشّرین و منذرین وانزل معھم الکتٰب بالحق لیحکم بین النّاس فیما اختلفوا فیہ[1])''(فطری اعتبار سے)سارے انسان ایک قوم تھے ۔پھر اللہ نے بشارت دینے والے اور ڈرانے والے انبیاء بھیجے اور ان کے ساتھ برحق کتاب نازل کی تاکہ لوگوں کے اختلافات کا فیصلہ کریں''

---

[1] بقرہ۲۱۳

دین اسلام اور اس کی آسمانی کتاب

دین اسلام، ایک عالمی اور ابدی دین ہے۔ اس میں اعتقادی، اخلاقی اور عملی ضوابط کے امور کا ایک سلسلہ ہے جن پر عمل پیرا ہونے سے انسان دنیا وآخرت کی سعادت وخوش بختی حاصل کرتا ہے۔ دین اسلام کے قواعد وضوابط۔ جو خالق کائنات کی طرف سے بھیجے گئے ہیں۔ ایسے ہیں کہ اگر انسانی معاشرے کا کوئی فرد یاانسانی معاشروں میں سے کوئی معاشرہ ان پر عمل کرے تو اس کے لئے زندگی کے بہترین شرائط اور ترقی یافتہ ترین انسانی کمال حاصل ہو سکتے ہیں۔ دین اسلام کے نیک آثار ہر فرداور ہر معاشرے کے لئے مساوی ہیں اور چھوٹے بڑے، عالم و جاہل، مردوعورت، سفید فام و سیاہ فام اور مشرقی ومغربی، بلا استثناء اس مقدس دین کے فوائداور خوبیوں سے فیضیاب ہو سکتا ہے، اوراپنی ضرورتوں کو اچھی طرح پورا کر سکتا ہے۔

دین اسلام نے اپنے معارف و ضوابط کو فطرت کی بنیاد پر استوار کیا ہے اور انسان کی ضرورتوں کو مدنظر رکھا ہے، اور ان کو پورا کرتا ہے اور انسان کی فطرت اور ساخت بھی مختلف افراد، نسلوں اور متعدد زمانوں میں یکسان ہے، اس لحاظ سے واضح ہے کہ انسانی معاشرہ مشرق سے لے کر مغرب تک ایک ہی قسم کا خاندان ہے اور وہ انسانی ساخت کے اصول وارکان میں آپس میں شریک ہیں اور مختلف افراداور نسلوں کی ضرورتیں بھی مشابہ ہیں اور بشر کی آنے والے نسلیں بھی اسی خاندان کی اولاد ہیں اور یقینا انہی کے وارث ہیں اوراُن کی ضرورتیں انہی کی ضرورتیں جیسی ہوں گی۔

نتیجہ کے طور پر، اسلام ایک ایسا دین ہے جوانسان کی واقعی اور فطری ضرورتوں کو پورا کرتا ہے اور سبھی کے لئے کافی اور ابدی ہے۔ اسی لئے خدائے متعال نے اسلام کودین فطرت کا نام دیا ہے اور لوگوں کو انسانی فطرت کو زندہ رکھنے کی دعوت دیتا ہے اور دین کے بزرگوں نے فرمایا ہے''؛اسلام ایک آسان دین ہے جو انسان پر میں سختی نہیں کرتا۔''خدائے متعال نے دین اسلام کوفطرت کی بنیاد پر بنایا ہے لہذا اس کی کلیات سبھی کے لئے قابل فہم ودرک ہیں، لیکن پھر بھی اس نے اس کے اصلی معارف وضوابط کی بنیادوں کو پیغمبراکرم حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہونے والی آسمانی کتاب ''قرآن مجید'' میں

فرمایاہے۔ دین مقدس اسلام آخری آسمانی دین ہے اس لئے یہ مکمل ترین دین ہے ۔اس دین کے آنے کے بعد گذشتہ دین منسوخ ہوگئے ،کیونکہ کامل دین کے ہوتے ہوئے ناقص دین کی ضرورت نہیں ہوتی ۔ دین اسلام ہمارے پیغمبر حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ بشر کے لئے بھیجا گیا ہے۔ نجات اور سعادت کا یہ دروازہ دنیا کے لوگوں کے لئے اس وقت کھولاگیا جب انسانی معاشرہ اپنی فکری ناتوانی کے دور سے گزر رہا تھااور انسانیت کے کمال کو حاصل کرنے کے لئے مکمل طور پرآمادہ ہوچکا تھا اور الٰہی معارف اور اس کے بلند مطالب کو حاصل کرنے کی لیاقت پیدا کر چکا تھا۔

اسی لئے اسلام حقیقت پسند انسان کے لئے قابل فہم حقائق ومعارف اورپسندیدہ اخلاق لیکر آیا۔جو انسان کا امتیاز ہے،اور انسان کی زندگی کے انفرادی و اجتماعی کاموں کو منظم کرنے والے ضوابط، لائے اور ان پر عمل کرنیکی نصیحت کی ۔ہم سب جانتے ہیں کہ دین اسلام کے معارف کلی طورپر تین حصوں میں تقسیم ہوتے ہیں : ''اصول دین ،اخلاق اورفروع فقہی '' نیز واضح رہے کہ اصول دین یعنی دین کی اصلی بنیادیں ،تین ہیں اور اگرانسان میں ان میں سے کوئی ایک نہ پائی جائے تو وہ دین سے خارج ہو جاتا ہے:ا۔توحید،یعنی خداکی وحدانیت پر عقیدہ رکھنا۔

۲۔انبیاء کی نبوت پر عقیدہ رکھنا،جن کے آخری پیغمبر حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔

۳۔معاد پر ایمان،یعنی یہ عقیدہ ہوکہ،خدائے متعال مرنے کے بعد سبھی کوزندہ کرے گاان کے اعمال کاحساب لے گا ۔نیک لوگوں کو نیکی کی جزااور برے لوگوں کوسزادے گا۔مذکورہ تین اصولوں میں مزیددواصول اضافہ کئے جاتے ہیں جو مذہب شیعہ کے مخصوص عقائد ہیں کہ جن کے نہ پائے جانے پر انسان شیعہ مذہب سے خارج ہوتا ہے ،اگر چہ اسلام سے خارج نہیں ہوتا اور وہ دو یہ ہیں:ا۔امامت

۲۔عدل

دین،قرآن مجید کی نظر میں

(ان الدین عند اللہ الاسلام وما اختلف الذین اوتوا الکتاب الّا من بعد ما جآء ہم العلم بغیاً بینہم و من یکفر بایات اللہ فا ن اللہ سریع الحساب[۱]) ''دین،اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہے اور اہل کتاب نے علم آنے کے بعد ہی جھگڑا شروع کیا صرف آپس کی شرارتوں کی بناپر اور جو بھی آیات الٰہی کا انکار کرے گا توخدا بہت جلد حساب کرنے والا ہے۔ ''انبیاء نے جس دین کی طرف لوگوں کودعوت دی ہے وہ خداپرستی اور اس کے احکام کے مقابلہ میں تسلیم ہونا ہے۔ادیان کے علماء،باوجود اس کے کہ حق کی راہ کو باطل سے تشخیص دیتے تھے،تعصب ودشمنی کی وجہ سے حق سے منحرف ہوکرہر ایک نے ایک الگ راستہ اختیار کیا ،اور نتیجہ کے طور پر دنیا میں مختلف ادیان وجود میں آگئے۔

حقیقت میں لوگوں کے اس گروہ نے آیات الٰہی کی نسبت کفر اختیار کیا ہے اور خدائے متعال ان کے اعمال کی جلد ہی سزا دے گا:(ومن یبتغ غیر الاسلام دیناً فلن یقبل منہ وہو فی الاخرۃ من الخاسرین[۲]) ''اور جو اسلام کے علاوہ کوئی بھی دین تلاش کرے گا تو وہ دین اس سے قبول نہ کیا جائے گا اور وہ قیامت کے دن خسارہ والوں میں ہوگا۔ ''(یا ایہا الذین ءآمنوا ادخلوا فی السّلم کافّۃً ولا تتّبعوا خطوات الشّیطان انہ لکم عدوّ مّبین''[۳](ایمان والو!تم سب مکمل طریقہ سے اسلام میں داخل ہو جاؤ اور شیطانی اقدامات کا اتباع نہ کرو وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔

''(واوفوا بعہد اللہ اذا عٰاہدتّم ولا تنقضوا الایمان بعد توکیدہا وقد جعلتم اللہ علیکم کفیلا ان اللہ یعلم ماتفعلون[۴]) ''اور جب کوئی عہد کرو تو اللہ کے عہد کو پورا کرو اور اپنی قسموں کوان کے استحکام کے بعد ہر گز مت توڑو جب کہ تم اللہ کو کفیل اور نگران بنا چکے ہو کہ یقیناً اللہ تمہارے افعال کو خوب جانتا ہے۔ ''اس آیۃ شریفہ کا مقصد یہ ہے کہ، مسلمان جو بھی عہد وپیمان خدا یا بندوں سے کریں،انھیں اس

---

[۱] آل عمران،۱۹
[۲] آل عمران ۸۵
[۳] بقرہ،۲۰۸
[۴] نحل، ۹۱

پر عمل کرنا چاہئے اور اسے نہ توڑیں ۔ (ادع الی سبیل ربّک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ وجادلھم بالتی ہی احسن ان ربّک ہو اعلم بمن ضلّ عن سبیلہ وہو اعلم بالمھتدین[1]) ''آپ اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعہ دعوت دیں اور ان سے اس طریقہ سے بحث کریں جو بہترین طریقہ ہے کہ آپ کا پروردگار بہتر جانتا ہے کہ کون اس کے راستہ سے بہک گیا ہے اور کون لوگ ہدایت پانے والے ہیں ۔ ''مقصد یہ ہے کہ،دین کی ترقی کیلئے مسلمان کوہر ایک کے ساتھ اس کی عقل وفہم کے مطابق اس کے لئے مفید ہو،اور اگر دلیل و برہان اور نصیحت سے کسی کی راہنمائی نہ کر سکا ،تو جدل (جو کہ مطلب کوثابت کرنے کا ایک طریقہ ہے) کے ذریعہ اس کو حق کی طرف دعوت دے ۔ (واذا قری القرآن فاستمعوا لہ وانصتوا لعلّکم ترحمون[2]) ''اور جب قرآن کی تلاوت کی جائے تو خاموش ہو کر غور سے سنو شاید تم پررحمت نازل ہوجائے ۔ ''(یا ایھا الّذین ءامنوا اطیعوا اللّٰہ و اطیعوا الرّسول و اولی الامر منکم فان تنٰازعتم فی شیءٍ فرُدّوہ الی اللّٰہ و الرّسول ان کنتم تومنون باللّٰہ و الیوم الاٰخر ذٰلک خیر واحسن تاویلا[3]) (''ایمان والو!اللہ کی اطاعت کرو اور رسول اور صاحبان امر کی اطاعت کرو جو تمھیں میں سے ہیں ،پھر اگر آپس میں کسی بات میں اختلاف ہوجائے تو اسے خدا اور رسول کی طرف پلٹا دو اگر تم اللہ اورروزآخرت پر ایمان رکھنے والے ہو،یہی تمہارے حق میں خیر اورانجام کے اعتبار سے بہترین بات ہے۔ ''مقصد یہ ہے کہ اسلامی معاشروں میں ،اختلاف دور کرنے کا وسیلہ ،قرآن مجید اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں ہے،اور ان دودلیلوں کے ذریعہ ہر اختلاف کو حل کرنا چاہئے اوراگر کسی مسلمان نے عقل سے اختلاف دور کیا،تووہ بھی اس لئے ہے کہ قرآن مجید نے عقل کے حکم کو قبول کیا ہے ۔

(فبما رحمۃٍ من اللّٰہ لنت لھم ولو کنت فظّاً غلیظ القلب لانفضّوا من حولک فاعف عنھم واستغفر لھم و شاورھم فی الامر فاذا عزمت فتوکّل علی اللّٰہ ان اللّٰہ یحبّ المتوکّلین[4]) ''پیغمبر!یہ اللہ کی مہربانی ہے کہ تم ان لوگوں کے لئے نرم ہو ورنہ اگر تم بد مزاج اور سخت دل

[1] نحل، ۱۲۵
[2] اعراف،۲۰۴
[3] نساء،۵۹
[4] آل عمران ،۱۵۹

ہوتے تو یہ تمہارے پاس سے بھاگ کھڑے ہوتے ،لہذ تم انھیں معاف کردو ۔ان کے لئے استغفار کرو اور ان سے جنگ کے امورمیں مشورہ کرو اور جب ارادہ کرو تو اللہ پر بھروسہ کرو کہ وہ بھروسہ کرنے والوں کو دوست رکھتاہے''کیونکہ نیک برتاؤ ،خیر خواہی اور امور میں مشورہ کرنا ،انس و محبت کا وسیلہ ہے اور معاشرہ کے افراد کو اپنے سرپرست سے محبت کرنی چاہئے تاکہ وہ ان کے دلوں میں نفوذ کر سکے۔ خدائے متعال مسلمانوں کے سرپرست کو خوش اخلاقی اور مشورہ کا حکم دیتا ہے،اوریہ حکم اس لئے ہے کہ ممکن ہے لوگ اپنی سوچ میں غلطی کریں لہذا حکم دیتا ہے کہ مشورت کے بعد اپنے فیصلہ میں آزاد ہواور اس لئے کہ خدا کے ارادہ سے کوئی مخالفت نہیں کر سکتا ہے ،اپنے امور میں خداپر توکل کر کے اپنے کام اسی کے سپرد کرے ۔

معاشرے میں دین کا کردار

دین،ایک بہترین روش ہے،جس سے انسانی معاشرہ کو منظم کیا جا سکتا ہے اوریہ دوسری تمام روشوں سے زیادہ لوگوں کو اجتماعی قوانین کی رعایت کرنے پرابھارتاہے،اور جب ہم ان اسباب وعلل کا مطالعہ کرتے ہیں جو ماضی میں انسانی معاشرے کے وجود میں آنے کا سبب بنے ہیں تو یہ حقیقت مکمل طور پر واضح ہو جاتی ہے ۔انسان زندگی میں اپنی سعادت و کامرانی کے علاوہ کسی چیز کو نہیں چاہتا ہےاور اس کے لئے کوشش کرتا ہے ۔

البتہ یہ سعادت زندگی کے تمام وسائل کی فراہمی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ دوسری طرف انسان اپنے خداداد فہم و شعور سے درک کرتاہے کہ وہ ان تمام ضرورتوں کوتنِ تنہاپورا نہیں کرسکتا کہ جن سے وہ اپنی من پسند سعادت کو حاصل کر سکے۔ واضح ہے کہ زندگی کی تمام ضرورتوں کوپورا کرنا ایک شخص کے بس کی بات نہیں ہے، خواہ وہ کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو ۔اس لحاظ سے انسان اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے اپنے ہی جیسے لوگوں سے مدد لینے پر مجبور ہے تا کہ اپنے ضروری اورحیات آفرین وسائل کو حاصل کر سکے،اس صورت میں کہ ہرایک ان وسایل میں سے کسی ایک کو حاصل کرنے کی ذمہ داری کوقبول کرتاہے اوراسے فراہم کرتا ہے ،اس کے بعد تمام افراد اپنی فعالیتوں کے ماحصل کو ایک جگہ جمع کرتے ہیں اوران میں سے ہر شخص اپنی فعالیت اور حیثیت کے

مطابق حصہ لیتا ہے اور اس سے اپنی زندگی کو چلاتا ہے ۔اس طرح ،انسان اپنی سعادت کو پورا کرنے کے لئے اپنے ہم نوع انسانوں کا تعاون کرتا ہے اوراُن سے تعاون لیتا ہے ،یعنی مختصر یہ کہ تمام لوگ ایک دوسرے کے لئے کام کرتے ہیں اور اس کام کے نتیجہ کو جمع کرتے ہیں اور معاشرے کا ہر فرد اپنی حیثیت اور فعالیت کے مطابق اپنا حصہ لے لیتا ہے ۔

معاشرے کو قوانین کی ضرورت

لوگوں کی محنت و مشقت کا ما حصل چونکہ ایک ہوتا ہے اور سب اس سے استفادہ کرنا چاہتے ہیں اس لئے معاشرے کو کچھ قوانین کی ضرورت ہے تاکہ ان کی رعایت سے بغاوت اور لاقانونیت کو روکا جا سکے ۔واضح ہے کہ اگر معاشرے کا نظام چلانے کے لئے کچھ ضوابط وقوانین نہ ہوں تو افراتفری پھیلتی ہے اور انسانی معاشرہ اپنی زندگی کوایک دن بھی جاری نہیں رکھ سکتا ۔البتہ یہ قوانین معاشرے اقوام ، لوگوں کی فکری سطح اور حکومتی دفاتر کے اعتبار سے مختلف ہوتے ہیں ۔ بہر حال کوئی بھی ایسا معاشرہ نہیں پایا جاسکتا جو ایسے قوانین سے بے نیاز ہو کہ جن کا اکثر افرادا حترام کرتے ہوں۔تاریخ بشریت میں ہرگز ایسا کوئی معاشرہ نہیں پایا گیا جس میں کسی قسم کے مشترک آداب ورسوم و قوانین وضوابط نہیں تھے۔

قوانین کے مقابلہ میں انسان کاآزاد ہونا

چونکہ انسان اپنے تمام کام اپنے اختیار سے انجام دیتا ہے ،اس لئے وہ ایک طرح کی آزادی محسوس کرتا ہے اور وہ اس آزادی کو ''مطلق '' ،یعنی بدون قید وشرط تصور کر کے ،مکمل آزادی چاہتا ہے اور ہر قسم کی پابندی سے بھاگتا ہے۔اسی وجہ سے وہ ہرطرح کی رکاوٹ ومحرومیت سے رنجیدہ ہوتا ہے اور مختصر یہ کہ وہ ہر دھمکی سے اپنے اندر دباؤ اور خاص ناکامی کا احساس کرتا ہے ،اس لحاظ سے اجتماعی قوانین چاہے کتنے ہی کم کیوں نہ ہوں ،چونکہ وہ ایک حد تک انسان کوپابند کرتے ہیں ،لہذا وہ اسکی حریت پسندی کے خلاف ہوں گے۔دوسری طرف انسان یہ سوچتا ہے کہ اگر معاشر اور اس کے نظم و نسق کے تحفظ کے لئے وضع کئے گئے قوانین کے مقابلہ میں اپنی آزادی سے کسی حد تک دستبردار نہ ہو جائے تو افراتفری پھیل کر اس کی پوری آزادی و آسائش ختم ہو جائے گی

چنانچہ اگر وہ کسی کے ہاتھ سے ایک لقمہ لے گا تو دوسرے لوگ اس کے ہاتھ سے پورا کھانا چھین لیں گے اور اگر وہ کسی پر ظلم کرے گا تو دوسرے بھی اس پر ظلم کریں گے۔اس لحاظ سے اسے چاہیے کہ اپنی آزادی کے ایک حصہ کو محفوظ رکھے ،اور اس کے دوسرے حصہ سے صرف نظر کرے تو اس طرح وہ اجتماعی قوانین وضوابط کا احترام کرے گا۔

قوانین کی ترقی میں کمزوریاں

مذکورہ مطالب کے پیش نظر،انسان کی آزاد پسند ذہنیت اور اجتماعی ضوابط کے درمیان ایک قسم کا ٹکراؤاور تضاد موجود ہے ۔یعنی قوانین ایک قسم کی زنجیر ہے جو اس کے پاؤں میں پڑی ہے اور وہ ہمیشہ اس زنجیر کو توڑنا چاہتاہے تاکہ اس پھندے سے رہائی پائے اور یہ اجتماعی قوانین کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہے جو اس کی بنیادوں کو متزلزل کر دیتاہے ۔

اسی لئے ہمیشہ قوانین اور عملی فرائض کی خلاف ورزی کرنے والوں کی سزا کے لئے کچھ اور قواعد وضوابط بنائے جاتے ہیں تاکہ لوگوں کو قوانین کی خلاف ورزی کرنے سے روکا جا سکے ،اس سلسلہ میں کبھی لوگوں کو قوانین کی اطاعت کرنے کی تشویق کے لئے انعامات کی امید دلائی جاتی ہے ۔البتہ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ یہ مسئلہ (یعنی سزا کا خوف اور جزا کا شوق) قوانین کے نفاذ میں کسی حدتک مدد کرتا ہے ۔لیکن یہ خلاف ورزی کے راستہ کو سو فیصد بند کر کے قانون کے اثر و تسلط کو مکمل طور پر تحفظ نہیں بخش سکتا،کیونکہ تعزیراتی قوانین بھی دوسرے کارآمد قوانین کے محتاج ہونے کی وجہ سے خلاف ورزی سے محفوظ نہیں ہیں اور انسان کی آزادپسند طبیعت کی طرف سے انہیں ہمیشہ خطرہ لاحق رہتاہے ۔چونکہ جو لوگ مکمل طور پر نفوذ اورطاقت رکھتے ہیں وہ کسی خوف وہراس کے بغیر کھلم کھلا مخالفت کر سکتے ہیں یانفوذ کے ذریعہ ،عدلیہ اور انتظامی محکموں کو اپنی مرضی کے مطابق عمل کرنے پر مجبور کر سکتے ہیں ۔

جو لوگ نفوذ وطاقت نہیں رکھتے ہیں ،وہ بھی معاشرے کی ہدایت کرنے والوں کی غفلت یا کمزوری سے ناجائز فائدہ اٹھا کر مخفیانہ طور پر خلاف ورزی کر سکتے ہیں ،یا رشوت اور سفارش کے ذریعہ یا معاشرے کے بااثر اشخاص کے ساتھ دوستی اوررشتہ داری کے ذریعہ

اپنے مقصد تک پہنچ سکتے ہیں اور اس طرح معاشرے کے نظم کو عام حالات سے خارج کرکے ناکارہ بنا سکتے ہیں ۔اس بات کا بہترین ثبوت یہ ہے کہ ہم مختلف انسانی معاشروں میں اس قسم کی مخالفتوں اور قانونشکنی کے ہزاروں نمونے روزانہ مشاہدہ کرتے ہیں ۔

قانون میں خامی کا اصلی سرچشمہ

اب دیکھنا چاہئے کہ اس خطرہ کا سرچشمہ کہاں ہے اورانسان کی سرکش اورآزادی پسند طبیعت کو کیسے قابو میں کیا جائے اور نتیجہ میں قانون کی مخالفت کو روکا جائے؟اس خطرہ کا سرچشمہ۔ جو معاشرے میں فسادبرپاکرنے کا سب سے بڑا سبب ہے یہاں تک کہ قوانین بھی اسے روک نہیں سکتے ۔یہ ہے کہ عام اجتماعی طریقے،جو قوانین کو وجود میں لاتے ہیں،کہ جن کا تعلق افراد کے مادی مراحل سے ہے،وہ ان کی معنویات اور باطنی فطرتوں کی کوئی اعتنا نہیں کرتے اور ان کا مقصد صرف ہماھنگی اورنظم و نسق کا تحفظ اور لوگوں کے اعمال کے درمیان توازن بر قرار رکھنا ہوتا ہے تاکہ اختلاف اور کشمکش کی نوبت نہ آئے ۔اجتماعی قانون کا تقاضا یہ ہے کہ قانون کی شقوں پر عمل کیا جائے اور معاشرے کے امور کو کنٹرول کیا جائے ۔اس قانون کا انسان کے داخلی صفات اور باطنی جذبات سے کوئی تعلق نہیں ہے،جو ان اعمال کے محرک اور قوانین کے داخلی دشمن ہیں ۔

اس کے باوجود اگر انسان کی آزادی پسند فطرت اور دوسرے سیکڑوں جبلتوں (جیسے خودخواہی اورشہوت پرستی جومفاسد کے اصلی سبب ہیں)کی طرف توجہ نہ کی جائے تو معاشرے میں افراتفری اورلاقانونیت رائج ہوجائے گی اوراختلافات کادامن روز بروز پھیلتا جائے گا،کیونکہ تمام قوانین کو ہمیشہ قوی باغیوں اور سرکشوں کے حملہ کاخطرہ لاحق ہوتا ہے جوانہی جبلتوں سے پیدا ہوتے ہیں اور کوئی قانون بُرے کو کنٹرول کرکے اختلافات کو نہیں روک سکتا ہے۔

تمام قوانین پر دین کی ترجیح

قانون کے تحفظ کے لئے آخری طریقہ ،تعزیراتی قوانین وضع کرنا اور محافظ مقرر کرنا ہے لیکن جیسا کہ بیان کیا گیا ، تعزیراتی قوانین اور محافظ انسان کی سر کشی اور دیگر جبلتوں کو روک نہیں سکتے تاکہ اجتماعی قوانین پر عمل ہو سکے۔ دین کے پاس مذکورہ وسائل کے علاوہ مزید دو طاقتور وسیلے بھی موجود ہیں ،جن سے وہ ہر مخالف طاقت کو مغلوب کر کے اسے تہس نہس کر سکتا ہے: ۱۔ہر دین دار فرد دین کی راہنمائی سے اس حقیقت تک پہنچتا ہے کہ اس کی زندگی اس ناپائدار اور گزر جانے والی دنیا کی چند روزہ زندگی تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کے سامنے ایک ابدی اور لامحدود زندگی ہے ،جو موت سے نابود نہیں ہوتی ۔اس کی ابدی سعادت اورآسائش صرف اس میں ہے کہ وہ پروردگار عالم کی طرف سے اس کے پیغمبروں کے توسط سے بھیجے گئے قوانین کی پیروی کرے ،کیونکہ وہ جانتا ہے کہ دینی قوانین ،ایک ایسے دانا اور بینا پروردگار کی طرف سے بھیجے گئے ہیں ،جو انسان کے باطن وظاہر سے آگاہ ہے اوراپنی مخلوق سے ایک لمحہ بھی غافل نہیں رہتا ۔ایک ایسا دن آنے والا ہے جس دن وہ اسی انسان کو اپنے پاس بلائے گا،اس کے پنہاں اور آشکار اعمال کا حساب و کتاب لے گا اور نیک اعمال کی پاداش اور برے اعمال کی سزا دے گا ۔

۲۔ہر دیندار شخص اپنے دینی عقائد کے مطابق جانتا ہے کہ جب دینی حکم کو بجا لاتا ہے تو وہ اپنے پروردگار کی اطاعت کرتا ہے ،اس کے باوجود وہ بندگی کی رسم کے مطابق کسی اجر پاداش کا مستحق نہیں ہے ، لیکن پروردگار کے فضل وکرم سے اس کو نیک پاداش ملے گی ،اس لحاظ سے ہر اطاعت کو انجام دے کر اس نے حقیقت میں اپنے اختیار سے ایک معاملہ اور ایک لین دین کیا ہے ۔چونکہ وہ اپنی مرضی سے اپنی آزادی کے ایک حصہ سے دست بردار ہوا ہے اور اس کے مقابلہ میں اپنے پروردگار کی خوشنودی و مہربانی حا صل کی ہے ،اس لئے اسے اپنی نیکیوں کی پاداش ملے گی۔ دیندار شخص، دینی قوانین وضوابط کی پیروی کر کے اپنی پوری خوشی سے معاملہ کرنے میں مشغول ہو جاتا ہے اور جو کچھ اپنے اختیار سے دیتا ہے اس کے کئی گنا نفع کماتا ہے ۔وہ ایک چیز کو بیچ کر اس کے بدلے میں اس سے بہتر مال خرید لیتا ہے ۔لیکن جو شخص دین کا پابند نہیں ہوتا ،چونکہ وہ ضوابط کی رعایت اور قانون کی پیروی کو اپنے لئے

ایک نقصان تصور کرتا ہے اور اس کی آزادی پسند طبیعت اس کی آزادی کے ایک حصہ کو کھو دینے سے ناراض ہوتی ہے ۔ وہ اس موقع کی تلاش میں ہوتا ہے کہ اس زنجیر کو توڑ کر اپنی آزادی حاصل کرے ۔

نتیجہ

مذکورہ بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ معاشرے کی زندگی کے تحفظ کے لئے دین کا اثر غیر دینی طریقوں کی نسبت زیادہ قوی اور عمیق ہے ۔

دوسروں کی کوشش

دنیا کے پسماندہ ممالک ،جو قرن اخیر میں ترقی وپیش رفت کی فکر میں ہیں ،اگر چہ انہوں نے اجتماعی حکومت کو قبول کیا ہے ،لیکن قانون کی ضعیف شقوں کی طرف توجہ نہیں کی ہے اور دین کی طاقت سے استفادہ نہیں کیا ہے ،اس لئے ان کی دنیا تاریک ہوئی ہے اوران کی زندگی کا ماحول جنگل کے قانون میں تبدیل ہوا ہے ۔ان کے مقابلہ میں ،دنیا کی ترقی یافتہ اور ہوشیار قوموں نے ،قوانین کی کمزوری سے آگاہ ہو کر ،قانون کو حتمی ناکامی سے نجات دلانے کے لئے ،کچھ کوششیں کر کے ایک دوسرا راستہ اختیار کیا ہے ۔ان قوموں نے تعلیم و تربیت کے نظام کو ایسے منظم کیا ہے کہ لوگوں میں خود بخود صحیح اخلاق پید ہوں اور جب وہ عملی میدان میں قدم رکھیں ، تو قانون کو مقدس اور ناقابل مخالفت سمجھیں ۔اس قسم کی تربیت قانون کے عام طورپر نافذ ہونے کا سبب بنتیہے اور نتیجہ میں قابل توجہ حد تک معاشرے کی سعادت کو پورا کر کے قانون کو ناکامی سے نجات دلائی جاتی ہے ۔ لیکن جاننا چاہئے کہ ایسے معاشروں میں پرورش پانے والے افکار دو قسم کے ہوتے ہیں: ا ۔انسان دوستی جیسے عقائد و افکار ،اپنے ماتحتوں کے ساتھ خیر خواہی اور رحم دلی ،جو حقیقت پسندی پر استوار ہوں ،بیشک ان کو آسمانی ادیان سے لیا گیا ہے اور قدیم زمانے سے (جبکہ ترقی یافتہ معاشرے وجود میں نہیں آئے تھے)دین، لوگوں کو ان افکار کی طرف دعوت دیتا رہا ہے ۔ لہذا، جو خوش بختی اور سعادت ان افکار کے ذریعہ ترقی یافتہ معاشروں میں نظر آ رہی ہے، وہ دین کے برکات میں شمار ہوتی ہے ۔

۲۔بیہودہ اور افسانوی عقائد وافکار ، جن کی خرافات کے بازار کے علاوہ کہیں کوئی اہمیت نہیں ہے،مثال کے طور پر افراد کو تلقین کی جاتی ہے کہ اگر وطن کی نجات کی راہ میں کوئی تکلیف اٹھائی یا قتل کئے گئے تو،تمہارا نام تاریخ کے صفحات میں سنہرے حروف سے لکھا جائے گا اگرچہ ،اس قسم کے خرافاتی تصورات کا ایک عملی نتیجہ ہوتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کوئی شخص اس پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر میدان جنگ میں جان نثاری کا ثبوت دے اور بہت سے دشمنوں کو قتل کردے،لیکن وہ فائدے کے بجائے قوم کو بہت بڑا نقصان پہنچاتا ہے ،کیونکہ یہ تفکرانسان کو خرافاتی بنا کر اس کی حقیقت پسندانہ فطرت کو بیکار بنادیتی ہے ،جو لوگ خدااور قیامت پر ایمان نہیں رکھتے اور موت کو نابودی اور فنا سمجھتے ہیں،ان کی نظر میں موت کے بعد ابدی اور کامیاب زندگی کا مفہوم و معنی نہیں ہے ۔

انسان کے آرام وآسائش میں اسلام کی اہمیت

جیسا کہ ہم نے بیان کیا ،دینی قوانین ،دوسرے اجتماعی طریقوں کی بہ نسبت ممتاز ہیں۔ تمام ادیان میں اسلام کو برتری حاصل ہے۔اس لحاظ سے انسانی معاشروں کے لئے اسلام دوسرے تمام روشوں سے زیادہ مفید ہے۔اوراسلام اوردوسرے ادیان اور اجتماعی طریقوں کے موازنہ سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے ۔

اسلام کا دوسرے ادیان سے موازنہ

اسلام،تمام ادیان کے درمیان منفرد دین ہے جوسو فیصد اجتماعی ہے۔اسلام کی تعلیمات آج کل کے عیسائی دین کے مانند نہیں ہیں جو صرف لوگوں کی اخروی سعادت کو مد نظر کھتا ہے اور ان کی دینوی سعادت کے بارے میں خاموش ہے اور نہ ہی یہودیوں کے موجودہ دین کے مانند ہیں جو صرف ایک ملت کی تعلیم و تربیت کی مقبولیت کو مد نظر رکھتاہے ۔اسلام کی تعلیمات مجوس اوردیگر مذاہب کے مانندصرف اخلاق واعمال سے مربوط چند موضوعات تک محدود نہیں ہیں بلکہ اسلام میں تمام لوگوں کے لئے دنیاوآخرت کی تعلیم و تربیت کو ہمیشہ کے لئے اور ہرزمان و مکان میں،مد نظر رکھا گیا ہے بدیہی ہے کہ اس کے علاوہ معاشرے کی اصلاح اور لوگوں کی دنیاوآخرت کی سعادت کے لئے کوئی اور راستہ نہیں ہے: اوّلاً:تمام انسانی معاشروں میں۔جو اچھے روابط سے

روزبروز نزدیک اور محکم تر ہو رہے ہیں ۔ صرف ایک معاشرہ یا ایک ملت کی اصلاح کرنا حقیقت میں ایک فضول کوشش ہے اور ایک بڑے آلودہ تالاب یا نہر کے ایک قطرہ پانی کو تصیفہ کرنے کے مانند ہے ۔ ثانیا: دوسرے معاشروں کے بارے میں غفلت کرتے ہوئے صرف ایک معاشرے کی اصلاح کرنا ایک ایسا امر ہے جو اصلاح طلبی کی حقیقت کے خلاف ہے۔

اسلامی تعلیمات میں کائنات اور انسان کی خلقت کے بارے میں انسان کے ذہن میں پیدا ہونے والے افکار ،اخلاق اور انسانی زندگی میں پائی جانے والی تمام سرگرمیاں،کی تحقیق کی گئی ۔ لیکن اسلام میں افکار کے بارے میں،جو عقائد حقیقت پسندانہ پہلوؤں پر مشتمل ہیں اور ان میں سر فہرست خدائے متعال کی وحدانیت ہے ،وہ اصل اور بنیاد قرار پائے ہیں۔ اور اخلاق اسلامی میں،وہ حقیقت جسے عقل سلیم قبول کرتی ہے ،وہ توحید کی بنیاد پر استوار ہوئی ہے پھر اس کے بعد اخلاق کی بنیاد پر، قواعد وضوابط اور عملی قوانین بیان کئے گئے ہیں،جس کے نتیجہ میں ہر کالے گورے،شہری و دیہاتی ،مرد و عورت،چھوٹے بڑے،غلام و آقا،حاکم ورعایا،امیر وغریب اور عام وخاص کے لئے انفرادی واجتماعی فرائض بیان کئے گئے ہیں:

(...کلمۃً طیبۃً کشجرۃٍ طیبۃٍ اصلھا ثابت وفرعھا فی السّماء[1]) ... ''کلمہ طیبہ کی مثال شجرہ طیبہ سے بیان کی ہے جس کی اصل ثابت ہے اور اس کی شاخ آسمان تک پہنچی ہوئی ہے۔ ''،جو شخص اسلام کے بنیادی معارف،اخلاقی تعلیمات اور فقہ اسلامی پر محققانہ نظر ڈالے،گا تو وہ ایک ایسے بے کراں سمندر کا مشاہدہ کرے گا جس کی حدود اور گہرائیوں تک پہنچنے میں انسانی عقل وشعور قاصر ہے اس کے باوجود اس کا ہر جزء و دوسرے اجزا سے متصل اور متناسب ہے اور یہ سب اجزاء مل کر خدا پرستی اور انسان پروری کو تشکیل دیتے ہیں، جیسا کہ خدائے متعال نے اپنے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی کی ہے ۔

[1] ابراہیم۲۴

سماج کے رسم ورواج سے اسلام کا موازنہ

جب ہم دنیا کے ترقی یافتہ معاشروں کے طور طریقوں پر سنجیدگی سے نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اگر چہ ان معاشروں کی سائنسی اور صنعتی ترقی نے عقلمندوں کو متحیر کر دیا ہے،وہ طاقت وترقی کے بل بوتے پر مریخ اور چاند پر کمند ڈال رہے ہیں ،ان کی ملکی تشکیلات نے انسان کو حیرت میں ڈال دیا ہے ،لیکن یہی ترقی کے راستے اپنی قابل ستائش ترقی کے باوجود ،عالم بشریت پر بد بختی وبد نصیبی ایسے مصائب کا سبب بنے ہیں ۔

پچیس سال سے کم عرصہ میں دنیا کو دوبار خاک وخون میں غرق کر کے لاکھوں انسانوں کو نابود کر دیا ہے اور اس وقت بھی تیسری عالمی جنگ کا فرمان ہاتھ میں لئے ہوئے عالم بشریت کو نابود کرنے کی دھمکی دے رہے ہیں ۔انہی طریقوں نے اپنی پیدائش کے پہلے ہی دن سے ''انسان دوستی اور آزادی دلانے'' کے نام پر دنیا کے دیگر ممالک اور ملتوں کے ماتھے پر غلامی کے داغ لگا کر دنیا کے چار بڑے براعظموں کو اپنی استعماری زنجیروں میں جکڑ کر کسی قید وشرط کے بغیر براعظم یورپ کا غلام بنادیا ہے اورایک حقیر اقلیت کو کروڑوں بے گناہ انسانوں کے مال،جان ور عزت پر مسلط کر دیا ہے ۔

البتہ یہ بات ناقابل انکار ہے کہ ترقی یافتہ ملتیں اپنے ماحول میں مادی نعمتوں اور لذتوں سے سرشار ہیں اور بہت سے انسانی آرزؤوں جیسے اجتماعی انصاف اور ثقافتی وصنعتی ترقی تک پہنچ چکے ہیں۔لیکن وہ اس کے ساتھ ہی بے پناہ بد بختیوں اور بے شمار تاریکیوں سے دوچار ہوئے ہیں کہ ان میں سے اہم ترین یہ ہے کہ بین الاقوامی کشمکش اور خون ریزیاں دنیا کے مستقبل کو عوامی سطح پر اور ہر لمحہ ماضی سے بدتر وحوادث کی آماجگاہ بنے ہوئے ہیں ۔واضح رہے کہ یہ سب تلخ وشیرین نتائج،ان ملتوں ومعاشروں کی تہذیب وتمدن اور زندگی کے طور طریقوں کے درخت کا پھل ہیں جو بظاہر ترقی کی راہ پر گامزن ہیں ۔

لیکن جاننا چاہئے کہ اس کے میٹھے پھل جن سے انسان نے بہرہ مند ہوکر معاشرے کوباسعادت بنادیاہے،ان ملتوں کے بہت سے پسندیدہ اخلاق جیسے سچائی، صحیح کام،فرض شناسی،خیرخواہی اور فداکاری کا نتیجہ ہے ،نہ صرف قانون کا!کیونکہ یہی قوانین پسماندہ ملتوں،جیسے ایشیااور افریقہ میں بھی موجود ہیں حالانکہ ان کی پستی اور بد بختی میں دن بدن اضافہ ہوتا جارہا ہے۔لیکن اس درخت کا تلخ پھل ۔جس سے انسان آج تک کوتلخ کام ہے وہ انسان کے لئے تاریکی اوربد بختی کا سبب بناہے اور خود ان ترقی یافتہ ملتوں کو بھی دوسروں کی طرح نابودی کی طرف کھینچ رہاہے۔

کچھ ناپسندیدہ اخلاق ہیں،جن کا سرچشمہ:حرص،طمع، بے انصافی،بے رحمی،غرور،تکبر،ضد،اور ہٹ دھرمی ہے۔اگرہم دین مقدس اسلام کے قوانین پر سنجیدگی سے غور کریں،توہم متوجہ ہوں گے کہ اسلام مذکورہ صفات کے پہلے حصہ کا حکم دیتاہے اور دوسرے حصہ سے روکتاہے، مختصر یہ کہ کلی طورپر تمام حق اور نیک انسان کی مصلحت کے امور کی دعوت دیتاہے اور انھیں اپنی تربیت کی بنیاد قرار دیتا ہے اور ہر اس ناحق اوربرے کام سے روکتاہے جو انسان کی زندگی کے آرام میں خلل ڈالتاہے (خواہ کسی خاص قوم وملت سے مربوط ہو)

نتیجہ

مذکورہ بیانات کے نتیجہ کے طور پر مندرجہ ذیل چند نکات ذکر کئے جاتے ہیں: ا۔اسلام کا طریقہ دوسرے تمام اجتماعی طریقوں سے زیادہ پسندیدہ اورانسانیت کے لئے زیادہ مفید ہے:(ذلک دین القیم ولکن اکثر النّاس لا یعلمون[1])..''یقیناًیہی سیدھا اور مستحکم دین ہے مگر لوگوں کی اکثریت اس بات سے بالکل بے خبر ہے''

۲۔موجودہ دنیا کی تہذیب وتمدن کے واضح نقوش اورمیٹھے پھل سبھی دین مقدس اسلام کی برکتیں اور اس کے آثار کی زندہ شقیں اور اصول ہیں جو مغرب والوں کے ہاتھ لگ گئے ہیں،کیونکہ اسلام ،مغربی تمدن کے آثار کے رونما ہونے سے صدیوں پہلے لوگوں کو انہی

[1] روم،٣٠

اخلاقی اصولوں کی طرف دعوت دے رہا تھا کہ یورپ والوں نے ان پر عمل کرنے میں ہم سے پیش قدمی کی ۔امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام زندگی کے آخری لمحات میں لوگوں سے فرماتے تھے ''تمہارا برتاؤایسا نہ ہو کہ دوسرے لوگ قرآن مجید پر عمل کرنے میں تم سے آگے بڑھ جائیں''[1] ۔

۳۔اسلام کے حکم کے مطابق ''اخلاق''کو اصلی مقصد قرار دینا چاہئے اور قوانین کو اس کی بنیاد پر مرتب کرنا چاہئے ،کیونکہ پسندیدہ اخلاق کو فراموش کرنا (جو انسان کو حیوان سے ممتاز کرنے کا سبب ہے)انسان کو معنویت سے مادیت کی طرف ڈھکیل دیتا ہے اور اس کو بھیڑئیے،چیتے اور گائے جیسا درندہ بنادیتا ہے نیز اس میں گوسفند کے صفات پیدا کر دیتا ہے ۔اسی وجہ سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے ''بُعِثتُ لاتمم مکارم الاخلاق''[2] ''میری بعثت کا اصلی مقصد ،لوگوں کی اخلاقی تربیت ہے'' طبیعی وسائل سے اسلام کی ترقیغیر طبیعی وسائل ،کہ جن کا کوئی مادی وجود نہیں ہے، ناکام ہوتے ہیں اور جلد یا کچھ مدت بعد نا بود ہوجا تے ہیں، اسلام جیسے دین میں جو کہ بشریت پر ہمیشہ حکومت کرنا چاہتا ہے، ان غیر طبیعی وسائل سے استفادہ کرنا صحیح نہیں ہے ۔یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اپنی ترقی میں طاقت کا سہارا نہیں لیا ہے ،یہ جو بعض لوگ کہتے ہیں کہ ''اسلام تلوار کا دین ہے''،حقیقت میںیہ لوگ صدر اسلام کی جنگوں کو ظاہری طور پر دیکھتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ غلط فہمی کا شکار ہوجاتے ہیں اور آنکھیں بند کر کے فیصلہ کر دیتے ہیں ۔جودین علم وایمان کی بنیاد پر وجود میں آیا ہو ،اس کے لئے بعید ہے کہ وہ اپنی ترقی اور لوگوں کے دلوں میں ایمان پیدا کرنے کے لئے تلوار کا سہارا لے لے (اسلام میں جہاد کے فلسفہ کا مطالعہ فرمائیں)اسی لئے اسلام نے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے نیرنگ ،جھوٹ اور سیاسی شعبدہ بازی کا سہارا نہیں لیاہے اور انہیں صحیح نہیں جاناہے ،کیونکہ اسلام صرف یہ چاہتا ہے کہ حق زندہ

---

[1] نہج البلاغہ ،صبحی صالح،ص۴۲۲۔
[2] بحار الانوار ،ج۷۱،ص۳۷۳۔

ہواور باطل نابود ہو اور حق تک پہنچنے کے لئے باطل کی راہ پر گامزن ہونا ،حق کی نابودی کا سبب بنتا ہے۔خدائے متعال اپنے کلام میں فرماتا ہے ''؛خداظالموں،بدکاروں اور حق کو چھپانے والوں کو اپنے مقصد میں کامیاب ہونے نہیں دیتا[1] ''

تبلیغ اور دعوت اسلام

اسلام نے لوگوں کی ہدایت اور حق کو پھیلانے کے لئے ایک ایسے راستہ کا انتخاب کیا ہے جو انسان کی فطرت اور خلقت کے عین مطابق ہے اور وہ ''تبلیغ اور دعوت کا راستہ ''ہے ،جو انسان کے لئے حقائق،حقیقت پسندانہ فطرت اور سعادت طلبی کو واضح کر کے اسے بیدار کر دیتا ہے اور آسانی کے ساتھ اسے حق کے حوالے کرتا ہے ۔یہ روش،یعنی تبلیغ ودعوت،ایک ایسی روش ہے جسے تمام انبیاء علیہم السلام نے اختیار کیاہے۔اسلام ،جو خاتم ادیان اور بھر پور صلاحیتوں کا حامل دین، میں اس سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کیا گیا ہے اور اس راستہ کا اپنا نا مسلمانوں پر واجب کیا گیا ہے، تا کہ دین کی نشر و اشاعت میں کوتاہی نہ کریں۔خدائے متعال اپنے پیغمبرؐ سے خطاب کرتے ہوئے فرماتاہے '' :میرا اور میرے پیرؤں کا راستہ یہ ہے کہ وہ مکمل بصیرت کے ساتھ لوگوں کو خدا کی طرف دعوت دیتے ہیں ''[2]

تبلیغ کا طریقہ

مذکورہ آیہ شریفہ سے معلوم ہوتاہے کہ دعوت و تبلیغ کا کام مکمل بصیرت سے انجام پاناچاہئے، مختصر یہ کہ مبلغ کو تبلیغ سے مربوط دینی مسائل سے آگاہ ہوناچاہئے،اور تبلیغ کے طریقہ کار، شرائط اور اس کے آداب سے پوری طرح باخبر ہونا چاہئے۔ البتہ تبلیغ کے شرائط و آداب بہت زیادہ ہیں، جیسے: خوش اخلاقی ، خندہ پیشانی، وقار و بردباری او رحق و انصاف کا احترام و غیرہ لیکن ان میں سب سے اہم علم و عمل ہے۔ کیونکہ جو شخص علم کے بغیر تبلیغ کرتاہے، چونکہ وہ حقیقت سے آگاہ نہیں ہے اس لئے باطل کی تبلیغ کرنے والوں کی طرح،لوگوں کی حق تلفی کرنے اور انھیں گمراہ کرنے میں پروا نہیں کرتاہے اور جو اپنے علم پر عمل نہیں کرتا، حقیقت

---

[1] بقرہ،۱۵۹و۱۷۴۔
[2] یوسف،۱۰۸۔

میں وہ جو کچھ کہتا ہے، اس کی اپنے عمل سے تردید کرتا ہے اور جس چیز کی اپنی زبان سے تعریف کرتا ہے، اس کی اپنے کردار سے، مذمت کرتا ہے جو شخص کسی چیز کی طرف دوسروں کو دعوت دیتا ہے، لیکن خود اس پر عمل نہیں کرتا، اس کی مثال اس شخص کی سی ہے، جو ایک ہاتھ سے کسی چیز کو کھینچتا ہے اور دوسرے ہاتھ سے اسے ڈھکیلتا ہے۔ خدائے متعال اپنے کلام میں فرماتا ہے ''؛کیا تم، لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو؟[۱] ''

ہمارے آٹھویں امام حضرت امام رضا علیہ السلام نے فرمایا ہے ''؛لوگوں کو اپنے گفتار و کردار سے دعوت دو، نہ صرف گفتار سے[۲] ''

[۱] (اتامرون النّاس بالبّر و تنسون انفسکم ...) (بقرہ/ ۴۴)۔
[۲] بحار الانوار ، ج ، ص ۳۰۸۔

اسلام میں تعلیم و تربیت

اسلام،جہل و نادانی کی سرزنش کرتے ہوئے علم و دانش کی مدح کرتاہے، اور اپنے پیروؤں کو علم و فضیلت حاصل کرنے کی تشویق کرتاہے، جبکہ دوسرے ادیان کی کتابیں آزادانہ غورو فکر اور مخالفوں کی باتوں کی تحقیق کرنے سے منع کرتی ہیں۔ اسلام کی آسمانی کتاب(قرآن مجید) حق کو قبول کرنے، کا حکم دیتی ہے خواہ وہ مخالف ہی کی طرف سے کیوں نہ ہواور انسان کے ساتھ استدلال اور آزادانہ طریقہ سے گفتگو کرتی ہے اور لوگوں کو آسمان وزمین اور ان میں موجود ہر چیز کی پیدائش،انسان کی خلقت ،اسلاف کی تاریخ اور کائنات کی فطری گردش کے بارے میں غوروفکر کرنے کی تاکید کرتی ہے بلکہ اس کے علاوہ محسوسات کے دائرہ سے آگے بڑھ کر اور ماوراء طبیعت کے بارے میں غور و فکر کی تاکید کرتی ہے ۔اس موضوع کے بارے میں جوآیات اور روایات پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے جانشینوں سے ہم تک پہنچی ہیں ،وہ بے شمار ہیں۔پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم علم حاصل کرنے کو اس قدر اہمیت دیتے تھے کہ آپؐ نے فرمایا: ''علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر واجب ہے[1]''۔

اسلامی تعلیمات کے دواہم شاہکار

مختلف انسانی معاشروں میں موجود ہر روش میں کچھ اسرار پوشیدہ ہوتے ہیں،اگر وہ اسرار عام لوگوں پر ظاہر ہوجائیں،تو معاشرے کو چلانے والے حکام اور ان کی شہوانی خواہشات متاثر ہوتی ہیں،اس لئے وہ ہمیشہ کچھ حقائق کو لوگوں سے پوشیدہ رکھتے ہیں اور اس مطلب کا سبب یہ ہے کہ بہت سے مطالب اور ضوابط ان کے دماغ کی اپج ہوتے ہیں، چونکہ انھیں اپنی عقل اور معاشرے کی مصلحت کے خلاف پاتے ہیں،اس لئے ڈرتے ہیں کہ اگر یہ اسرار فاش ہوگئے تو ان پر اعتراضات کی بوچھار ہوجائے گی اور ان کے مفاد خطرہ میں پڑجائیں گے۔اسی وجہ سے عیسائیوں کے کلیسا اور دوسرے ادیان کے روحانی مراکز انسان کوآزادانہ غور و فکر

[1] ''طلب العلم فریضہ علی کل مسلم'' (بحار الانوار ، ج ۱، ۱۷۲)۔

کرنے کی اجازت نہیں دیتے ،بلکہ دینی معارف او رمذہبی کتابوں کی توضیح و تفسیر کا حق صرف اپنے سے مخصوص کرتے ہیں اور لوگوں کوان کی ہر بات چون وچرا اور بحث ومباحثہ کے بغیر قبول کرنا ہوتی ہے۔ اسی روش نے بہت سی دینی روشوں کو نقصان پہنچایا ہے اور عیسائیوں کی موجودہ روش اس بیان کی سچائی کی گواہ ہے۔ لیکن اسلام اپنی حقانیت پر اطمینان و اعتماد رکھتاہے اور اپنی راہ میں کسی قسم کے مبہم اور تاریک گوشہ کو نہیں پاتا اس لئے دوسرے تمام مذہبی اور غیر مذہبی طریقوں کے برخلاف حسب ذیل دومسائل پرزیادہ توجہ دیتاہے:ا۔ اسلام کسی بھی حقیقت کو پوشیدہ نہیں رکھتا اور نہ ہی اپنےپیرؤں کو اس بات کی اجازت دیتاہے کہ کسی حقیقت کو چھپائیں، کیونکہ اس مقدس دین کے قوانین فطرت اور خلقت کے قانون کے مطابق مرتب ہوئے ہیں اور حق و حقیقت کی روسے اس کی کوئی چیز قابل تردید نہیں ہے۔اسلام میں، حقائق کو چھپانا گناہان کبیرہ میں شمار ہوتاہے اور خدائے متعال نے سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۱۵۹میں حق کو چھپانے والوں پر لعنت کی ہے۔

۲۔ اسلام اپنے پیرؤں کو حکم دیتاہے کہ حقائق او رمعارف کے بارے میں آزادانہ طور پر غور و فکر کریں اور جہاں پر بھی معمولی سا ابہام نظر آئے، وہیں رک جائیں اور آگے نہ بڑھیں تا کہ ان کا روشن ایمان شک و شبہہ کی تاریکی سے ہمیشہ کے لئے محفوظ رہے اور اگر شک و شبہہ سے دوچار ہوجائیں تو نہایت انصاف اور حق پسندی سے اس کو رفع کرنے کی کوشش کریں اور آزادانہ طور پر ان کو حل کریں ۔ خدائے متعال فرماتاہے''؛جس چیز کا تمھیں علم نہیں ہے اس کے پیچھے مت جاؤ[۱]۔''

آزادی فکر اور حق پوشی

غور و خوض کے ذریعہ حقائق کو درک کرکے انھیں قبول کرنا انسان کے ذہن و دماغ کی گراں قیمت پیدا وار ہے اور انسان کو حیوان پر امتیاز، فضیلت، شرف او رفخر بخشنے کاواحد سبب ہے، اور انسان دوستی و حقیقت پسندی کی فطرت کردیا جائے، تقلیدی افکار کو تھوپ کرانسان کی آزادی فکر کو سلب کرلیا جائے یا حقائق کو چھپا کر اس کی عقل کو گمراہ کردیا جائے۔ مختصر یہ کہ اسابات کی

[۱] (ولا تقف مالیس لک بہ علم...)(اسراء/۳۶)۔

اجازت نہیں دیتی کہ خدا پسند افکار کو ناکارہ بنادیا جائے ۔ لیکن اس حقیقت سے بھی غافل نہیں رہنا چاہئے کہ جہاں پر انسان کسی حقیقت کو سمجھنے کی طاقت نہیں رکھتا یا مد مقابل کی ہٹ دھرمی اور سخت رویہ کی وجہ سے ومنزلت کے لئے،انسان کے ذہن ودماغ کی گمراہی اور دوسرے مالی، جانی اور عزت کو پہنچنے والے خطرات سے محفوظ رکھنے کے لئے حقائق کی پردہ پوشی کو جائز سمجھتی ہے۔ائمہ اطہار علیہم السلام نے اپنی بہت سی حدیثوں میں لوگوں کو بعض ایسے حقائق کے بارے میں غور و فکر کرنے سے منع کیا ہے جن کو سمجھنے کی انسان میں استعداد نہیں ہوتی۔ خدائے متعال نے بھی اپنے کلام میں دو موقعوں پر تقیہ کے طور پر حق چھپانے کو جائز جاناہے[1]۔

نتیجہ

اسلام چند مواقع پر حق و حقیقت کے چھپانے کو بلامانع بلکہ ضروری سمجھتاہے:ا۔ تقیہ کے موقع پر : یہ ایسی جگہ ہے کہ جہاں حق کے آگے بڑھنے کی کوئی امید نہیں ہو،بلکہ اس کے اظہار سے مال، جان اور عزت کو خطرہ لاحق ہوتا ہے۔

۲۔ ایسے موقع پر جہاں حق کسی کے لئے قابل فہم نہ ہو بلکہ اس کا اظہار گمراہی کا سبب بنے یا خود حق کی بے حرمتی کا باعث ہو۔

۳۔ ایسے مواقع پر جہاں آزاد فکر،استعداد کے فقدان کی وجہ سے، حق کو بر عکس دکھاتے اور گمراہی کا سبب بنے۔

---

[1] سورہ آل عمران، آیت ۲۸، اور سورہ نحل آیت،۱۰۶۔

سماجی زندگی میں اسلام کی خدمات

افراد کے منافع کا تحفظ اور رفع اختلاف

گزشتہ بحثوں سے واضح ہوا کہ دین مقدس اسلام،ایک مکمل اجتماعی طریقہ ہے،اور واضح ہے کہ ایک معاشرے کی مکمل سعادت اور سب سے بڑی آرزو یہ ہوتی ہے کہ اس کی ضروریات زندگی پوری ہوں اور زندگی کو لاحق کشمکش اوران زیادتیوں کا حتی الامکان سد باب کیا جائے جن سے زندگی اور اس کے امن و امان کو خطرہ لاحق ہے تاکہ معاشرہ آرام اور تکامل کی طرف بڑھ سکے ۔البتہ ایک انسان کی فطری آرزو یہ ہوتی ہے کہ یہ اپنی زندگی میں حقیقت پسندی کے ساتھ ساتھ جسم وروح کے لحاظ سے سالم ہو اور اس کے شایان شان روٹی، کپڑا، مکان اس کے پاس ہو۔ اوروہ خاندان کو تشکیل دے کر اپنی جوانی اور بوڑھاپے کی آرزؤں کو پا سکے،اور امن وامان کے ماحول میں آرام کی زندگی گزارے ،اس طرح انسانیت کی شا ہراہ پر کسی مزاحمت اور روکاوٹ کے بغیر اپنی تلاش وکوشش کو جاری رکھے اور تکامل تک پہنچ جائے۔ایک انسانی معاشرہ بھی اپنے افراد کے لئے ،اس سے بڑھ کر آرزو نہیں رکھتا ہے اسلام نے اس انفرادی اور اجتماعی آرزو کو عملی جامہ پہنایا ہے ،کیونکہ اس نے معاشرے کوایک ایسا نہج دے دیا ہے کہ اگر اس کو حقیقت بینی کی روشنی میں قبول کیا جائے تو انسان کی زندگی کے مفادات محفوظ رہیں گے اور ان کے اختلافات دور ہوجائیں گے ۔

اسلام کا طریقہ کار اور اس کی بنیاد

اسلام نے اپنی پہلی توجہ انسان کی حقیقت پسندی کے نہج پر مرکوز ہے،کیونکہ یہ مقدس نہج انسان کی تربیت کرنا چاہتا ہے اور ایسے بے زبان حیوان نہیں پالنا چاہتا کہ جس کا مقصد پیٹ بھرنا اور جنسی خواہشات کوپورا کرنا ہو۔انسان ایک ایسی زندہ مخلوق ہے ،جو جذبات اور ہمدردیوں کے علاوہ عقل اور حقیقت پسندی کی توانائی سے بھی مسلح ہے۔انسان اپنی فطرت،یعنی اپنی خالص حقیقت پسندانہ فطرت کے مطابق ،درک کرتا ہے کہ وہ عالم ہستی کا ایک جزو ہے اور عالم ہستی کے دیگر اجزاء کے مانند ماورائے طبیعت ،یعنی ایک لامتناہی

زندگی،قدرت اور علم سے وابستہ ہے، عقل بھی اسی (خدا) کی مخلوق ہے۔ اسی لئے اسلام نے اپنی روش کو ''توحید'' کی بنیاد پر ستوار کیا ہے اور جو شخص خداپرست نہ ہو،وہ اسے انسان نہیں جانتا ۔یہاں پر ''توحید'' سے مراد خدا کی یکتائی پر عقیدہ رکھنا ہے،جو اپنے دین کے ذریعہ انسان کو سعادت کی دعوت دیتا ہے اور ایک دن اسکے اعمال کا حساب لیکر اسے مناسب جزادے گا ۔خدائے متعال اپنے کلام میں فرماتا ہے'': یہ سب(یعنی توحید سے بے خبر وگ)جانوروں جیسے ہیں بلکہ ان سے بھی کچھ زیادہ گمراہ ہیں ''[1]۔وحید کے جو معنی بیان کئے گئے ہیں ان کے مطابق وہ اسلام کی پہلی اصل اور اس کا بنیادی ستون ہے۔

اسلام کا دوسرا ستون ''پسندیدہ اخلاق'' ہے،جو توحید پر استوار ہے،کیونکہ اگراانسان توحید کے مطابق اخلاق نہ رکھتا ہو،تواس کا مقدس ایمان محفوظ نہیں رہے گا ۔اور اسی طرح،جیسا کہ بیان کیا گیا ،قوانین اورضوابط خواہ کتنے ہی ترقی یافتہ کیوں نہ ہوں، ہرگز ایک ایسے معاشرے کونہیں چلا سکتے جس میں اخلاقی انحطاط پایا جاتا ہو۔

اس لحاظ سے ،اسلام میں عقیدۂ توحید کے مطابق اخلاقیات کا ایک طویل سلسلہ جیسے:انسان دوستی،رحم دلی،عفت اور عدالت کے جیسے دوسرے امورانسانی معاشرے کے لئے مرتب کئے گئے ہیں جو توحید کے عقیدہ کے نفاذ کے ضامن اور قوانین وضوابط کے محافظ ہیں ۔معاشرے کی سعادت میں مفید و مؤثرہونے کی وجہ سے اخلاق کا دوسرا درجہ ہے،چوں کہ توحید پہلے درجہ پر ہے ۔

توحید اور اخلاق کے اصولوں کو مستحکم اور استوار کرنے کے بعد اسلام نے قوانین کا ایک طویل سلسلہ وضع کیا ہے ،جن کا تعلق اخلاق سے رابطہ ہے ،یعنی مذکورہ قوانین کا سر چشمہ پسندیدہ اخلاق ہے اور پسندیدہ اخلاق بھی اپنے قوانین کے ذریعہ مستحکم ہوتا ہے۔اور یہی قوانین و ضوابط ہیں جو معاشرے کے حیات بخش مفاد کا تحفظ کرتے ہیں اور لوگوں کے اختلافات کو دور کرتے ہیں۔

[1] ان ہم الا کا لانعام بل ہم اضل سبیلا) (فرقان،۴۴)

سماجی اختلافات

انسان کے اختلافات ،جو اتحاد واتفاق کے رشتہ کوتودیتے ہیں اور اجتماعی نظام کو درہم برہم کر دیتے ہیں ،دوقسم کے ہیں:

ا۔وہ اختلافات جو اتفاقی طور پر دوافراد کی ذاتی چپقلش کے نتیجہ میں رونما ہوتے ہیں، جیسے دوافراد کے درمیان کسی موضوع پر ہونے والا جھگڑا اور ایسے اختلافات کو عدلیہ رفع کرتی ہے ۔

۲۔وہ اختلافات جو طبیعی طور پر معاشرے کو دو مختلف گروہوں میں تقسیم کردیتے ہیں،اور اجتماعی انصاف کی طرف کسی قسم کی توجہ کئے بغیر ،ایک گروہ کو دوسرے گروہ پر مسلط کیا جاتا ہے اور کمزورطبقہ کی سعی وکوشش کے ماحصل کو طاقتور گروہ کے نام مخصوص کیا جاتا ہے، جیسے:حاکم ومحکوم ،دولت مند و فقیر ،عورت و مرداور ملازم وافسر کے طبقے ترقی یافتہ اور بے دین معاشروں میں اسی صورت میں زندگی کرتے ہیں اور ہمیشہ طاقتور لوگ کمزوروں اور اپنے ماتحتوں کا استحصال کرتے ہیں ۔

منافع کی حفاظت اوررفع اختلافات کے بارے میں اسلام کا عام نظریہ اسلام کلی طور پر،معاشرے کی سعادت، جو کہ لوگوں کے مفاد کی حفاظت اور ان کے اختلافات کے سدّباب کی مرہون منت ہے،کودوچیزوں کے ذریعہ فراہم کرتا ہے: ا۔طبقاتی امتیاز کو کلی طور پر لغوکر کے اس کی اہمیت کو ختم کردیتاہے ،اس معنی میں کہ اسلامی معاشرے میں لوگ آپس میں بھائی بھائی ہیں اور کسی کو ہرگز یہ حق نہیں ہے کہ دولت یا اجتماعی طاقت کے بل بوتے پر دوسروں پر برتری جتائے او رانھیں حقیر و خوار سمجھے اور ان سے فروتنی اختیار کرنے او رتسلیم ہونے کا تقاضا کرے،یا اپنے مخصوص عہدہ کی بناپر خود کو بعض اجتماعی ذمہ داریوں سے مستثنیٰ قرار دے یا کسی جرم کے مرتکب ہونے پر خود کو معاف اور سزا سے بری سمجھے ۔ قوانین و ضوابط کے نفاذ میں معاشرے کے سرپرست کا حکم نافذ ہے اور سب کواس کے سامنے سر تسلیم خم کرنا چاہئے اور اس کا احترام کرنا چاہئے، لیکن اس کو اپنے ذاتی اغراض و مقاصد میں یہ توقع نہیں رکھنی چاہئے کہ دوسرے لوگ اس کے سامنے سر تسلیم خم کریں یا جو کچھ وہ انجام دے اس کے بارے میں انھیں اعتراض وتنقید کرنے کا حق نہیں ہے کیونکہ وہ معاشرے کا فرمانروا ہے،اس لئے اسے بعض عام اور سماجی ذمہ داریوں او رفرائض

سے مشثنیٰ قرار دیا جائے۔ اسی طرح ایک دولت مند شخص کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنی دولت کو اپنے لئے فخر و مباہات کا سبب قرار دیکر غریبوں، محتاجوں اور اپنے ما تحتوں کی سرکوبی کرے۔ اس کے علاوہ معاشرے کے فرمانرواؤں کو یہ توقع نہیں کرنی چاہئے کہ لوگ ان کی اطاعت کرتے ہوئے ان کی ہر فضول بات کو معاشرہ کے پسماندہ اورناداروں کے مسلم حق کے مقابلہ میں فوقیت دیں۔ نیز اسلام ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دیتا ہے کہ کسی بھی طبقہ میں ایک طاقتور لوگ ناحق کمزوروں پر مطلق حکمرانی کریں۔ خدائے متعال اپنے کلام میں فرماتاہے'':اسلام کے پیرو آپس میں بھائی او رمساوی ہیں''[1] ۔نیز فرماتاہے'':خدا کا دین تمہاری (اہل کتاب اور مسلمان)آرزؤں اور خواہشوں کا تابع نہیں ہے،جو بھی برا کام انجام دے گا،اسے سزا ملے گی''[2] ۔

البتہ دین اسلام میں کچھ خصوصیات، جیسے : دین کے پیشواؤں کی اطاعت اور والدین کا احترام، ہیں کہ اس میں مساوات نہیں ہے،بلکہ صرف ایک طبقہ کے لئے دوسرے طبقہ کی نسبت کچھ فرائض ہیں، لیکن اس سلسلہ میں بھی جس کے حق میں یہ حکم ہے، وہ دوسروں پر برتری نہیں جتلا سکتا ،یعنی وہ دوسروں کے مقابلہ میں اپنے مقام پر فخر نہیں کرسکتا ہے۔جی ہاں، چونکہ انسان فطری طور پر امتیاز و فضیلت طلبی کی جبلّت رکھتا ہے، اسلام نے اس کی اس فطری جبلّت کو سر کوب کئے بغیر اس کے لئے ایک عمل معین فرمایا ہے اور وہ ''تقویٰ''ہے۔اسلام میں حقیقی قدر و قیمت پرہیزگاری کے لئے ہے اور چونکہ تقویٰ کا حساب چکانے والا خدائے متعال ہے، اس لئے یہ امتیاز جس قدر زیادہ ہوجائے،کوئی رکاوٹ ایجاد نہیں کرتا،اس کے برعکس طبقاتی امتیاز معاشرے میں فساد پھیلانے کا سب سے بڑا سبب اور افراد کے آپس میں ایک دوسرے کے لئے رکاوٹ کا باعث بنتا ہے۔ اسلام کی نظر میں ،ایک پرہیزگار فقیر، بے تقوی سرمایہ داروں کے ایک گروہ پر فضیلت رکھتا ہے اور ایک پرہیزگا عورت سیکڑوں لا ابالی مردوں سے بہتر ہے۔خدائے متعال فرماتا ہے'' : انسانو!ہم نے تم کو ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے اور پھر تم میں شا خیں اور قبیلے قرار دئیے ہیں تاکہ آپس میں ایک دوسرے کو پہچان سکو بیشک تم میں سے خدا کے نزدیک زیادہ محترم وہی ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے

---

[1] (انّما المؤمنون اخوہ...)(حجرات / ۱۰)۔

[2] (لیس باما نیکم ولا امانی اہل الکتاب من یعمل سو ء ایجز بہ)(نساء ،۱۲۲)۔

۱۔ ''نیز فرماتا ہے'': میں تم میں سے کسی بھی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہیں کروں گا ،چاہے وہ مرد ہو یا عورت ،سب ایک نوع سے ہیں اور انسان ہیں ۔[2]''

۲۔چوں کہ تمام افراد، انسانیت اور معاشرے کے رکن ہونے کے لحاظ سے شریک ہیں اور تمام لوگوں کا کام اوران کی کوشش محترم ہے،لہذاکچھ قوانین بنائے گئے ہیں تاکہ ان کی روشنی میں ہر فرد کے مفادات کا تعین ہو سکے اور اجتماعی تجاوز اور کشمکش کا راستہ خود بخود بند ہو جائے۔ابتدائی اصول کومد نظر رکھتے ہوئے یہ قوانین کچھ اس طرح بنائے گئے ہیں کہ معاشرے کے مختلف طبقاتی فاصلے بالکل ختم ہو جائیں ،دوریوں کو نزدیکیوں میں بدل دیا جائے۔ ان بیانات کی روشنی میں مفادات کے تحفظ اور معاشرے کے اختلافات کودور کرنے کے سلسلہ میں اسلام کا خاص طریقہ اجمالی طور پر واضح ہوجاتا ہے۔

عداوت و اختلاف سے اسلام کا مقابلہ

معاشرے کے مختلف طبقات میں طبیعی طورپر پیدا ہونے والے اختلافات،جیسے رعایا اورحاکم کا طبقہ ،غلام و مالک اور کام لینے والے و مزدور کے درمیان اختلافات دو طریقوں سے وجود میں آتے ہیں: ۱۔ایک شخص کا دوسرے شخص کے حقوق پر تجاوز کرنے سے:مثلاً کام لینے والا، مزدورکی مزدوری ادانہ کرے ،ایک مالک اپنے نوکر کی پوری اجرت نہ دے اس کے حق میں ظلم اور ناانصافی کرے یاحاکم اپنی رعایامیں سے کسی کے حق میں ظالمانہ حکم جاری کرے۔اسلام نے اس مشکل کو حل کرنے کے لئے بہت سے قوانین مقرر کئے ہیں،کہ ان کو نافذ کرنے سے ہرایک کے حقوق محفوظ رہ سکتے ہیں اور ہر شخص اپنے کھوئے ہوئے حقوق کو پاسکتا ہے ۔اسلام نے اس کام کے لئے معاشرے کی ہرفرد کو اجازت دی ہے کہ اگرکوئی شخص اس کے ساتھ ظلم کرے (چاہے وہ حاکم وقت ہی کیوں نہ ہو)توقاضی کے پاس شکایت کرنی چاہئے۔امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام کی خلافت کے زمانہ میں ایک مسلمان کاحضرتؑ کے ساتھ کچھ اختلاف ہوگیا،اس نے قاضی کے پاس جاکر استغاثہ کیا۔حضرتؑ ایک عام شخص کی طرح اس

---

[1] (یاایّہا النّاس انّا خلقنکم من ذکرٍ و انثی وجعلنکم شعوباً وقبائل لتعارفوا انّ اکرمکم عنداللہ اتقٰکم)(حجرات ،۱۳)۔
[2] (انّی لااضیع عمل عاملٍ منکم من ذکرٍاو انثی بعضکم من بعض)(العمران ،۱۹۵)۔

قاضی (جسے خودآپؑ نے منصوب فرمایا تھا) کے پاس حاضر ہوئے اور فیصلہ ہوا ۔ تعجب کا مقام یہ ہے کہ حضرتؑ نے قاضی سے فرمایا کہ شکایت کرنے والے اور میرے درمیان برتاؤ میں کسی قسم کا فرق نہ کرے ۔

۲ ۔ ایک طاقتور شخص کا کمزور اور اپنے ماتحت کے اوپر دھونس جمانااور اس کے ساتھ زیادتی کرنا ، جیسے ایک کام لینے والا اپنے مزدوروں کو ذلیل و خوار سمجھے ،کوئی مالک اپنے سامنے کھڑار کھے ،اور اسے اپنے سامنے جھک کر تعظیم کرنے پر مجبور کرے یا حاکم اپنی رعایا سے اعتراض اور استغاثہ کا حق چھین لے، کیونکہ اس قسم کے برتاؤ میں غیر خدا کی پرستش کا پہلو پایا جاتا ہے، اس لئے اسلام نے ان چیزوں سے سختی کے ساتھ منع فرمایا ہے ۔ اسلام میں کوئی بھی شخص اپنے ماتحت سے انجام فریضہ کے علاوہ کسی قسم کی توقع نہیں رکھ سکتا ہے اور ان پر اپنی بزرگی و عظمت کا مظاہرہ نہیں کرسکتا ہے ۔ اسلام میں بہت سے ایسے اخلاقی احکام موجود ہیں جو لوگوں کو سچائی، انصاف اور حسن اخلاق کی دعوت دیتے ہیں اور عہد و پیمان کی رعایت کرتے ہیں، نیکی اور خدمت کرنے والوں کی تشویق کرتے ہیں اور ،بد کرداروں،نا اہلوں او ر برے لوگوں کو سزا دیتے ہیں ۔

یہ ایسے پسندیدہ اخلاق ہیں کہ اگر معاشرے میں یہ نہ ہوں تو معاشرہ بد بختی سے دوچار ہوجائے گا اور دنیا و آخرت میں ناکامی و بد بختی میں مبتلا ہوگا ۔ ممکن ہے کہ کسی کو ان قوانین سے بے اعتنائی اور ان پر عمل نہ کرنا اس کے لئے بظاہر معمولی فائدہ ہو، لیکن دوسری طرف یہ ایک ناپاک او رخطرناک ماحول کو پیدا کرتا ہے کہ جو اس کو اس معمولی فائدہ سے محروم کرنے کے علاوہ اور بھی بہت سے فائدوں سے اس کو محروم کرتا ہے اور اس شخص کی مثال اس آدمی کی سی ہے جو ایک عمارت کے سنگ بنیاد کو باہر نکال کر اس پر ایک نئی عمارت تعمیر کرتا ہے اور اس طرح اس عمارت کی ویرانی کا سبب بنتا ہے ۔

رفع اختلاف کے لئے ایک عام وسیلہ

اسلام نے اپنے پیروؤں کو حکم دیا ہے کہ وہ معاشرے کے فائدے کے بارے میں سوچیں اور خود خواہی سے پرہیز کرکے اپنے

ذاتی مفاد کو اسلامی معاشرے کے فائدہ میں دیکھیں اور معاشرے کے نقصان کو اپنا نقصان سمجھیں۔ایک مسلمان کو پہلے حقیقی مسلمان ہونا چاہئے،اس کے بعد وہ ایک تاجر ،کسان، صنعت گر یا مزدور بنے اور جو شخص خاندان کو تشکیل دینا چاہتا ہے،اسے پہلے مسلمان ہونا چاہئے اس کے بعد اپنے فیصلہ پر عمل کرے۔ مختصر یہ کہ وہ جو بھی کام انجام دینا چاہے اور جو بھی مقام او رعہدہ سنبھالنا چاہے،اس کے لئے صحیح دین و ایمان کی ضرورت ہے۔ایسا شخص ہر کام اور ہر فیصلہ کے سلسلہ میں سب سے پہلے اسلام و مسلمین کی مصلحتوں اور فائدوں کو مد نظر رکھتا ہے،اس کے بعد اپنی ذاتی مصلحت کو مد نظر رکھتا ہے اور وہ ہرگز کوئی ایسا کام انجام نہیں دیتا جس میں اسلام و مسلمین کے لئے نقصان ہو اگر چہ اس کا م میں اس کا ذاتی فائدہ بھی نہ ہو۔

البتہ معلوم ہے اگر کسی معاشرے میں اس قسم کی فکر پیدا ہو جائے تو اس معاشرے کے افراد میں کبھی اختلاف پیدا نہیں ہوگا ۔خدائے متعا ل فرماتا ہے: (واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً ولا تفرقوا[1]) ''اوراللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رہو اور آپس میں تفرقہ نہ پیدا کرو''،نیز فرماتاہے:(و ان ہذا صراطی مستقیماً فاتبعوہ ولاتتبعوا السّبل فتفرق بکم عن سبیلہ[2]) ''اور یہ ہمارا سیدھا راستہ ہے اس کا اتباع کرو اور دوسرے راستوں کے پیچھے نہ جاؤ کہ راہ خدا سے الگ ہو جاؤ گے...''۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں'': مسلمانوں کو آپس میں بھائی بھائی ہونا چاہئے تاکہ اغیار کے مقابلہ میں ایک طاقت کی صورت بنائیں[3]۔''

نماز،روزہ اورحج یارفع اختلافات کا وسیلہ

اسلام کے فخر ومباہات میں سے ایک مسئلہ ''عبادت'' ہے اور وہ یہ ہے کہ دوسرے ادیان کے لوگ،جیسے یہود ونصاری اپنے دینی احکام کے مطابق عمومی عبادت خانوں کے علاوہ عبادت سے محروم ہیں اور ان کے مذہبی قانون کی نظر میں وہ کلیسا اور اپنے

---

[1] آل عمران،١٠٣
[2] انعام،١٥٣
[3] والمسلمون تتکافأ دماؤہم وہم ید علی من سواہم ...(اصول کافی،ج١،ص٤٠٣)۔

عبادت خانوں کے علاوہ کہیں عبادت انجام نہیں دے سکتے اور نماز نہیں پڑھ سکتے ہیں ۔ لیکن اسلام میں ان پابندیوں کو ختم کر دیا گیا ہے اور ہر مسلمان پر واجب ہے کہ اپنی عبادت کو جہاں چاہے انجام دے ، مسجد میں ہو یا کہیں اور، مسلمان معاشرے میں ہو یا کفر کے معاشرے میں،لوگوں کے درمیان ہو یاتنہا ، صحت مندی کی حالت میں ہو یا بیماری کی حالت میں ۔

بہر حال اپنی عبادت کوانجام دینا چاہئے ،اور یہ بذات خود اسلام کی کامیابی کے اسرار میں سے ایک ہے ۔پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے'' :میرے لئے تمام روئے زمین عبادت خانہ اور پرستش گاہ ہے [۱]۔ ''اسی لئے شریعت اسلام نے نماز،روزہ اورحج کو پہلے مرحلہ میں انفرادی قرار دیا ہے،اس معنی میں کہ ہر فرد سے اس کی انجام دہی کا مطالبہ کیا ہے اور جماعت میں شریک ہونے کو لازم نہیں کیاہے ۔لیکن دوسرے مرحلہ میں ان عبادتوں کے اجتماعی فوائد کو بھی نظرانداز نہیں کیا ہے اور انھیں اجتماعی اہمیت دی ہے مثلا انسان اس کے ذریعہ اپنے پروردگار کی بارگاہ میں اپنی بندگی ونیاز مندی کا اظہار کرتا ہے لہذا جماعت میں حاضر ہونا مستحب قرار دیا ہے ۔اسی طرح روزہ جو انفرادی ریاضت کے لئے قرار دیا گیا ہے اور مسلمانوں کو سال میں ایک مہینہ دن کے میں کھانے پینے اور جنسی آمیزش سے پر ہیز کرنا چاہئے اور اس کے ذریعہ اپنے اندر پر ہیز گاری اور تقویٰ پیدا کرے،اس کے باوجود اس کے کہ یہ ایک انفرادی فریضہ ہے اور اس میں اجتماعی پہلو نہیں پایا جاتا،لیکن شوال کی پہلی تاریخ کو ماہ مبارک رمضان میں فریضہ کے انجام کے شکرانہ میں مسلمان عید منائیں اور ان پر فرض ہے کہ نماز عید فطر کو باجماعت پڑھیں ۔

اسی طرح حج میں جس کے ذریعہ ،خدا کی دعوت پر لبیک اور مادی میلانات سے دوری اورپروردگار کی ذات کی طرف توجہ کرنا ہوتا ہے ،باوجودیکہ یہ ایک انفرادی عبادت ہے،لیکن چونکہ عبادت کی ایک خاص و معین جگہ ہے ،لہذا دنیاکے مسلمان مجبورا ایک جگہ پر جمع ہو تے ہیں اورایک دوسرے کے حالات سے آگاہ ہوتے ہیں۔اس کے علاوہ ذی الحجہ کی دسویں تاریخ کو ۔ جس دن حج کے بعض اعمال انجام دئیے جاتے ہیں ۔اسلامی عید قرار دیا گیا ہے اور مسلمانوں پر واجب ہے کہ ایک جگہ جمع ہو کر نماز عید پڑھیں ۔اسلام

---
[۱] سفینہ البحار، ج ۱، ص ۱۹۔

میں جو یہ اجتماعات مقرر ہوئے ہیں ،یہ لوگوں کے طبقاتی اختلافات کو دور کرنے کا بہترین وسیلہ ہے ،کیونکہ طبقاتی اختلافات کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دینے کے لئے موثر ترین طریقہ ایک دوسرے کے درمیان موجود غلط فہمی کو دور کرنا ہے اور یہ خاصیت اجتماعی عبادت میں مکمل طور پر موجود ہے کیونکہ جوخدا کی عبادت کو اخلاص کے ساتھ انجام دیتا ہے ،اس کا خدا کے سوا کسی اور کے ساتھ سرو کار نہیں ہوتا ہے اور خدا کی رحمتوں کے دروازے ہر ایک کے لئے کھلے ہیں اور اس کی ابدی نعمتوں کا خزانہ کبھی ختم ہونیوالا نہیں ہے اور اس کی ذات اقدس رکاوٹ کے بغیر ہر ایک کو قبول کرتی ہے،جس کے نتیجہ میں اجتماعی عبادت کے دوران جو انس ،اورالفت و محبت لوگوں میں پیدا ہوتی ہے وہ اختلافات اور کدورتوں کو دور کرنے کا بہترین وسیلہ ہے ۔چنانچہ پہلے بھی اشارہ کیا جاچکا ہے ،کہ ہم سب جانتے ہیں کہ دین مقدس اسلام کے معارف کلی طور پر تین حصوں میں تقسیم ہوئے ہیں : ''اصول دین ،اخلاق اور فقہی فروع ۔''واضح ہے کہ اس کے علاوہ اصول دین یعنی دین کی بنیاد،تین اصولوں پر مشتمل ہے کہ انسان ان میں سے ایک کے نہ ہونے پر دین سے خارج ہوجا تا ہے:۱۔ توحید یعنی کائنات کے پروردگار کی یکتائی کا اعتقاد ۔

۲۔خدائے متعال کے انبیاء علیہم السلام پرعقیدہ رکھنا ہے جن کے آخری پیغمبر حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں ۔

۳۔معاد پر ایمان یعنی یہ عقیدہ رکھنا کہ خدائے متعال موت کے بعد سب کو زندہ کرے گا اور ان کے اعمال کا حساب وکتاب لیا جائے گا ،نیک لوگوں کو ان کی نیکی کی جزا دی جائے گی اور برے لوگوں کوانکی برائی کی سزادی جائے گی ۔مذکورہ تین اصولوں میں دواصولوں کا اور اضافہ کیا جا تاہے،جو شیعہ عقائد کا حصہ اور مسلمات میں سے ہیں ،اورانسان ان میں سے کسی ایک پر عقیدہ نہ رکھنے کی وجہ سے شیعہ مذہب سے خارج ہوجاتا ہے،اگر چہ اسلام کے دائرہ سے خارج نہیں ہوتا ،یہ دواصول حسب ذیل ہیں: ۱۔عدل

۲۔امامت

عقائد

۱۔توحید

۲۔نبوت

۳۔معاد

۴۔عدل

۵۔امامت

۱۔توحید

اثبات صانع

انسان جب حقیقت بینی کی فطرت سے کام لیتا ہے تو عالم ھستی کے ہر گوشہ و کنار پر نظر ڈالنے سے اسے پروردگار عالم او رخالق کائنات کے وجود کی بہت سی دلیلیں نظر آتی ہیں، کیونکہ انسان اپنی حقیقت پسندانہ فطرت سے محوس کرتاہے کہ مخلوقات میں سے ہر ایک،وجود کی نعمت سے مالامال ہے اور ان میں سے ہر ایک اپنے وجود میں،قہری طور پر ایک معین راستہ کو طے کررہا ہے اور ایک مدت کے بعد وہ اپنی جگہ کو دوسرے کے لئے چھوڑتاہے، اس نے ہر گز اپنے اس وجود کو خودہی اپنے لئے فراہم نہیں کیا ہے او رجس منظم راہ پر گامزن ہے،اسے خودہی اپنے لئے نہیں بنایا ہے اوراپنے سفرکے راستہ کی ایجاد اور اس کے نظم و نسق میں کسی قسم کی مداخلت نہیں رکھتا، کیونکہ انسان نے، انسانیت اور انسانی خصوصیات کو اپنے لئے خود اختیار نہیں کیا ہے، بلکہ انسان کو پیدا کیا گیا ہےاور انسانی خصوصیات اسے عطا کی گئی ہیں۔

اسی طرح حقیقت پسندانہ انسانی فطرت اس بات کو قبول نہیں کرتی ہے کہ یہ سب اشیاء خود بخود وجود میں آئی ہوں گی اور کائنات میں موجود نظام یوں ہی کسی حساب و کتاب کے بغیر وجود میں آگئے ہوں گے، جبکہ انسان کا ضمیر اس قسم کے اتفاق کو منظم طور پر ایک دوسرے کے اوپر چنی گئی چند اینٹوں کے بارے میں قبول نہیں کرتا۔یہاں پر انسان کی حقیقت پسندانہ فطرت اعلان کرتی ہے کہ عالم ھستی کی ضرور کوئی پناہ گاہ ہے،جوھستی کا سر چشمہ،اور کائنات کو پیدا کرنے اوراسے باقی رکھنے کے لئے اس کی حفاظت کرنے والا

ہے ،اور وہ لا محدودوجود اور علم و قدرت کا سر چشمہ،خدائے متعال کی ذات ہے ،اور اس کائنات کے وجود کا سر چشمہ خدا کی ذات ہے چنانچہ خدائے متعال فرماتا ہے: (الذی اعطی کل شی ء خلقہ ثم ہدی[1]) ''(خالق کائنات)وہ ہے جس نے ہرشے کو اس کی مناسب خلقت عطا کی ہے اور پھر ہدایت بھی دی ہے ۔''اسی فطرت کی وجہ سے،جہاں تک تاریخ بتاتی ہے ،انسانی معاشرہ کی اکثریت ،کائنات کیلئے ایک خدا کے قائل رہے ہیں اور اسلام کے علاوہ دوسرے تمام ادیان جیسے نصرانیت، یہودیت ،مجوسیت اور بدھ مت اس سلسلہ میں ہم عقیدہ ہیں اور جو پروردگار کے وجود کے مخالف ہیں ،ان کے پاس اسکے وجود کے انکار کے سلسلہ میں ہرگز کوئی دلیل نہیں ہے ،بلکہ حقیقت میں وہ کہتے ہیں کہ:ہم پروردگار کے وجود کی کوئی دلیل نہیں رکھتے یہ نہیں کہتے ہیں کہ ہمارے پاس اس کے عدم وجود کی کوئی دلیل ہے ۔

مادہ پرست انسان کہتا ہے : ''میں نہیں جانتا '' یہ نہیں کہتا ہے ''نہیں ہے ''دوسرے الفاظ میں مادہ پرست انسان مذبذب ہے نہ منکر ۔خدائے متعال اپنے کلام میں اس مطلب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: (وقالوا ما ہی الآ حیاتنا الدنیا نموت ونحیا وما یہلکنا الآ الدھر وما لہم بذلک من علم ان ہم الا یظنون[2]) ''اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ صرف زندگانی دنیا ہے اس میں مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور زمانہ ہی ہم کو ہلاک کر دیتا ہے اور انھیں اس بات کا کوئی علم نہیں ہے کہ یہ صرف ان کے خیالات ہیں اور بس۔''

ابتدائے خلقت کی بحث

انسان اپنی خداداد فطرت سے ہر مظہر وحادثہ کا مشاہدہ کرنے کے بعد اس کے وجود میں آنے کی علت تلاش کرتا ہے اور ہرگز احتمال نہیں دیتا ہے کہ کوئی چیز خود بخوداور کسی سبب کے بغیر وجود میں آئی ہوگی ۔اگر کسی ڈرائیور کی گاڑی خراب ہوجاتی ہے تو وہ گاڑی سے اتر کرگاڑی میں اس جگہ کو دیکھتا ہے جہاں خراب ہونے کا احتمال ہو تا ہے تاکہ گاڑی کے رکنے کا سبب معلوم کر سکے اوراسے ہرگز یقین نہیں ہوتا ہے کہ گاڑی خرابی کے بغیر رک گئی، اور گاڑی کو پھر چلانے کے لئے اس کے تمام وسائل سے استفادہ

---

[1] طہ ٥٠

[2] جاثیہ ٢٤

کرتا ہے اور ہرگز اس اتفاق کا منتظر نہیں رہتا ہے کہ گاڑی خود بخود چلے گی۔انسان کو اگر بھوک لگ جائے تو وہ روٹی کی فکر میں پڑتاہے اورجب اسے پیاس لگتی ہے تو پانی تلاش کرتا ہے اور اگر سردی محسوس کرتاہے تولباس اور آگ ڈھونڈتا ہے ۔وہ کبھی کسی اتفاق کے ذریعہ ان ضرورتوں کو دور کرنے کا انتظار نہیں کرتا اور اس خوش فہمی میںآرام سے نہیں بیٹھتا۔جو شخص کسی عمارت کو تعمیر کرنا چاہتا ہے وہ لامحالہ اس کے سازوسامان ،معماراور مزدور وغیرہ کا انتظام کرتا ہے اوروہ بالکل یہ امید نہیں رکھتا کہ اس کی آرزو خود بخود پوری ہوجائے۔ انسان جب سے ہے اسی وقت زمین پر پہاڑ،جنگل،وسیع دریا اور سمندر موجود ہیں۔

اور اس وقت سے سورج ،چاند اورچمکنے ہوئے ستاروں کو آسمان پر منظم اور مسلسل متحرک دیکھ رہاہے ۔اس کے باوجوددنیا کے سائنسدان اپنی انتھک علمی کوشش اورتگ دو سے مخلوقات اور حیرت انگیزمظاہر کے وجود میں آنے کے اسباب وعلل کے بارے میں بحث کررہے ہیں اور وہ ہرگز یہ نہیں کہتے کہ جب سے ہم ہیں اسی وقت سے ان کواسی طرح دیکھ رہے ہیں،لہذا یہ خود بخودپیدا ہوئے ہیں۔اسی جستجو کی فطرت اور اسباب وعلل کی بحث و تحقیق نے انسان کو مجبور کردیا ہے کہ وہ عالم ہستی اور اس کے حیرت انگیز نظام کی پیدائش کے بارے میں کھوج کرے کہ کیا یہ وسیع کائنات ،جس کے اجزاایک دوسرے سے مربوط ہیں اور حقیقت میں ایک عظیم مظہر ہے ،خود بخود وجود میں آیا ہے یا اس کا سر چشمہ کہیں اور ہے ؟!اور کیا یہ حیرت انگیز نظام ،جو ثابت اور بلا استثناء قوانین کے مطابق کائنات کے گوشہ وکنار میں جاری ہے اور ہرچیز کو اس کے خاص مقصد کی طرف راہنمائی کرتا ہے ،ایک بے انتہا قدرت اور علم کی طرف سے جاری اور اس کا نظام چلایا جاتا ہے،یاکسی حادثہ اور اتفاق کے نتیجہ میں پیدا ہواہے ؟

معرفت خدا اور ملتیں

ہم جانتے ہیں کہ عہد حاضر میں روئے زمین پر دین داروں کی اکثریت ہے،اور وہ خالق کائنات پراعتقاد رکھتے ہیں اور اس کی پرستش کرتے ہیں ۔کل کے انسان کی حالت بھی آج کے انسان کی سی تھی ،جہاں تک تاریخ بتاتی ہے ،وہ یہ کہ انسانوں کی اکثریت دین دار تھی اوروہ کائنات کے لئے ایک خدا کے قائل تھے ۔اگر چہ خداشناس اور دین دارمعاشروں میں،فکری اختلاف بھی تھااور ہر قوم

چشمہ تخلیق کو مخصوص اوصاف سے متصف کرتی تھی،لیکن اصل مقصد میں وہ اتفاق نظر رکھتے تھے،حتی قدیم ترین تمدن کے آثار جنھیں انسان نے کشف کیاہے،ان میں دین اور خداشناسی کی علامتیں پائی جاتی ہیں اور ایسی علامتیں بھی ملی ہیں کہ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ماورائے طبیعت پر بھی اعتقاد وایمان رکھتے تھے ۔

حتی جدید بر اعظموں جیسے امریکہ اورآسٹریلیا اور قدیمی براعظموں کے دور دراز جزائرجو آخری صدیوں میں کشف ہوئے ہیں،ان کے اصل باشندے بھی خدا کے معتقد تھے،اور وہ تصور کائنات کے سلسلہ میں اختلافات نظر کے با وجود کائنات کا ایک سرچشمہ تسلیم کرتے تھے اگر چہ قدیم دنیاسے ان کے رابطہ کی تاریخ معلوم نہ ہو سکی ۔

اس بات پر غور کرنا کہ خدا کا اعتقاد انسانوں کے درمیان ہمیشہ سے موجود تھا ،اس مطلب کو واضح کر تا ہے کہ خدا کو پہچاننا انسان کی فطرت ہے اور انسان اپنی خداداد فطرت سے،کائنات کی تخلیق کے لئے ایک خدا کو ثابت کرتا ہے۔خدائے متعال نے انسان کی اس فطری خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:(ولئن سألتھم من خلقھم لیقولن اللّٰہ[1]) ''اگر ان سے پوچھ لوگے کہ انھیں کس نے پیدا کیا ہے؟ تو یقیناًکہیں گے خدانے''،نیز فرماتا ہے :(و لئن سالتھم من خلق السمٰوات و الارض لیقولن اللّٰہ[2]) ''اگر ان سے پوچھ لوگے کہ انھیں کس نے پیدا کیا ہے؟تو یقیناًکہیں گے : خدا''

انسان کی زندگی میں تجسس کا اثر

اگر انسان نے خالق کائنات اور اس کے نظام کے پیدا کرنے والے ۔جو کہ اس کی فطرت کا اقتضاء ہے ۔کے بارے میں مثبت جواب دیا ،تو اس نے کائنات اور اس کے حیرت انگیز نظام کی پیدائش کے لافانی مبداء کو ثابت کیا اوراس نے تمام چیزوں کو خدا کے محکم ارادہ سے جو اسکی لامحدود قدرت و علم پر مبنی ہے ۔اور نتیجہ میں وہ پورے وجود میں ایک قسم کے اطمینا ن واعتماد کو محسوس

[1] زخرف۸۷
[2] لقمان۲۵

کرتا ہے۔اوروہ اپنی زندگی میں رونما ہونے والی ہر قسم کی مشکلات اور سختیوں سے دوچار ہونے پر ہرگز نا امید نہیں ہوتا ہے بلکہ ان سے نپٹنے کے لئے ہر قسم کی تدبیر سے کام لیتا ہے،کیونکہ وہ جانتا ہے کہ کوئی بھی علت وسبب۔ خواہ وہ کتنا قوی ہو۔ اس کی باگ ڈور خدا کے ہاتھ میں ہے اور ہر چیز اس کے زیر فرمان ہے ۔ایسا شخص کبھی اسباب وعلل کے سامنے سراپا تسلیم نہیں ہوتا اور جب کبھی دنیا کے حالات اس کے مطابق ہوتے ہیں تو غرور و تکبر سے اس کا دماغ خراب نہیں ہوتا اوروہ اپنی اور کائنات کی حقیقی حیثیت کوفراموش نہیں کرتا ،کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ظاہری اسباب وعلل خود مختار نہیں ہیں بلکہ ان کا تعلق حکم خدا سے ہے ۔

آخر کار ایسا انسان یہ جان لیتا ہے کہ عالم ہستی میں خدائے متعال کے علاوہ کسی اور کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرنا چاہئے اور خدا کے فرمان کے علاوہ کسی بھی فرمان کے سامنے مطلق طورپر تسلیم نہیں ہونا چاہئے ۔لیکن جس نے مذکورہ سوالات کا منفی جواب دیا ،وہ اس امید اور حقیقت پسندی عالی منشی اور فطری شجاعت کا حامل نہیں ہے ۔

یہی وجہ ہے کہ ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ جن ملتوں میں مادیت کا غلبہ ہے وہاں روز بروز خود کشی کے واقعات زیادہ رونما ہوتے ہیں ،اور جن کا اعتقاد حسی اسباب و علل تک محدود ہو وہ چھوٹے سے چھوٹے نامناسب حالات کے رونما ہونے پراپنی سعادت و کامیابی سے نا امید ہو کر اپنی زندگی کا خاتمہ کردیتے ہیں،لیکن جو لوگ خدا شناسی کی نعمت سے مالامال ہیں،وہ موت کے دہانے پر بھی نا امید نہیں ہوتے،کیونکہ وہ خدائے قادر وبینا پر ایمان رکھتے ہیں ،اس لئے مطمئن و امید وار ہوتے ہیں ۔

حضرت امام حسین علیہ السلام اپنی زندگی کے آخری لمحات میں جبکہ چاروں طرف سے دشمن کے تیر وتلوار کا نشانہ بنے ہوئے تھے ،فرماتے ہیں'' :تنہا جو چیز اس ناگوار مصیبت کو میرے لئے آسان بنا رہی ہے ،وہ یہ ہے کہ میں خدائے متعال کو مسلسل اپنے اعمال پر ناظر دیکھتا ہوں ۔''

توحید کے بارے میں قرآن مجید کا اسلوب

اگر انسان پاک طبیعت اور مطمئن دل سے ،کائنات پر نظر ڈالے تو اس کے ہر گوشہ وکنار میں وجود خدا کے آثار ودلائل کا مشاہدہ کرے گا اور اس حقیقت کے ثبوت میں ہر در و دیوار سے گواہی سن لے گا ۔ اس دنیا میں جو چیز بھی انسان کے سامنے آتی ہے وہ خدا کی پیدا کی ہوئی اور مظہر ہے،یا کوئی خاصیت خدا نے اس میں پیدا کردی ہے یاایک ایسا نظام ہے جو خدا کے حکم سے ہر چیز میں جاری ہے اورانسان بھی انہی میں سے ایک ہے اوراس کاپورا وجود اس حقیقت کی گواہی دیتا ہے ،کیونکہ نہ اس کااپنا وجوداپنے آپ سے ہے اورنہ ہی اس سے ظاہر ہونے والی خاصیتیں اس کے اختیار میں ہیں اورنہ اس نے اپنی زندگی کی اس نظام کو خود بنایا ہے جو اس کی پیدائش سے ابھی تک جاری ہے اوروہ یہ فرض کرسکتا ہے کہ اس کائنات کا نظام اتفاقی طور پر وجود میں آگیا ہے ،اورنہ ہی وہ اپنے وجود اور اپنے وجود کے نظام کو اس ماحول کی طرف نسبت دے سکتا ہے جس میں وہ پیدا ہوا ہے ،کیونکہ مذکورہ وجوداور یہ نظام خود اس ماحول کی پیداوار نہیں ہے اورنہ وہ اتفاقاً وجود میں آیا ہے ۔یہاں پر انسان کو اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ عالم ھستی کے لئے ایک سرچشمہ تسلیم کرے جو اشیا کو خلق کرنے والا اور ان کی پرورش کرنے والا ہے ۔

وہی ہر مخلوق کوپیدا کرتا ہے اوراس کے بعد بقا اورایک خاص نظام کی شاہراہ پراس کے مخصوص کمال کی طرف ہدایت کرتا ہے ،چونکہ انسان عالم ھستی میں اشیاء کو آپس میں ایک دوسرے سے مربوط اور ایک خاص نظام سے منسلک پاتا ہے ،اس لئے مجبوراً فیصلہ کرتا ہے کہ خلقت کا سرچشمہ اور اس کے نظام کو چلانے والا ایک ہی ہے ۔انسان پر یہ حقیقت معمولی توجہ سے واضح ہوجاتی ہے، اور اس میں کسی قسم کا ابہام نہیں پایا جاتا ۔ سوائے اس کے کہ انسان کبھی زندگی کی کشمکشوں میں ایسا گرفتار ہوتاہے کہ اپنی عقل و شعور کی تمام توانائیوں کو حیاتی مبارزوں کی راہ میں استعمال کرتاہے اور اپنے تمام وقت کو زندگی کی دوڑ دھوپ میں صرف کرتاہے، اور اس قسم کی چیزوں کے بارے میں غور کرنے کی تھوڑی سی بھی فرصت نہیں نکال پاتا اور نتیجہ میں اس حقیقت سے غافل رہتاہے، یا یہ کہ طبیعت کے دل فریب مظاہر سے متاثر ہوکر ہوس رانیوں اور عیاشیوں میں سرگرم ہوتاہے ۔

چونکہ ان حقائق کی پابندی انسان کو بہت سی مادی لاابالیوں سے روکتی ہے، اس لئے وہ فطری طور پر ان حقائق کی تحقیق کے سلسلہ میں پہلوتہی کرتا ہے اور اس ذمہ داری کو قبول کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوتا۔ اس لئے قرآن مجید میں مخلوقات کی پیدائش اور ان میں جاری نظام کے بارے میں گوناگون طریقوں سے بہت زیادہ توجہ دلائے گئی ہے اور برہان و دلائل پیش کئے گئے ہیں، کیونکہ اکثر لوگ خاص کروہ لوگ جو فطرت کے دل فریب مظاہر کے شیفتہ ہو چکے ہیں اوروہ اپنی زندگی کی سعادت و کامیابی کو عیاشیوں و خوش گزرانیوں میں پاتے ہیں، اور مادیات و محسوسات سے انس و محبت کی وجہ سے فلسفی فکر او رنظریات کی عقلی تحقیق سے محروم ہیں۔ لیکن انسان ہر حالت میں عالم ھستی کا ایک جزو ہے اور کائنات کے دیگر اجزاء اور اس میں جاری جزئی او رکلی نظاموں سے ایک لحہ بھی بے نیاز نہیں ہے، اور ہر لمحہ اپنے ذہن کو عالم ھستی اور اس میں جاری نظام کی طرف متوجہ کر سکتا ہے، اور کائنات کے خالق کے وجود کو پا سکتا ہے۔

خدائے متعال اپنے کلام پاک میں فرماتا ہے: (اِن فی السمٰوات و الارض لاٰیٰتِ للمومنین، و فی خلقکم و ما یبثّ من دابۃ آیٰت لقوم یوقنون و اختلاف الّیل و النّہار و ما انزل اللّٰہ من السّمآء من رزق فاحیا بہ الارض بعد موتہا و تصریف الریح ء اٰیٰت لقوم یعقلون[1]) ''بیشک آسمانوں او رزمینوں میں صاحبان ایمان کے لئے بہت سی نشانیاں پائی جاتی ہیں۔ اور خود تمہاری خلقت میں بھی او رجن جانوروں کو وہ پھیلاتا رہتا ہے ان میں بھی صاحبان یقین کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں۔اور رات دن کی رفت و آمد میں او رجو رزق خدانے آسمان سے نازل کیا ہے، جس کے ذریعہ سے مردہ زمینوں کو زندہ بنایاہے اور ہواؤں کے چلنے میں اس قوم کے لئے نشانیاں پائی جاتی ہیں جو عقل رکھنے والی ہے۔''

[1] جاثیہ٣۔٥

مثال اور وضاحت

قرآن مجید میآیتیں ہیں،جن میں انسان کو چاند،ستاروں،زمین ،آسمان ،سورج ،پہاڑوں، دریاؤں،نباتات، حیوانات او رخودانسان کی خلقت کے بارے میں غور و فکر کرنے کی دعوت دی گئی ہے، اور ان میں سے ہر ایک کا جو حیرت انگیز نظام ہے اس کی یاددہانی کرائی گئی ہے۔ حقیقت میں کائنات کا نظام ، جو کائنات کی گوناگون سرگرمیوں کو خلقت کے مقاصد اور کائنات کے اہداف کی طرف بڑھاتاہے، وہ نہایت ہی حیرت انگیز او رتعجب خیز ہے۔ گیہوں کا ایک دانہ یا بادام کی ایک گٹھلی زمین سے اگنے کے بعد ایک پودے یا میوہ دار درخت میں تبدیل ہوجاتاہے۔ اوریہ دانہ یا گٹھلی مٹی میں قرار پانے کے بعد شگافتہ ہو کراس کی سبز نوک باہر نکلتی ہے اور اس میں جاتی ہے، جب یہ پودا اپنے مقصد کی منزل تک پہنچتا ہے تو اس دوران مختلف ا ور عظیم نظام سرگرم ہوتے ہیں کہ جن کی عظمت و وسعت کا مشاہدہ کرکے عقل متحیر رہ جاتی ہے۔

ستارے، آسمان اور چمکتا ہوا سورج او ر درخشان اور زمیں ہر ایک اپنی وضعی وانتقالی گردشوں او راپنے اندر پوشیدہ توانائیوں سے اور اسی طرح اس دانہ یا گٹھلی میں قرار دی گئی، پر اسرار طاقتیں، اور سال کے موسم، اور ان کے حالات، ابرو ہوا اور بارش، ا ور شب و روز، گندم کے ایک پودے کے اگنے میں مدد کرتے ہیں، اس نئے پودے کو پرورش کے لئے اپنے گہوارہ میں سلاتے ہیں، دایا اور نرسوں کے مانندایک دوسرے کا تعاون کرتے ہوئے کوشش کرتے ہییہاں تک کہ یہ دانہ اپنی بالیدگی ورشد کے آخری مرحلہ تک پہنچ جائے۔ یہی مثال انسان کے ایک نو مولود بچے کی ہے کہ جس کا نظام پیدائش ایک پودے یاکسی دوسری چیز کی پیدائش سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہے ۔یہ خلقت کے منظم وپیچیدہ نظام کے لاکھوں بلکہ کروڑوں سال کی سرگرمیوں کا ماحصل ہے ۔ ایک انسان کی روز مرہ کی زندگی کی گردش۔ اپنے وجود سے باہر عالم ھستی سے رکھنے والے رابطہ کے علاوہ ۔اپنے وجود کے اندر ایک حیرت انگیز نظام سے نشاط سے مربوط ہے کہ دور اندیش سائنسدانوں کی فکریں صدیوں سے مسلسل ان کے ظاہر کا مشاہدہ کرنے میں سرگرم عمل رہی ہیں اور ہر روز ان اسرار سے پردہ اٹھایا جاتا ہے اور ابھی بھی ان کی معلومات مجہولات کی نسبت بہت کم ہیں ۔

قرآن مجید کی نظر میں خدا شناسی کا طریقہ

جس شیر خوار بچہ نے دودھ پینے کے لئے ماں کا پستان پکڑرکھا ہے اور دودھ پی رہا ہے، حقیقت میں وہ دودھ چاہتا ہے ،اس کے علاوہ اگر کسی چیز کو ہاتھ میں اٹھا تا ہے تواسے کھانے کے لئے اپنے منہ تک لے جاتا ہے ،در اصل اس چیز کو اس نے کھانے کے لئے اٹھا یا تھااور جوں ہی احساس کرتا ہے کہ اس نے غلطی کی ہے اور اٹھائی ہوئی چیز کھانے کی نہیں ہے ،تو اسے پھینک دیتا ہے ۔اسی ترتیب سے ،انسان جس مقصد کے پیچھے دوڑتا ہے ،اصل میں وہ حقیقت کو چاہتا ہے، اگر اس کے لئے واضح ہو جائے کہ اس نے غلطی کی ہے اور غلط راہ پر چلا ہے ،تو اپنی غلطی اور خطا سے ناراض ہوتا ہے اور غلط مقصد کی راہ کی محنت پر افسوس کرتا ہے اور مختصر یہ کہ انسان ہمیشہ اشتباہ اور خطا سے پرہیز کرتا ہے اور حتی الامکان حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے ۔یہاں پر معلوم ہوتا ہے کہ انسان فطرت اور جبلت کی رو سے حقیقت پسند ہے ،یعنی لامحالہ ہمیشہ حقیقت کی جستجو اور حق کی پیروی کرنے والا ہوتا ہے ،اس نے اس فطری عادت کو کسی سے یاد اور کہیں سے نہیں سیکھا ہے ۔

انسان اگر کبھی سخت رویہ اختیار کر کے حق کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالتا ہے ،وہ اس لئے ہے کہ وہ خطا واشتباہ سے دو چار ہوتا ہے اور حق و حقیقت اس کے لئے واضح نہیں ہوتی ہے اگر اس کے لئے حق واضح ہو تاتو غلط راستہ پر نہ چلتا ۔کبھی انسان نفسانی خواہشات کی پیروی میں ایک قسم کی دماغی بیماری سے دو چار ہوتا ہے اور حق کی شیرینی کا مزہ اس کے منہ میں کڑوا بن جاتا ہے ،اس وقت حق کو جانتے ہوئے بھی اس کی پیروی نہیں کرتا ہے ۔اس کے باوجود کہ وہ حق کی حقانیت اور یہ کہ اسے اس کی پیروی کرنی چاہئے ،کااعتراف کرتا ہے ،لیکن اسکی اطاعت کرنے سے سرکشی کرتا ہے ۔ چنانچہ بہت سے ایسے اتفاقات بھی ہوتے ہیں کہ انسان مضر اور نقصان دہ چیزوں کا عادی ہو کر ،اپنی انسانی فطرت ،جوکہ خطرہ اور ضرر سے محفوظ رکھتی ہے ،کو پامال کرتا ہے ،اور ایک ایسے کام کو انجام دیتا ہے ،جس کے بارے میں جانتا ہے کہ وہ نقصان دہ ہے ۔ (جیسے :سگریٹ ،شراب اور نشہ آور چیزوں کے عادی لوگ)قرآن مجید انسان کو حق پسندی اور حق کی پیروی کرنے کی دعوت دیتا ہے اور اس سلسلہ میں زیادہ تاکید کرتا ہے اور

گوناگون بیانات کے ذریعہ انسان سے درخواست کرتا ہے کہ حق پسندی اور حق کی پیروی کی فطرت کو اپنے اندر زندہ رکھے۔ خدائے متعال فرماتا ہے: (فماذا بعد الحق الا الضلل[1]) ''اور حق کے بعد ضلالت کے سوا کچھ نہیں ہے۔'' (والعصر ان الانسان لفی خسر الاّ الذین ءآمنوا وعٰملوا الصّٰلحٰت وتواصوا بالحق وتواصوا بالصّبر[2]) ''قسم ہے عصر کی یقینا انسان خسارہ میں ہے۔ علاوہ ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کئے اور ایک دوسرے کو حق اور صبر کی وصیت و نصیحت کی۔''

واضح ہے کہ خداوند عالم کی یہ ساری تاکیدیں اس لئے ہیں کہ اگر انسان اپنی حقیقت پسندی کی فطرت کو زندہ نہ رکھے اور حق و حقیقت کی پیروی کی کوشش نہ کرے تو اپنی سعادت و کامیابی کا پابند نہ ہوگا اور وہ نفسانی خواہشات اوراپنی مرضی کے مطابق جوچاہے گا کہے گا اور جو چاہے گا کرے گا۔ اور غلط تصورات اور خرافی افکار میں گرفتار ہوگا اور اس وقت ایک چوپایہ کی طرح اپنی راہ (جو انسانی سرمایہ ہے) سے بھٹک کر، ہوا و ہوس،لا ابالی اور اپنی نادانی کی بھینٹ چڑھ جائیگا۔ خدائے متعال فرماتا ہے: (ارءیت من اتّخذ الٰھہ ہوٰہ افانت تکون علیہ وکیلا * ام تحسب ان اکثر ہم یسمعون او یعقلون اِن ہم الاّ کالانعام بل ہم اضلّ سبیلا[3]) ''کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا ہے جس نے اپنی خواہشات ہی کو اپنا خدا بنا لیا ہے،کیاآپ اس کی بھی ذمہ داری لینے کے لئے تیار ہیں؟کیاآپ کا خیال یہ ہے ان کی اکثریت کچھ سنتی اور سمجھتی ہے؟ ہرگز نہیں یہ سب جانوروں جیسے ہیں بلکہ ان سے بھی کچھ زیادہ گم کردہ راہ ہیں۔'' البتہ جب انسان کی حقیقت پسندانہ فطرت زندہ ہوتی ہے اور حق کی پیروی کرنے کی عادت اس میں کارفرما رہتی ہے، تو یکے بعد دیگرے اس کے لئے حقائق واضح ہوتے چلے جاتے ہیں اور وہ جس حق و حقیقت کو پالے گا اسے دل سے قبول کرے گا اور سعادت و خوشبختی کی راہ میں روزبروز آگے بڑھتا چلاجائے گا۔ خداوند متعال تمام صفات کمالیہ کا مالک ہے کمال کیا ہے؟ایک گھر کو اس وقت کامل گھر کہہ سکتے ہیں،جب ایک گھرانے کی ضروریات زندگی کے تمام چیزیں اس میں موجود ہوں،چنانچہ اس میں مہمان خانہ،باورچی خانہ، غسل خانہ وغیرہ کے لئے کافی کمرے موجود ہوں،جس گھر میں جس قدر یہ وسائل کم ہوں اسی قدر اسے ناقص سمجھا

---

[1] یونس، ٣٢
[2] عصر ،١۔٣
[3] فرقان ،٤٣،٤٤

جائے گا ۔اسی طرح ایک انسان میں اس کی فطری خلقت کے مطابق جن چیزوں کا موجود ہونا ضروری ہے،اگر وہ سب اس میں پائی جاتی ہوں تو وہ کامل ہے،اگر ان میں سے کسی ایک کی کمی ہو،یعنی وہ ہاتھ،پاؤں یا آنکھ سے محروم ہو تو اسی اعتبار سے ناقص سمجھا جائے گا ۔لہذا مذکورہ بیان سے معلوم ہواکہ صفت کمال وہ چیز ہے کہ جو خلقت کی ضرورتوں کوپیدا کرتی ہے اوراس کے نقص کو دور کرتی ہے، علم کی صفت کے مانند کہ جہل کی تاریکی کو دور کر کے عالم کے لئے معلوم کو واضح کردیتا ہے اور ''قدرت''کہ صاحب قدرت شخص کے مقاصد اور اغراض کو ممکن بنادیتی ہے اور اسے ان پر مسلط کر دیتی ہے ایسے ہی دوسرے صفات ہیں جیسے صفت حیات وغیرہ ۔

ہمارا ضمیر فیصلہ کرتا ہے کہ خالق کائنات (جو ہستی عالم اور مخلوقات عالم کا سرچشمہ ہے، ہر فرض کی گئی ضرورت کو پورا کرتا ہے اور ہر نعمت وکمال کو فراہم کرتا ہے) تمام صفات کمال کا مالک ہے، کیونکہ ایک حقیقت پسند نظر کے مطابق یہ تصور نہیں کیا جاسکتا کہ کوئی شخص ایسی نعمت کسی کو بخش دے جوخودنہ رکھتاہویا جس عیب میں وہ خود مبتلا ہو دوسروں سے اس کو دور کرے ۔خدائے متعال اپنے کلام پاک میں اپنے تمام صفات کمال کی ستائش کرتا ہے اور خود کو ہر قسم کے عیب ونقص سے پاک ومنزہ قرار دیتاہے:

(وربک الغنیّ ذوالرّحمۃ[1]) ''تیرا پروردگار بے نیاز اور مہربان ہے''(اللّٰہ لا الہ الاّلہ ہولہ الاسماء الحسنیٰ[2]) ''وہ اللّٰہ ہے جس کے علاوہ کوئی خدا نہیں ہے،اس کے لئے بہترین نام ہیں ۔''وہ زندہ، عالم،دیکھنے والا،سننے والا،قادر،خالق اور بے نیاز ہے ، پس خدائے متعال کوتمام صفات کمال کا مالک اوراس کی ذات اقدس کو ہر صفت نقص سے پاک ومنزہ جاننا چاہئے،کیونکہ اگر اس میں نقص ہوتا تو اسی لحاظ سے نیاز مند ہوتا اور اس اعتبار سے اس سے بالاتر کسی اور خدا کو ہونا چاہئے تھا جو اس کی نیاز مندی کو دور کر سکتا ۔(سبحانہ وتعالیٰ عمّا یشرکون[3]) ''وہ پاک وپاکیزہ ہے اور ان کے شرک سے بلند وبرتر ہے''

---

[1] انعام،١٣٣
[2] طہ،٨
[3] یونس،٥

توحید اور یکتائی

(لوکان فیھما آلھۃ الآ اللّٰہ لفسد تا[1]) ''یاد رکھو اگر زمین وآسمان میں اللہ کے علاوہ اور خدا بھی ہوتے تو زمین و آسمان دونوں بر باد ہو جاتے ۔''

وضاحت

اگر کائنات پر کئی خداؤں کی حکومت ہوتی ،جیسا کہ بت پرست کہتے ہیں کہ کائنات کے ہر شعبہ کاایک الگ خدا ہے ۔زمین وآسمان اور دریا و جنگل کا الگ الگ خدا ہوتا ہے ۔ اگر ایسا ہوتا تو کائنات کی ہر جگہ پر خداؤں کے درمیان اختلاف کی وجہ سے الگ الگ انتظام بر قرار ہوتا اور اس صورت میں کائنات کا کام لامحالہ تباہی وبر بادی سے دوچار ہوتا ،چونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ کائنات کے تمام اجزاء آپس میں ھم آہنگ اور مکمل طور پر موافق ہیں اور سب مل کر ایک نظام کو تشکیل دیتے ہیں ،اس بناپر، کہنا چاہئے کہ خالقِ کائنات ایک سے زیادہ نہیں ہے ۔

یہاں پر یہ تصور نہیں کرنا چاہئے کہ فرض کئے گئے خدا، چونکہ عاقل ہوں گے اور وہ جانتے ہوں گے کہ ان کا اختلاف کائنات کو تباہی وبربادی کی طرف لے جائے گا،لہذا وہ ہر گز آپس میں اختلاف نہیں کریں گے ،کیونکہ اس صورت میں وہ ایک دوسرے کے کام میں مؤثر ہوں گے اور ہر ایک دوسرے کی موافقت اور اجازت کا محتاج ہوگا اور اکیلے ہی کوئی کام انجام نہیں دے سکتا ۔ جب کہ خدائے تعالی کو احتیاج سے منزہ وپاک ہونا چاہئے ۔

خدائے متعال کا وجود،قدرت اور علم

اس وسیع وعریض کائنات کے آپس میں ملے ہوئے اجزاء ،اور اس کی عام اور حیرت انگیز گردش، اور کائنات کے گوشہ وکنار میں جاری، آپس میں مرتبط اور آنکھوں کو خیرہ دینے والے جزئی نظام اور نتیجہ کے طور پر مختلف انواع کے مظاہر اپنے خاص مقصد کی

---

[1] انبیاء ،۲۲

طرف، انتہائی نظم و ترتیب کے ساتھ حرکت میں ہیں یہ نظم ہر عقلمند انساں کے لئے واضح کر دیتا ہے کہ عالم ھستی اور جو کچھ اس میں ہے اپنے وجود وبقا کے لئے ایک لا فانی وجود سے متصل ہیں ،جس نے اپنی لا محدود قدرت و علم سے کائنات اور کائنات میں موجود ہر شئے کو خلق کیا ہے اوراپنی ہر مخلوق کو پرورش کے گہوارہ میں قرار دیا ہے اور اپنی خاص عنایتوں سے ان کے مطلوب کمال کی طرف ابھارتا ہے یہ وہی ہے جس کی ھستی لافانی ہے اور ہر چیز کو جانتاہے اور اس پر قادر ہے،خدائے متعال فرماتا ہے: (لہ ملک السمٰوات والارض یحی ویمیت وہو علی کل شیء قدیر *ہوالاوّل والاٰخر والظّاہر والباطن وہو بکل شی ء علیم[1]) ''آسمان وزمین کا کل اختیار اسی کے پاس ہے اور وہی حیات وموت کا دینے والا ہے اور ہر شے پر اختیار رکھنے والا ہے ۔وہی اول ہے وہی آخر وہی ظاہر ہے وہی باطن اور وہی ہر شے کا جاننے والا ہے ۔''

خدا کی قدرت (وللّٰہ ملک السمٰوات والارض وما بینہما یخلق ما یشآء واللّٰہ علی کل شی ء قدیر[2]) ''اور اللہ ہی کے لئے زمین وآسمان اور ان کے درمیان کی کل حکومت ہے ۔وہ جیسے بھی چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور ہر شے پر قدرت رکھنے والا ہے''

وضاحت

جب ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص موٹر کار خرید نے کی قدرت رکھتا ہے ،تو ہمارا مقصد یہ ہوتا ہے ،کہ جو موٹر کار خرید نے کا محتاج ہے اس کے پاس اس کے خریدنے کی مالی طاقت ہے، اور اگر ہم یہ کہیں کہ فلاں شخص بیس کلو گرام وزنی پتھر اٹھانے کی طاقت رکھتا ہے ،تو ہمارا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس میں بیس کلو گرام پتھراٹھانے کی طاقت موجود ہے ۔ حقیقت میں، کسی چیز پر توانائی و قدرت رکھنے کے یہ معنیٰ ہیں کہ اس کے تمام ضروری وسائل اس کے پاس ہیں،اور چونکہ عالم ھستی میں جس وجود کو بھی فرض کیا جائے ،اس کی

---
[1] حدید، ۲، ۳
[2] مائدہ ، ۱۷

نیاز مندی اور زندگی کی گردش کی ضرورت خدا کے وجود سے پوری ہوتی ہے ،یہ کہنا چاہئے کہ خدائے متعال ہر چیز کی قدرت و توانائی رکھتا ہے اور اسی کی ذات پاک کائنات کا سرچشمہ ہے ۔خدا کا علم (ألا یعلم مَن خلق[1]) ''کیاپیدا کرنے والا نہیں جانتا ہے؟''

وضاحت

چونکہ ہر مخلوق اپنی پیدائش وھستی میں خدائے متعال کی لا محدود ذات کی محتاج ہے،اس لئے اس مخلوق اور خدا کے درمیان پردے اور رکاوٹ کا تصور نہیں کیا جاسکتا ہے یا اس کا خدا سے پوشیدہ ہونا تصور نہیں کیا جاسکتا،بلکہ اس کے لئے ہر چیز آشکار ہے اور ہر چیز کے داخل وخارج پر تسلط اور احاطہ کرتا ہے ۔

خداکی رحمت

جب ہم ایک ناتوان محتاج کو دیکھتے ہیں ،تو اپنی توانائی کے مطابق اس کی ضرورت کو پورا کرتے ہیں ،یاکسی مصیبت زدہ بے چارہ کی مدد کرتے ہیں یاایک نابینا کاہاتھ پکڑ کر اسے اس کی منزل مقصود تک پہنچاتے ہیں ۔ایسے کاموں کو ہم مہربانی اوررحمت شمار کر کے پسندیدہ اور قابل ستائش جانتے ہیں ۔جن کاموں کو کارساز اور بے نیاز خدا انجام دیتا ہے ،وہ رحمت کے علاوہ کچھ نہیں ہو سکتے، کیونکہ وہ اپنی بے شمار نعمتوں کو بخش کر سبھی کو بہرہ مند کرتا ہے اور ہر بخشش سے ۔خود کسی کا نیاز مند ہوئے بغیر ۔مخلوقات کی ضرورتوں کے ایک حصہ کو پورا کرتا ہے چنانچہ فرماتا ہے:(و إن تعدوا نعمت اللّٰہ لا تحصوہا[2]) ''اگرتم اس کی نعمتوں کو شمار کرناچاہوگے تو ہر گز شمار نہیں کر سکتے۔''(ورحمتی وسعت کلّ شی ء[3]) ''اور میری رحمت نے تمام چیزوں کا احاطہ کیا ہے۔تمام صفات کمالیہ (وربّک الغنیّ ذوالرّحمۃ[4]) ''تمہارے پروردگار بے نیاز اور صاحب رحمت ہے''

---

[1] ملک،۱۴
[2] ابرا ھیم ،۳۴
[3] اعراف،۱۵۶
[4] انعام،۱۳۴

وضاحت

کائنات میں موجود ہر خوبی اور زیبائی ،جس کمال کی صفت کے بارے میں تصور کریں ،وہ ایک نعمت ہے جسے خدائے متعال نے اپنی مخلو قات کو عطا کیا ہے اور اس کے ذریعہ خلقت کی ضرورتوں میں سے کسی ایک کوپورا کیا ہے ،البتہ اگر وہ خود اس کمال کا مالک نہ ہوتا ،تو اس کمال کو دوسروں کو بخشنے میں عاجز ہوتا اور خود بھی ضرورتوں میں دوسروں کا شریک بن جاتا پس خداوند عالم کے تمام صفات کمال خود اسی کے ہیں اور اس نے کوئی کمال کسی دوسرے سے حاصل نہیں کیا ہے اور اس نے کسی کے سامنے دست نیاز دراز نہیں کیا ہے،بلکہ خود تمام صفات کمال ،جیسے:حیات، علم ،قدرت وغیرہ کا مالک ہے اور تمام صفات عیب اور نیاز مندی واحتیاج کے اسباب جیسے:ناتوانی ،نادانی ،موت،گرفتاری وغیرہ سے پاک ومنزہ ہے ۔

۲۔نبوت

انسان کوپیغمبر کی ضرورت

خدائے متعال نے اپنی کامل قدرت سے جو کہ ہر اعتبار سے بے نیاز ہے کائنات اور کائنات میں گوناگوں مخلو قات کو خلق کیا اور انھیں بیشمار نعمتوں سے نوازا ہے ۔انسان اور تمام دوسری جان دار وغیر جان دار مخلو قا ت کی پرورش پیدائش کے دن سے لیکر کائنات کے آخری دن تک ،خدا ہی کرتا ہے ،اور ان میں سے ہر ایک ،خاص نظم و نسق اور خاص تربیت سے ایک معلوم و معین مقصد کی طرف ہدایت پاتے ہیں اور اسی کی طرف بڑ ھتے ہیں جبکہ تمام لمحات میں وہ اپنی شایان شان عنایتوں سے نوازے جاتے ہیں ۔اگر ہم صرف اپنی زندگی کے بارے میں غور وخوض کریں ،یعنی شیر خوارگی ،بچپن ،جوانی اور بوڑھاپے کے دورپر نظر ڈالیں ،تو خدائے متعال کا وہ کامل لطف و کرم جو ہمارے شامل حال ہے، کے بارے میں ہمارا ضمیر گواہی دے گا ،اور جب یہ مسئلہ ہمارے لئے واضح ہو جائے گا تو یقیناً ہماری عقل فیصلہ دے گی کہ خالق کائنات ،اپنی مخلوق کے لئے سب سے زیادہ مہر بان ہے ۔اسی مہربانی کی وجہ سے ہمیشہ ان کے حالات کے مطابق مصلحت کی رعایت کرتا ہے اور حکمت و مصلحت کے بغیر ہر گز ان کے فساد

وتباہی کے کاموں سے راضی نہیں ہوتا ۔انسان،خدا کی ایک ایسی مخلوق ہے ۔کہ جس کی فلاح و بہبود اور سعادت اس میں ہے کہ حقیقت پسنداور نیک منش ہو یعنی اس میں صحیح عقائد پسندیدہ اخلاق اور نیک کردار ہونا چاہئے۔

ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ انسان اپنی خدا داد عقل سے اچھے اور برے کو پہچان سکتا ہے اور چاہ کو راہ سے تشخیص دے سکتا ہے ،لیکن یہ جاننا چاہئے کہ عقل اکیلے ہی اس گرہ کو کھول کر انسان کی حقیقت پسندی اور نیکی کی طرف رہنمائی نہیں کر سکتی ،کیونکہ انسانی معاشرے میں جو مشاہدہ کیا جارہا ہے وہ یہ ہے کہ زیادہ تر برائیاں ان لوگوں سے انجام پارہے ہیں ،جو عقل و شعور اور برے بھلے کی تمیز رکھتے ہیں ،لیکن خود پرستی ،منافع پرستی اور ہوس رانی کے نتیجہ میں ان کی عقل اس کے جذبات اور ہوا وہوس کی تابع ہو کر گمراہی سے دوچار ہوتی ہے ۔لہذا خدائے متعال کوایک دوسرے راستہ سے یا ایک ایسے وسیلہ سے سعادت کی طرف ہماری راہنمائی کرنا چاہئے جو کبھی ہوا وہوس سے مغلوب نہ ہواور اپنی رہبری میں کبھی اشتباہ و غلطی کا شکار نہ ہو،ایسا راستہ صرف نبوت کا ہے۔

انبیاء کی تبلیغ

ہماری عقل جو فیصلہ کرتی ہے اوراس کے مطابق حکم دیتی ہے کہ انسان کے لئے ''نبوت'' کے نام کا ایک راستہ کھلا ہونا چاہئے ۔ یہ چیز عملاً بھی مورد تاکید قرار پاکر انجام پایا ہے۔ انسانوں میں سے (انبیاء)نامی کا ایک گروہ خدائے متعال کی طرف سے منتخب ہوا ہے ۔ جنھوں نے لوگوں کی ہدایت کے لئے اعتقادی کچھ عملی قوانین وضوابط پیش کئے اور ان کو صحیح راستے پر چلنے کی دعوت دی ہے ان پیغمبروں نے اپنے دعوی کے صحیح ہونے اوراپنے دین کے سچے ہونے کو معقول طریقوں سے لوگوں کے لئے ثابت کیا ،اور اپنے تربیتی مکتب میں کچھ شائستہ افراد کی پرورش کی ۔ عقل معاش،جسے ہم عقل علمی بھی کہتے ہیں (وہ شعور جس سے ہم اپنی زندگی کو چلاتے ہیں)ہمیشہ اجازت دیتی ہے کہ ہم اپنی زندگی کے فائدے کے لئے ہر قابل استفادہ چیز سے استفادہ کریں جیسے:فضا،ہوا،درختوں،ان کے پھل پتوں اور لکڑیوں حیوانات،ان کے گوشت،دودھ ،اون اورکھال سے استفادہ کریں ۔اسی طرح ہم اپنی بے شمار ضرورتوں کے پیش نظر اپنے ہم نوع انسانوں کی سرگرمیوں سے بھی اپنے نفع میں استفادہ کرتے ہیں ۔ان چیزوں کے

مصرف اور استفادہ کا حکم ہمیں ہماری عقل و شعور نے دیا ہے اور اسی نے ان کے جائز ہونے کی تصدیق کی ہے ،اس لئے ہے کہ اگر کوئی ہم سے پوچھے کہ بھوک کے وقت تم کیوں کھانا کھاتے ہو ؟پیاس کے وقت کیوں پانی پیتے ہو؟یا ہوا میں کیوں سانس لیتے ہو؟تو اس کے یہ سوالات مضحکہ خیز ہوں گے ۔لیکن جب ہم اپنے ہم نوع انسان کے کام وکوشش سے استفادہ کرنے کے لئے ان سے پہلی بار رابطہ بر قرار کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی ہماری طرح ہیں جس طرح ہم ان کی سرگرمیوں کے نتیجہ سے استفادہ کرنا چاہتے ہیں ،اسی طرح وہ بھی ہماری سرگرمیوں کے نتیجہ سے استفادہ کرنا چاہتے ہیں ۔کیونکہ ہم اپنی سرگرمیوں کے نتیجہ کو انھیں مفت میں دینے کے لئے تیار نہیں ہیں لہذا ان کے پاس بھی جو کچھ ہے وہ اسے مفت میں دینے کے لئے تیار نہیں ہیں ۔یہی وجہ ہے کہ ہم اجتماعی طور پر ایک دوسرے کا تعاون کرنے پر مجبور ہوتے ہیں اور اپنے ہم نوع انسان کی زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرنے میں ان کی مدد کرتے ہیں تاکہ اس کے مقابلہ میں وہ بھی ہماری مدد کریں ۔

اسی احتیاج وضرورت کے پیش نظر،مختلف انسان آپس میں جمع ہو گئے اور ایک دوسرے کی مدد اور کام سے استفادہ کرتے ہیں ،حقیقت میں مختلف افراد کے کام اور ان کی کوششیں ایک دوسرے پر بٹ جاتی ہیں ،اور اس کے بعد ہر ایک اپنی حیثیت اور اجتماعی سرگرمی کے مطابق اس سے استفادہ کرتا ہے ۔

معاشرے میں قوانین و قواعد کی ضرورت

جیسا کہ بیان کیا جاچکا کہ انسان مجبور ہوکر اجتماعی تعاون پرآمادہ ہوتا ہے ورنہ فطری طور پر وہ صرف اپنی زندگی کے نفع کا خواہان ہے ،لہذا جب بھی اسے موقع ملتا ہے وہ دوسروں کے منافع پر تجاوز کرتا ہے جبکہ اس نے اپنے منافع سے کوئی چیز دوسروں کو انہیں دی ہے کہ تعادل بر قرار رہے ۔اسی لئے ہر معاشرے میں کچھ قوانین ومقررات کا ہونا ضروری ہے تاکہ ان کی رعایت کرنے سے ،انسان کی اجتماعی قدر وقیمت محفوظ رہے،اور ان کو تجاوز کرنے سے روکا جا سکے۔ قوانین وضوابط کو لوگوں کے اتفاق نظر یا ان کی اکثریت کی رائے سے منظور کیا جانا چاہئے تاکہ ہر فرد اپنے انفرادی واجتماعی فرائض سے آگاہ ہو جائے۔ قواعد وضوابط کی تکوینی بنیاد

قوانین وضوابط ایسے فرائض ہیں جو انسانی زندگی کی مصلحتوں کی حفاظت کے لئے وضع ہوئے ہیں ۔اس لحاظ سے ان کی قدر وقیمت اجتماعی ہے نہ فطری وتکوینی ۔یعنی فطرت میں حکم فرما قوانین کا خود بخود کوئی اثر نہیں ہے ،بلکہ جب معاشرے کے لوگ انھیں جاری کرتے ہیں تو یہ جاری ہوتے ہیں ورنہ یہ ایک بے اثر افسانہ کے علاوہ کچھ نہیں ہوتے۔اس کے باوجود یہ قوانین وضوابط ،فطرت وتکوین سے بے ربط بھی نہیں ہیں،بلکہ ان میں تکوین کی اصل موجود ہے ۔ فطرت اورانسان کی فطری ضرورت ان کا سرچشمہ ہے یعنی خدائے متعال نے انسان کی خلقت کچھ اس طرح کی ہے کہ خواہ نخواہ اجتماعی افکار کے ایک سلسلہ کو وجود میں لاکر انھیں قابل استفادہ قرار دیتا ہے اور اپنی تکوینی زندگی کو ان پر تطبیق کرتا ہے اور اپنے وجودی مقاصد تک پہنچتا ہے۔

زندگی کے قوانین کی طرف تکوینی ہدایت

ہم جانتے ہیں کہ خدائے متعال اپنی عنایت کاملہ اور بے پناہ محبت کی بدولت اپنی ہر مخلوق کواس کے وجودی مقصد تک پہنچاتا ہے اور انسان بھی اس قانون سے مستثنیٰ نہیں ہے پس خدائے متعال کے لئے ضروری ہے کہ انسان کے لئے کچھ ایسے قوانین وضوابط وضع کرے جو اس کی زندگی کی راہ ورسم کو تشکیل دے اور ان پر عمل کے ذریعہ انسان کی مصلحتیں اور منافع پورے ہو سکیں اوران کو حاصل کرنے کے لئے صرف عقل کافی نہیں ہے ۔کیونکہ کبھی خود عقل بھی درک کرنے میں خطا کرتی ہے اور اکثر اوقات عقل عادت،تقلید اور وراثت میں ملی صفات سے متاثر ہوکر ہواوہوس سے مغلوب ہو کر انسان کو ہلاکت کی طرف لے جاتی ہے ۔جیسا کہ ہم جان چکے کہ،عقل انسان کو منافع طلبی کے قانون کی طرف رہنمائی کرتی ہے ،اور اگر انسان کبھی دوسروں کے لئے حق کا قائل ہوتا ہے اور عام قانون کی پیروی کرتا ہے،تو وہ بنابر مجبوری اور اپنے شخصی منافع کو حاصل کرنے کے لئے ہوتا ہے ،اسی وجہ سے اکثر لوگ جب قدرت و توانائی کے عروج پر پہنچتے ہیں تو اپنے مقابلہ میں کسی حریف اور مخالف کو کچھ نہیں سمجھتے ،ہر قانون وحکم کی سرکشی کرتے ہیں اور دوسروں کے منافع کو اپنے لئے مخصوص کراتے ہیں اور ان کے حقوق کو پامال کرتے ہیں ۔

لہذا خدائے متعال کو چاہئے کہ لوگوں کو ان کی زندگی کی راہ و رسم کے بارے میں ایک ایسے طریقہ سے راہنمائی کرے،جو ہر قسم کی خطاو لغزش سے محفوظ ہو اور وہ طریقہ (نبوت)ہے،اور وہ یہ ہے کہ خدائے متعال اپنے بعض بندوں کو راہ فکر و عقل کے علاوہ ایک اور راہ (راہ وحی)سے معارف و احکام کے ایک سلسلہ کی تعلیم دے تا کہ ان پر عمل کے ذریعہ لوگوں کی حقیقی سعادت کی طرف رہنمائی کر سکے۔

نتیجہ

مذکورہ بیان سے معلوم ہوا کہ خدائے متعال کو چاہئے کہ اپنے بعض بندوں کو غیبی تعلیم کے قوانین سے آگاہ کر کے بھیجے جو انسانی سعادت کے ضامن ہیں ۔خدا کے پیغام لانے والے انسان کو پیغمبر یا خدا کا رسول کہتے ہیں ،اور خدا کی طرف سے لائے گئے پیغامات کے مجموعہ کو ''دین '' کہتے ہیں ۔یہ بھی معلوم ہواکہ خداکی طرف سے بھیجے گئے دینی معارف اور الٰہی قوانین کو صحیح طور پر تبدیلی،اور کمی بیشی کے بغیر لوگوں کے پاس پہنچنا چاہئے ۔یعنی خدا کا پیغمبر وحی الٰہی کو حاصل کرنے میں خطا نہ کرے اور اس کی حفاظت میں بھول چوک اور لغزش سے دو چار نہ ہو اور اس کو لوگوں تک پہنچانے میں غلطی یا خیانت نہ کرے۔

جیساکہ ہم نے بیان کیا کہ ضروری معارف اورزندگی کے قوانین کی طرف لوگوں کی ہدایت نظام خلقت کا جزو ہے اور یہ انسان کی تخلیق کا ایک مقصد ہے۔خلقت اپنی راہ کو طے کرنے میں ہر گز خطا اور لغزش کو قبول نہیں کرتی ،مثال کے طور پر یہ ممکن نہیں ہے کہ نظام خلقت ،انسان کے تناسل سے ایک پتھر یا پودے کو وجود میں لائے یا گیہوں کے دانہ کو بونے کے بعد ایک حیوان پیدا ہو یا انسان کی آنکھ موجودہ حالت میں معدہ کا کام انجام دے یا کان دل کا کام انجام دے۔ اس چیز سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے انبیاء کو معصوم ہونا چاہئے ۔یعنی جس کام کو وہ خود واجب جانتے ہوں اسے ترک نہ کریں اور جس کام کو وہ خود گناہ جانتے ہوں انہیں انجام نہ دیں، کیونکہ ہم (انسان)اپنے ضمیر سے جانتے ہیں کہ جو اپنی بات پر عمل نہ کرے، حقیقت میں وہ اس بات کے صحیح اور سچ ہونے کا قائل نہیں ہے ۔اس صورت میں اگر پیغمبر گناہ کا مرتکب ہو جائے ،تو کوئی اس کی بات پر یقین نہیں کرے گا اور تبلیغ کا

مسئلہ بے اثر ہوگا اور اگر بعد میں توبہ اور اظہار ندامت بھی کرتا ہے تو بھی ہمارا دل اس کی طرف سے صاف نہیں ہوگا اور ہر حالت میں تبلیغ کا مقصد فوت پر جائے گا ۔خدائے متعال فرماتا ہے: (عالم الغیب فلا یظھر علی غیبہ احداً *الاّ من ارتضی من رسول فانّہ یسلک من بین یدیہ و من خلفہ رصداً * لیعلم ان قد ابلغوا رسٰلت ربھم[1]) ''وہ عالم الغیب ہے اور اپنے غیب پر کسی کو بھی مطلع نہیں کرتا ۔

مگر جس رسول کو پسند کرلے تو اس کے آگے پیچھے نگہبان فرشتے مقرر کر دیتا ہے تاکہ وہ دیکھ لے کہ انہوں نے اپنے رب کے پیغامات کو پہنچا دیا ہے ۔ ''انسان اور دوسری مخلوقات کی ہدایت میں فرق توحید کی بحثوں سے واضح ہوتا ہے کہ اشیاء کی تخلیق خدا کی طرف سے ہے ،لہذا ان کی پرورش بھی اسی سے مربوط ہے ۔واضح الفاظ میں یہ کہا جائے کہ کائنات کی ہر مخلوق ،اپنی پیدائش کے آغاز سے اپنی بقااور نقائص کو دور کرنے میں سرگرم عمل ہوتی ہے اورا اپنی کمیوں وضرورتوں کو یکے بعد دیگر رفع کرتی ہے اور امکان کی حد تک اپنے آپ کو کامل اور بے نیاز کرتی ہے ۔

اپنی بقا کے سفر میں ایک منظم حرکت کے تحت اپنے وجود کو جاری رکھتی ہے ،اس سفر کو منظم کرنے والا اور ہر منزل پر اسکا رہبر خدائے متعال ہے ۔اس نظریہ کے مطابق ایک قطعی نتیجہ نکلتا ہے اور وہ یہ ہے کہ کائنات کی ہر قسم کی مخلوق ایک خاص تکوینی پرو گرام کے تحت باقی ہے اور اس میں اپنی خاص سرگرمی ہوتی ہے ۔ دوسرے الفاظ میں ،کائنات کے مظاہر میں سے ہر معیّن گروہ کے لئے ،اپنی بقا کے سفر میں کچھ معیّن فرائض ہیں جو خدائے متعال کی طرف سے انھیں عطا ہوتے ہیں ۔ چنانچہ قرآن مجید اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: (ربّنا الذّی أعطی کلّ شیءٍ خلقہ ثمّ ہدی[2])... ''ہمارارب وہ ہے جس نے ہرشے کو اس کی مناسب خلقت عطا کی ہے اور پھر ہدایت بھی دی ہے'' خلقت کے تمام اجزااس کلی حکم میں شامل ہیں اور ان میں سے ہر گز کوئی مستثنیٰ نہیں ہے آسمان کے ستارے اور ہمارے پیروں تلے زمین اور ان میں موجود عناصر اور ابتدائی مظاہر کو ظاہر کرنے

---

[1] جن ،۲۸،۲۶
[2] طہ،۵۰

والی ترکیبیں اور نباتات و حیوانات، سبھی کی یہی حالت ہے ۔ اس عام ہدایت میں انسان کی حالت بھی دوسری مخلوقات کے مانند ہے، سوائے یہ کہ انسان اور دوسری مخلوقات کے درمیان ایک فرق ہے۔

انسان اور دوسری مخلوقات میں فرق

مثال کے طور پر کرۂ زمین کو لاکھوں سال پہلے خلق کیا گیا ہے ،جو اپنی تمام پوشیدہ توانائیوں کو استعمال میں لاکر اپنے دائرہ حدود میں جب تک مخالف عوامل مانع نہیں ہوتے اس وقت تک سرگرم عمل ہے اور اپنی وضعی و انتقالی حرکت کے نتیجہ میں اپنے وجودی آثار کو ظاہر کرتا ہے اور اس طرح اپنی بقا کی ضمانت حاصل کرتا ہے اور جب تک کوئی اس سے قوی مخالف عامل رکاوٹ نہ بنے ،اسی سرگرمی کو جاری رکھے گا ،اور اپنے فرائض کو نبھانے میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کرے گا ۔بادام کا درخت گٹھلی سے باہر آنے کے وقت سے کامل درخت کی صورت اختیار کرنے تک،تغذیہ ،رشد و نمو وغیرہ میں،دوسرے الفاظ میں اپنے تکامل کے سفر کی راہ میں کچھ فرائض انجام دیتا ہے کہ اگر کوئی قوی تر مخالف عامل رکاوٹ نہ بنے تواپنے فرائض کو انجام دینے میں ہرگز کوتاہی نہیں کریگا اور کوئی کوتاہی کر بھی نہیں سکتا ۔ ہر دوسری مخلوق کی بھی یہی حالت ہے ۔

لیکن انسان ،اپنی خصوصی سرگرمیوں کو اپنے اختیار سے انجام دیتا ہے اور جو کام انجام دیتا ہے ،اس کا سرچشمہ اس کی فکر اور اس کا فیصلہ ہوتا ہے ۔ ممکن ہے انسان کبھی ایک ایسے کام کو انجام دینے سے پہلو تہی کرے ،جو سو فیصدی اس کے نفع میں ہوا ور کوئی مخالف عامل بھی رکاوٹ نہ بنے اور اس کے مقابلہ میں ایک ایسے کام کو جان بوجھ کر انجام دے جس میں سوفیصدی ضرر اور نقصان ہو ،مثلاً کبھی دوائی کھانے سے پرہیز کرتا ہے اور کبھی جام زہر نوش کرکے خودکشی کرتا ہے ۔

البتہ واضح ہے کہ جو مخلوق مختار پیدا کی گئی ہے ہو،عام ہدایت اس کے لئے جبری نہیں ہوگی۔یعنی انبیاء ،خیر و شر اور سعادت و بدبختی کی راہ کو خدائے متعال کی طرف سے لوگوں کو بیان کرتے ہیں اور دین کے پیرؤں کو ثواب کا مژدہ سناکر پروردگار کی رحمت سے امیدوار بناتے ہیں سرکشوں اورباغیوں کو خدا کے عذاب سے ڈراتے ہیں اور وہ ان میں سے ہر ایک کو اختیار کرنے میں آزاد و مختار ہوں گے ۔ صحیح ہے کہ انسان اپنے خیر و شر اور نفع ونقصان کو اجمالا عقل سے سمجھتا ہے۔ لیکن یہی عقل، اکثر اوقات اپنے

کو گم کر کے نفسانی خواہشات کی پیروی کرتی ہے ،اور کبھی غلط راستہ پر چلتی ہے لہذا خدا کی ہدایت عقل کے علاوہ کسی اور راستہ سے بھی انجام پانی چاہئے اور وہ اس راستہ کو خطا ولغزش سے بالکل محفوظ ہونا چاہئے ۔یا دوسرے الفاظ میں خدائے متعال اپنے احکام کواجمالی طور پر عقل سے لوگوں کو سمجھاتا،اور ایک دوسرے راستہ سے اس کی تصدیق فرماتا ۔

یہ راستہ،وہی ''نبوت''کا راستہ ہے کہ خدائے متعال اپنے سعادت بخش احکام کو وحی کے ذریعہ اپنے بندوں میں سے کسی ایک کو سمجھاتا ہے اور اسے مامور کرتا ہے کہ انھیں لوگوں تک پہنچائے اور انھیں امید و خوف کے ذریعہ شوق دلاکراور ڈراکر ان احکام پر عمل کرنے کے لئے مجبور کرے ۔خدائے متعال اپنے کلام پاک میں فرماتا ہے:(انا أوحینا إلیک کما أوحینا الی نوح و النّبیّن من بعدہ رسلاً مبشّرین ومنذرین لئلایکون للناس علی اللّٰہ حجۃ بعد الرّسل[1])''ہم نے آپ کی طرف اسی طرح وحی نازل کی ہے جس طرح نوح اور ان کے بعد کے انبیاء کی طرف وحی کی تھی ...یہ سارے رسول بشارت دینے والے اورڈرانے والے اس لئے بھیجے گئے تاکہ رسولوں کے آنے کے بعد انسانوں کی حجت خداپر قایم نہ ہونے پائے''

پیغمبر کی صفات

مذکورہ بیان سے واضح ہواکہ پیغمبر میں حسب ذیل صفات ہونی چاہئیں: ١۔اپنے فریضہ کو انجام دینے میں خطاسے محفوظ اور معصوم ہونا چاہئےاور ہر طرح کی فراموشی اور دوسری ذہنی آفتوں سے بھی محفوظ ہونا چاہئے تاکہ جو چیز اس پر وحی ہوتی ہے اس کو صحیح طورپر حاصل کر کے ،کسی لغزش وغلطی کے بغیر لوگوں تک پہنچا دے ،کیونکہ اگر ایسا نہ کیا تو الٰہی ہدایت اپنے مقصدتک نہیں پہنچ سکتی اور عام ہدایت کا قانون اپنی کلی حیثیت کو کھو کر انسان پر اثر انداز نہیں ہوسکتاہے۔

٢۔پیغمبر کو اپنے کردار وگفتار میں لغزش اور گناہ سے محفوظ ہونا چاہئے چونکہ گناہ کی صورت میں تبلیغ موثّر واقع نہیں ہوتی،جس کے قول وفعل میں اختلاف ہو،لوگ اس کے قول کو قابل قدر نہیں جانتے حتی اس کے کردار کو بھی جھوٹ کی دلیل سمجھ کر کہتے ہیں: (اگروہ

[1] نساء،۱۶۳،۱۶۵

سچ کہتا تووہ اپنی بات پر عمل کرتا)ان دو مطالب کو ایک عبارت میں جمع کیا جاسکتا ہے : تبلیغ کے صحیح و موئثر واقع ہونے کے لئے پیغمبر کا خطا اور معصیت سے معصوم ہونا ضروری ہے ،جیسا کہ قرآن مجید کی دلیل بھی بیان کی گئی[1] ۔

۳۔پیغمبر کواخلاقی فضائل کا مالک ہونا چاہئے،جیسے:عفت،شجاعت،عدالت وغیرہ کیونکہ یہ سب پسندیدہ صفات شمار ہوتی ہیں اور جو ہر قسم کی معصیت سے محفوظ ہو اور دین کی مکمل طور پر اطاعت کرتا ہو اس کا دامن کبھی اخلاقی ،برائیوں سے داغدار نہیں ہو سکتا ۔

انبیاء،انسانوں کے درمیان

تاریخ کی رو سے مسلّم ہے کہ لوگوں کے درمیان کچھ پیغمبر تھے جنھوں نے دعوت کے ذریعہ انقلاب برپا کیا ہے ،لیکن پھر بھی ان کی زندگی کے بارے میں تاریخ زیادہ واضح نہیں ہے ۔صرف حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کی تاریخ میں کسی طرح کا ابہام نہیں ہے ۔اور قرآن مجید،جو آنحضرتکی آسمانی کتاب ہے اور اس میں آپکے دین کے عالی مقاصد درج ہیں ،گزشتہ انبیاء کی دعوت کے موضوع کو بھی واضح کرتا ہے اور ان کے مقاصد کو بھی بیان کرتاہے ۔قرآن مجید بیان کرتا ہے کہ خدائے متعال کی طرف سے بہت سے انبیاء ر لوگوں کی طرف آئے ہیں اور انہوں نے متفقہ طور پر توحید اور دین کی دعوت کی ہے،چنانچہ فرماتاہے: (وماارسلنا من قبلک من رّسول الاّنوحی الیہ انّہ لاالہ الاّ انا فاعبدون[2]'') اور ہم نے آپ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر یہ کہ اس کی طرف وحی کرتے رہے کہ میرے علاوہ کوئی خدا نہیں ہے ،لہذا سب لوگ میری ہی عبادت کرو ۔''

صاحب شریعت انبیاء

قرآن مجید بیان فرماتا ہے کہ خدا کے سارے نبی آسمانی کتاب کے حامل نہیں تھے اور نہ ہی مستقل شریعت لے کر آئے تھے ۔خدائے متعال فرماتا ہے:(شرع لکم من الدین ماوصّی بہ نوحاً والذّی أوحینا الیک وما وصّینا بہ ابرھیم و موسٰی وعیسٰی[3]) ''اس نے

---

[1] جن۲۶،۲۸۔
[2] انبیاء،۲۵
[3] شوریٰ ،۱۳

تمھارے لئے دین میں وہ راستہ مقرر کیا ہے جس کی نصیحت نوح کوکی ہے اور جس کی وحی پیغمبر!تمھاری طرف بھی کی ہے اور جس کی نصیحت ابراہیم ،موسی اور عیسی کو بھی کی ہے''... اس بنا پر بڑے انبیاء میں سے پانچ نبی جو صاحب شریعت اور آسمانی کتابوں کے حامل تھے،حسب ذیل ہیں: ۱۔ حضرت نوح علیہ السلام

۲۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام

۳۔ حضرت موسی (کلیم)علیہ السلام

۴۔ حضرت عیسی (مسیح)علیہ السلام

۵۔ حضرت محمد مصطفے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

ان انبیاء میں سے ہر ایک کی شریعت اپنے گزشتہ نبی کی شریعت کو مکمل کرنے والی تھی ۔

اولوالعزم پیغمبر اور دوسرے انبیاء

ہم یہ بیان کر چکے کہ جو پیغمبر آسمانی کتاب اور مستقل شریعت لے کر آئے تھے وہ پانچ ہیں لیکن خدا کے رسول صرف یہی پانچ افراد نہیں تھے بلکہ ہر امت کا ایک نبی تھا اور خدا کی طرف سے لوگوں کے لئے بہت سے انبیاء بھیجے گئے ہیں ،کہ ان سے میں صرف بیس افراد کا نام قرآن مجید میں موجود ہے ،چنانچہ خدائے متعال فرماتا ہے: (منھم من قصصنا علیک و منھم من لم نقصص لیک[1])...''جن میں سے بعض کا تذکرہ آپ سے کیا ہے اور بعض کا تذکرہ بھی نہیں کیا ہے'' (ولکلّ امۃٍ رسول[2])''اور ہر امت کے لئے ،ایک رسول ہے۔''(ولکلّ قومٍ ہاد[3]) (''اور ہر قوم کے لئے ایک ہدایت کرنے والا ہے''...جی ہاں،اولوا العزم پیغمبروں میں سے

[1] غافر،۷۸
[2] یونس،۴۷
[3] رعد،۷

ہر ایک کے بعد جتنے بھی پیغمبر آئے ہیں ،انہوں نے انسانوں کو انہی پیغمبروں کی شریعت کی طرف دعوت دی ہے اور اس طرح بعثت ودعوت کا سلسلہ جاری رہا ،یہاں تک کہ خدائے متعال نے پیغمبر اکرم حضرت محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو گزشتہ پیغمبروں کے سلسلہ کو ختم کرنے اور آخری احکام وکامل ترین دینی ضوابط کو پہنچانے کے لئے مبعوث فرمایا اور آپکی آسمانی کتاب کو آخری آسمانی کتاب قرار دیا نتیجہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم کا دین قیامت تک جاری رہے گا اور آپکی شریعت ہمیشہ کے لئے زندہ رہے گی۔

ا۔ حضرت نوح علیہ السلام: سب سے پہلے پیغمبر جسے خدائے متعال نے شریعت اور آسمانی کتاب کے ساتھ عالم بشریت میں بھیجا، حضرت نوح علیہ السلام تھے۔ حضرت نوح علیہ السلام لوگوں کو توحید یکتا پرستی کی ترغیب اور شرک وبت پرستی سے پرہیز کرنے کی دعوت دیتے تھے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ان کے قصوں سے واضح ہے کہ طبقاتی اختلافات کو ختم کرنے اور ظلم وستم کو جڑ سے اکھاڑنے کے لئے آپ سخت جہاد ومبارزہ کرتے تھے اور استدلال کے زریعہ جو اس زمانہ کے لوگوں کے لئے نیا تھا ،اپنی تعلیمات پہنچاتے تھے ۔آپ نے ایک طولانی مدت تک جاہل ،ضدی اور سرکش لوگوں سے دست بگریبان ہونے کے بعد ایک چھوٹے گروہ کی ہدایت کی اور خدائے متعال نے ایک طوفان کے ذریعہ کفار کو ہلاک کرکے زمین کو ان کے ناپاک وجود سے پاک فرمایا ۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے کچھ پیروؤں کے ساتھ نجات پانے کے بعد دنیا میں ایک نئے دینی معاشرہ کی بنیاد ڈالی۔ یہ معزز پیغمبر ،شریعت توحید کے بانی اور خدا کے پہلے کچھ مور ہیں ،کہ جنہوں نے ظلم وستم اور سرکشی کا مقابلہ کیا اور دین حق وحقیقت کی عظیم خدمت کی لہذا خدائے متعال کی طرف سے خاص درود وسلام کے مستحق قرار پائے اور رہتی دنیا تک زندہ وپائندہ رہیں گے: (سلٰم علی نوح فی العٰلمین[1]) ''ساری خدائی میں نوح پر ہمارا سلام''

[1] صافات۷۹

۲۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام: حضرت نوح علیہ السلام کے بعد ایک طویل عرصہ گزر چکا تھا ۔اور اس عرصہ میں اگر چہ بہت سے انبیاء جیسے حضرت ہود علیہ السلام ،حضرت صالح علیہ السلام اوران کے علاوہ دوسرے انبیاء لوگوں کی خدائے متعال اور حق کی طرف رہنمائی فرماتے رہے ،لیکن پھر بھی دن بدن شرک وبت پرستی کا بازار گرم ہوتا جارہا تھا ،یہاں تک کہ تمام عالم میں بت پرستی پھیل گئی اورخدائے متعال نے اپنی حکمت سے حضرت ابراھیم علیہ السلام کو مبعوث فرمایا ۔حضرت ابراہیم علیہ السلام فطری انسان کے ایک کامل نمونہ تھے ۔آپؑ نے پاک وبے آلائش فطرت سے حقیقت کے لئے جستجو کرکے خالق کائنات کی وحدانیت کو پایا اور اپنی زندگی کے آخری لمحات تک شرک و ظلم سے لڑتے رہے ۔ جیسا کہ قرآن مجید سے ثابت ہے اور اہل بیت کی روایتیں بھی دلالت کرتی ہیں،کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بچپن شہر کے شوروغل سے دور ایک غار میں گزرا ۔آپؑ کی ملاقات صرف کبھی کبھی اپنی والدہ سے اس وقت ہوتی تھی جب وہ آپؑ کے لئے کھانا پانی لے کر آتی تھیں ۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک دن اپنی والدہ کے ساتھ غار سے باہر نکلے اور شہر تشریف لائے ۔اور اپنے چچا آزر کے پاس گئے ،وہ جو چیز بھی دیکھتے تھے وہ ان کے لئے نئی اور حیرت انگیز ہوتی تھی ۔ان کی پاکیزہ فطرت ہزاروں حیرت وتعجب کے عالم میں بڑی بے چینی وبے تابی کے ساتھ ان چیزوں کی خلقت کی طرف متوجہ تھی جن کا وہ مشاہدہ کرتے تھے اور وہ ان کی تخلیق کے اسرار تک پہنچنے کی جستجو میں تھے،جب انھوں نے ان بتوں کو دیکھا کہ جنھیں آزر اور دوسرے لوگوں نے تراشا تھا اوروہ ان کی پرستش کرتے تھے ۔ تو انکی حقیقت کے بارے میں سوال کیا لیکن ان بتوں کے رب ہونے کے بارے میں جو وضاحت کی جاتی تھی وہ اس سے مطمئن نہیں ہوتے تھے ۔ جب حضرت ابراہیم نے کچھ لوگوں کو ستارۂ زہرہ ،کچھ لوگوں کو چاند اور کچھ لوگوں کو سورج کی پوجا کرتے ہوئے پایا ،جو کہ ایک مدت کے بعد ڈوب جاتے تھے،تو آپؑ نے ان کے رب ہونے کو قبول نہ کیا ۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کے بعد خدائے واحد کی پرستش اور شرک سے اپنی بیزاری کا لوگوں میں بلا خوف اعلان کر دیا اور اب وہ بت پرستی اور شرک سے مقابلہ کرنے کے علاوہ کسی اور چیز کے بارے میں نہیں سوچتے تھے ۔بت پرستوں کے ساتھ

انتھک مقابلہ کرتے اور ان کو توحید کی طرف دعوت دیتے تھے۔آخر کار ایک بت خانہ میں داخل ہوئے اور بتوں کا توڑنا ان لوگوں میں سب سے بڑا جرم شمار ہوتا تھا آپ کے خلاف مقدمہ دائر کیا گیا ۔مقدمہ کی سماعت کے بعد آپؑ کو آگ میں جلانے کی سزا سنادی گئی،کاروائی مکمل کرنے کے بعد آپؑ کو آگ میں ڈال دیا گیا ،لیکن خدائے متعال نے آپؑ کی حفاظت فرمائی اور آپؑ آگ سے صحیح وسالم باہر نکل آئے ۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کچھ مدت کے بعد اپنی جائے پیدائش ملک بابل سے سر زمین شام اور فلسطین کی طرف ہجرت کی اور اس علاقہ میں اپنی دعوت کو جاری رکھا ۔

زندگی کے آخری ایام میں خدائے متعال نے آپؑ کو دوفرزند عطا کئے۔ان میں سے ایک حضرت اسحاقؑ تھے جو اسرائیل کے والد اور دوسرے اسماعیلؑ تھے جو مصری عرب کے باپ ہیں ۔ حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسماعیلؑ کو شیر خواری کے ایام میں ہی خدا کے حکم سے ان کی والدہ کے ہمراہ حجاز لے جاکر تہامہ کے پہاڑوں کے بیچ میں ایک بے آب وگیاہ اور باشندوں سے خالی سر زمین میں چھوڑ دیا ،اس طرح صحرا نشین عربوں کو توحید کی دعوت دی۔اس کے بعد خانہ کعبہ کی سنگ بنیاد ڈالی اور اعمال حج انجام دینے کا تشرع فرمایا کہ اسلام کے ظہور اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت تک یہ عمل عربوں میں رائج تھا ۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام قرآن مجید کی نص کے مطابق دین فطرت کے حامل تھے۔آپؑ وہ پہلے شخص ہیں کہ جس نے خدا کے دین کو اسلام اور اس کے پیروؤں کو مسلمین کہا ،اور دنیا میں ادیان توحید یعنی یہودیت ،نصرانیت اور اسلام آپؑ پر منتہی ہوتے ہیں، کیونکہ ان تینوں ادیان کے پیشوا حضرت موسیٰ کلیم ،حضرت عیسیٰ مسیحؑ اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں اور یہ سب دعوت دینے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نقش قدم پر تھے۔

۳۔حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام: حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام تیسرے اولوالعزم پیغمبر اور صاحب کتاب وشریعت ہیں۔آپؑ اسرائیل (یعقوب) کی اولاد میں سے ہیں ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی شوروغل سے بھری ہوئی تھی ۔آپؑ کی

پیدائش کے وقت بنی اسرائیل مصر میں قبطیوں کے درمیان ذلت واسیری کی زندگی گزار رہے تھے اور فرعون[1] کے حکم سے بچوں کے سر قلم کئے جارہے تھے۔ حضرت موسی علیہ السلام کی ماں کو خواب میں جو حکم دیاگیا تھا اس کے مطابق موسیٰ کولکڑی کے ایک صندوق میں رکھ کر دریائے نیل میں ڈال دیا۔پانی نے صندوق کوبہا کر فرعون کے محل کے قریب پہنچادیا ۔فرعون کے حکم سے صندوق کوپانی سے نکالا گیا ،جب صندوق کو کھولا گیا تواس میں ایک خوبصورت بچے کو پایا گیا۔فرعون نے ملکہ کے اصرار پر بچے کو قتل نہیں کیا ،اور چونکہ وہ لا ولد تھا ،لھذا اسے اپنا بیٹا بنالیا اور دایہ کے حوالہ کیا گیا اتفاق سے وہی اس کی ماں تھی۔ حضرت موسی علیہ السلام ابتدائے جوانی تک فرعون کے دربار میں تھے۔اس کے بعد ایک قتل کے حادثہ کی وجہ سے فرعون سے ڈر کر، مصر سے بھاگ کر مداین چلے گئے اور وہاں پر حضرت شعیب پیغمبر علیہ السلام سے ملاقات ہوئی اور حضرت شعیب کی ایک بیٹی سے شادی کی ۔کئی سال تک حضرت شعیب کی بھیڑبکریوں کو چراتے رہے۔ایک دن انھیں اپنے وطن کی یادآئی۔

اپنے اہل و عیال اورسازوسامان کے ساتھ راہی مصر ہوئے ۔اس سفر کے دوران جب رات کے وقت طور سینا پہنچے تو خدائے متعال کی طرف سے رسالت کے عہدہ پرفائز ہوئے اورآپؑ کومامور کیا گیا کہ فرعون کو دین توحید کی دعوت دیں اور بنی اسرائیل کو قبطیوں سے نجات دلائیں اور اپنے بھائی ہارون کو اپنا وزیر قرار دیں ۔لیکن اپنے فریضہ کو انجام دینے اورپیغام الٰہی کو پہنچانے کے بعد فرعون،جوکہ بت پرست تھااورخود کو خدا کہتا تھا،نے آپؑ کی رسالت اوردعوت کو مسترد کردیا اور بنی اسرائیل کی آزادی کا ضامن نہیں ہوا۔

حضرت موسی علیہ السلام نے سالہا سال تک لوگوں کو توحید کی دعوت دی اور بہت سے معجزے دکھائے لیکن اس کے باوجود فرعون اور اس کی قوم ان کے ساتھ سختی اور تند مزاجی کا مظاہرہ کرتی رہی۔یہاں تک کہ حضرت موسی علیہ السلام خدا کے حکم سے بنی اسرائیل کے ہمراہ رات کے اندھیرے میں مصر سے کوچ کر کے صحرائے سینا کی طرف چلے گئے۔جب وہ بحراحمر پہنچے تو

[1] مصر میں بادشاہ کو (فرعون)کہتے تھے۔

فرعون کو یہ معلوم ہوگیا اور اس نے اپنے لشکر کے ساتھ ان کا پیچھا کیا ۔ حضرت موسی علیہ السلام نے معجزہ کے ذریعہ سمندر کو شگافتہ کیا اور اپنی قوم کے ساتھ پانی سے گزر گئے ،لیکن فرعون اور اس کا لشکر غرق ہوگیا ۔اس واقعہ کے بعد خدائے متعال نے حضرت موسی علیہ السلام پر توریت نازل فرمائی اور بنی اسرائیل میں کلیمی شریعت کونافذ کیا ۔

۴۔حضرت عیسی مسیح علیہ السلام: حضرت مسیح اولواالعزم اور صاحب کتاب و صاحب شریعت پیغمبروں میں سے چوتھے پیغمبر ہیں۔آپؑ کی پیدائش غیر معمولی تھی ۔آپؑ کی والدہ حضرت مریم،ایک مقدس و پارسا دوشیزہ تھیں جو بیت المقدس میں عبادت کرنے میں مشغول تھیں کہ خدا کی طرف سے روح القدس آپؑ پر نازل ہوئے اور حضرت مسیح کی بشارت دی پھر ان کی آستین میں پھونک ماری کہ جس سے وہ حاملہ ہو گئیں ۔

حضرت مسیح نے پیدا ہونے کے بعد اپنی ماں پر لوگوں کی طرف سے لگائی جانے والی تہمتوں کا جواب گہوارہ میں دیا اور اپنی والدہ کا دفاع کیا اور اپنی نبوت اور کتاب کے بارے میں لوگوں کو خبر دی ۔اس کے بعد جوانی میں لوگوں کو دعوت دینے میں مشغول ہوئے اور حضرت موسیؑ کی شریعت میں تھوڑی سی تبدیلی کرکے اسے زندہ کیا ۔آپؑ اپنے حواریوں کو اسلام کے مبلغ کی حیثیت سے مختلف علاقوں میں بھیجتے تھے ۔ایک مدت کے بعد جب ان کی دعوت پھیل گئی ،تو یہودی (آپؑ کی قوم)آپؑ کو قتل کرنے کے در پے ہوگئے ،لیکن خدائے متعال نے آپؑ کو نجات دی اور یہودیوں نے آپؑ کی جگہ پر کسی اور کو پکڑ کر سولی پر چڑھا دیا ۔یہ بات قابل ذکر ہے کہ خدائے متعال نے قرآن مجید میں حضرت عیسی علیہ السلام پر نازل ہونے والی کتاب کا نام ''انجیل''بیان کیا ہے ،یہ ''انجیل''ان انجیلوں کے علاوہ ہے، جو آپؑ کے بعد آپؑ کی سیرت اور دعوت کے بارے میں لکھی گئی ہیں ۔ان میں سے چار انجیلیں لوقا،مرقس،متی،اور یوحنا کی تالیف رسمی طور پر قبول کی گئی ہیں ۔

۵۔خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ۵۷۰ء میں ہجرت سے ۵۳ سال پہلے حجاز کے ایک شریف و نجیب ترین عرب خاندان (بنی ہاشم) میں پیدا ہوئے۔ جیسا کہ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانہ میں دنیا حیرت انگیز حد تک اخلاقی گراوٹ سے دوچار تھی اور دن بدن جہل و نادانی کے بھنور میں پھنس کر اس کی حالت بد سے بدتر ہوتی جارہی تھی اور ہر لمحہ انسانی معنویات سے دور ہوتی جارہی تھی۔ خاص کر جزیرہ نمائے عرب، جس کے اکثر باشندے صحرا نشین تھے اور قبیلوں کی صورت میں زندگی بسر کرتے تھے، تمام شہری حقوق سے محروم تھے۔ وہ لوگ کچھ خرافی اور بیہودہ افکار (من جملہ اپنے ہاتھوں سے پتھر، لکڑی اور کبھی خشک دہی کے بنائے گئے بتوں کی پرستش) میں زندگی گزارتے تھے۔

اور اپنے اسلاف کی تقلید کرنے، لوٹ کھسوٹ اور قتل و غارت کے علاوہ کسی قسم کا فخر ومباہات نہیں رکھتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ابھی پیدا نہیں ہوئے تھے کہ آپؐ کے والد گرامی عبداللہ اس دنیا سے رحلت کر گئے اور چار سال کے بعد آپؐ کی والدہ کا بھی انتقال ہو گیا۔ لہذا آپؐ کی پرورش کی ذمہ داری آپؐ کے دادا عبدالمطلب نے سنبھالی۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اپنے دادا سے بھی محروم ہوگئے اور آپؐ کے چچا حضرت ابو طالب آپ کو اپنے گھر لے گئے اور اپنے ایک بیٹے کی طرح آپؐ کو پالا۔ مکہ کے عرب دوسرے عربوں کی مانند بھیڑ بکری اور اونٹ پالتے تھے اور کبھی اپنے ہمسایہ ممالک بالخصوص شام کے ساتھ تجارت بھی کرتے تھے۔ یہ لوگ ان پڑھ تھے اور اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت کے لئے کوئی اہتمام نہیں کرتے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اگرچہ ان کے درمیان زندگی گزار رہے تھے۔ لیکن بچپن سے ہی کچھ پسندیدہ اوصاف کی وجہ سے معاشرے میں امتیازی حیثیت کے مالک تھے، آپؐ ہرگز بتوں کی پرستش نہیں کرتے تھے، جھوٹ نہیں بولتے تھے، چوری اور خیانت نہیں کرتے تھے، برے ناپسند اور نا مناسب کام انجام دینے سے پرہیز کرتے تھے، عقل وشعور رکھتے تھے، اسی لئے تھوڑے ہی عرصہ میں لوگوں کے درمیان قابل توجہ محبوبیت حاصل کرلی اور ''محمد امین'' کے نام سے مشہور ہوئے، چونکہ عرب اپنی امانتوں کو آپؐ کے سپرد کرتے تھے اور آپ کی امانتداری اور لیاقت کی تعریفیں کرتے تھے۔ آپؐ تقریباً بیس سال کے تھے کہ مکہ کی ایک

دولت مند عورت (خدیجہ کبریٰ) نے آپؐ کو اپنی تجارت کے کارندہ کی حیثیت سے معین کیا ۔آپؐ کی سچائی ،اچھائی اور عقل ولیاقت کی وجہ سے اس کو تجارت میں کافی منافع ملا اور فطری طور وہ پر آپؐ کی شخصیت سے متاثر ہوئی ،اورآخر کار آپؐکے ساتھ شادی کرنے کی پیش کش کی ،آپؐنے بھی اسے قبول کیا اور ان کے ساتھ شادی کی اور اس کے بعد بھی برسوں تک اپنی شریک حیات کے ساتھ تجارت میں مشغول رہے ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چالیس برس تک لوگوں میں عام زندگی بسر کرتے تھے اور معاشرے کے ایک فرد کی حیثیت سے پہچانے جاتے تھے ،فرق صرف اتنا تھا کہ آپ پسندیدہ اخلاق کے مالک تھے اور دوسرے لوگوں کے مانندبد کرداری میں آلودہ نہیں تھے ۔آپؐمیں ظلم ،سنگدلی اور جاہ طلبی کا شائبہ تک نہیں تھا،اس وجہ سے لوگوں میں محترم اور قابل اعتماد تھے ۔جب عربوں نے خانہ کعبہ کی مرمت کرنا چاہی اور حجرا سود کو نصب کرنے کے بارے میں عرب قبائل کے درمیان اختلاف اور جھگڑا پیدا ہوا تو انہوں نے آنحضرتؐ کو حکم قرار دیا اورآپؐ کے حکم سے ایک عبا کو پھیلا کر حجراسودکو اس میں رکھا گیا اور قبائل کے سرداروں نے عبا کے اطراف کو پکڑ کر اٹھایااور آپؐنے اپنے ہاتھوں سے حجراسود کو اس کی جگہ پر نصب فرمایااور اس طرح قبائل کے درمیان کشمکش ،لڑائی جھگڑا اور احتمالی خونریزی کا خاتمہ ہوا ۔آنحضرؐتبعثت سے پہلے اگرچہ خدائے یکتا کی پرستشکرتے تھے اوربت پرستی سے اجتناب کرتے تھے ،لیکن بت پرستی کے عقائدسے مقابلہ نہیں کرتے تھے اس لئے لوگ آپ سے کوئی سروکار نہیں رکھتے تھے ۔اس زمانے میں دوسرے ادیان کے پیرو جیسے یہود و نصاری بھی عربوں میں محترمانہ طور پر زندگی گزارتے تھے اور اعراب ان کے لئے بھی کوئی مزاحمت ایجاد نہیں کرتے تھے ۔

بحیرا راہب کا قصہ

جن دنوں آنحضرؐتاپنے چچا حضرت ابو طالب کے ہاں زندگی بسر کر رہے تھے اور ابھی بالغ نہیں ہوئے تھے ،ان دنوں حضرت ابو طالب تجارت کی غرض سے شام گئے اورآنحضرؐتکو بھی اپنے ساتھ لے گئے ۔ایک بڑا قافلہ تھا،کافی مال تجارت کے ساتھ لوگوں کی

ایک بڑی تعداد تھی ،قافلہ سر زمین شام میں داخل ہوا اور شہر بصری میں پہنچا ،ایک دَیر کے قریب پڑاو ڈالااور خیمے نصب کر کے آرام کرنے لگے ۔ایک راہب جس کا لقب ''بحیرا'' دَیر سے باہر آیا اور قافلہ کی دعوت کی،سب نے بحیرا کی دعوت قبول کی اور دیر میں گئے ۔ حضرت ابو طالب بھی آنحضرتؐکو سامان کے پاس بٹھا کر دوسرے لوگوں کے ساتھ بحیرا کی دعوت پر گئے۔

بحیرا نے پوچھا :کیا سب آگئے ؟ابو طالب نے کہا :سب سے چھوٹے ایک نوجوان کے علاوہ سب لوگ آگئے ہیں ۔

بحیرانے کہا :اسے بھی لے کے آئیے ۔آنحضرتؐزیتون کے ایک درخت کے نیچے کھڑے تھے ،حضرت ابو طالب نے آپکو بلایا اور آپؐبھی راہب کے پاس آگئے ۔ بحیرا نے آنحضرتؐپر ایک گہری نظر ڈالنے کے بعد کہا :میرے قریب آجاو ،میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں ۔اس کے بعد آنحضرتؐ کو ایک طرف لے گیا ۔ حضرت ابو طالب بھی ان کے پاس گئے۔ بحیرا نے آنحضرتؐسے کہا :آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں اور تم کو لات وعزی کی قسم دیتا ہوں کہ جواب ضرور دینا ۔ (لات وعزّیٰ دو بتوں کے نام ہیں کہ جن کی مکہ کے لوگ پرستش کرتے تھے)آنحضرتؐ نے فرمایا : سب سے زیادہ میں ان دونوں بتوں سے نفرت کرتا ہوں ۔ بحیرا نے کہا :تم کو خدائے یکتا کی قسم دیتا ہوں سچ کہنا ۔آپؐنے فرمایا :میں ہمیشہ سچ بولتا ہوں اور کبھی جھوٹ نہیں بولتا ہوں آپ اپنا سوال کیجئے۔

بحیرا نے پوچھا :کس چیز کو سب سے زیادہ پسند کرتے ہو ؟آپؐ نے فرمایا :تنہائی کو ۔ بحیرا نے پوچھا :کس چیز پر زیادہ نظر ڈالتے ہواور اسے دیکھنا پسند کرتے ہو۔ ؟آپؐنے فرمایا :آسمان اور اس میں موجود ستاروں کو۔ بحیرانے پوچھا :کیا سوچ رہے ہو؟آنحضرتؐنے خاموشی اختیار کی لیکن بحیرا بغور اور سنجیدگی کے ساتھ آپکی پیشانی کو دیکھتا رہا۔ بحیرانے کہا :کس وقت اور کس فکر میں سوتے ہو ؟ آپؐنے فرمایا :اس وقت جب آنکھیںآسمان پر جائے ہوتا ہوں اور ستاروں کو دیکھتا ہوں،انھیں اپنی آغوش میں اور خود کو ان کے اوپر پاتا ہوں ۔ بحیرا نے کہا : کیا خواب بھی دیکھتے ہو ؟آپؐ نے فرمایا : جی ہاں،جو خواب میں دیکھتا ہوں،اسے بیداری میں بھی دیکھتا ہوں۔ بحیرا نے کہا :مثلاً،خواب میں کیا دیکھتے ہو ؟آنحضرتؐ:نے خاموشی اختیار کی اور بحیرا بھی خاموش رہا ۔ تھوڑی دیر رکنے کے بعد

بحیرا نے پوچھا: کیا میں آپ کے دونوں شانوں کے درمیان دیکھ سکتا ہوں؟ آنحضرتؐ اپنی جگہ سے اٹھے بغیر بولے: آؤ اور دیکھ لو۔ بحیرا اپنی جگہ سے اٹھا، آپؐ کے قریب آیا، آنحضرتؐ کے شانوں سے لباس ہٹایا، ایک سیاہ تل نظر آیا، ایک نظر ڈال کر زیر لب بولا: وہی ہے! ابو طالب نے پوچھا: کون ہے؟ کیا کہتے ہو؟ بحیرا نے کہا: ایک علامت جس کی ہماری کتابوں میں خبر دی گئی ہے۔ ابو طالب نے پوچھا: کون سی علامت؟ بحیرا نے دریافت کیا: اس جوان سے آپ کا کیا رشتہ ہے؟ ابوطالب چونکہ آپؐ کو اپنے بیٹے کی طرح چاہتے تھے، اس لئے بولے: یہ میرا بیٹا ہے۔ بحیرا نے کہا: نہیں، اس جوان کا باپ مرچکا ہونا چاہئے۔ ابو طالب نے پوچھا: تم کیسے جانتے ہو؟ جی ہاں یہ جوان میرا بھتیجا ہے! بحیرا نے ابو طالب سے کہا: سن لو، اس جوان کا مستقبل اتنا درخشان اور حیرت انگیز ہے، کہ جو میں نے دیکھا ہے اگر اسے دوسرے دیکھ لیں گے اور اسے پہچان لیں گے تو اسے قتل کر ڈالیں گے، اسے دشمنوں سے مخفی رکھنا اور اس کی حفاظت کرنا۔ ابوطالب نے کہا: بتاؤ وہ کون ہے؟ بحیرا نے کہا: اس کی آنکھوں میں ایک عظیم پیغمبر کی علامت اور اس کی پشت پر اس کی واضح نشانی ہے۔

نسطورا راہب کا قصہ

چند برسوں کے بعد آنحضرتؐ حضرت خدیجہ کبریٰ کی تجارت کے کارندے کی حیثیت سے ان کا مال لیکر دوبارہ شام گئے۔ حضرت خدیجہ نے میسرہ نامی اپنے ایک غلام کو آپؐ کے ہمراہ بھیجا اور اس سے تاکید کی کہ مکمل طور پر آپؐ کی اطاعت کرے۔ اس سفر میں بھی جب قافلہ شام کی سر زمین پر پہنچا، تو شہر بصری کے نزدیک ایک درخت کے نیچے پڑاؤ ڈالا، وہاں قریب میں نسطورا نامی ایک راہب کی عبادت گاہ تھی، جسے میسرہ پہلے سے جانتا تھا۔ نسطورا نے میسرہ سے پوچھا: درخت کے نیچے سویا ہوا کون ہے؟ میسرہ نے کہا: قریش سے ایک مرد ہے۔ راہب نے کہا: اس درخت کے نیچے اب تک کوئی نہیں ٹھہرا ہے اور نہ ٹھہرے گا، مگر یہ کہ خدا کے پیغمبروں میں سے ہو۔ اس کے بعد پوچھا: کیا اس کی آنکھوں میں سرخی ہے؟ میسرہ نے کہا: جی ہاں، اس کی آنکھیں

ہمیشہ اسی حالت میں ہوتی ہیں۔ راہب نے کہا : یہ وہی ہے اور وہ خدا کے پیغمبروں میں سے آخری پیغمبر ہے، کاش میں اس دن کو دیکھتا ،جس دن وہ دعوت پر مامور ہوں گے ۔

حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آخری پیغمبر ہیں ،جنھیں خدائے متعال نے لوگوں کی ہدایت کے لئے دنیا میں بھیجا ہے ۔ چودہ سو سال پہلے ،عالم بشریت ایک ایسی حالت سے گزر رہی تھی کہ جب دین اور توحید کا صرف نام باقی تھا ۔لوگ یکتا پرستی اور خدا شناسی سے بالکل دور ہو چکے تھے۔ معاشرے سے انسانیت کے آداب اور عدالت ختم ہو چکی تھی۔ جزیزہ نمائے عرب، میں خانہ خدا اور دین ابراہیم کا مرکز ہونے کے باوجود،کعبہ شریف بت خانہ میں اور دین ابراہیم ،بت پرستی میں تبدیل ہو چکا تھا ۔عربوں کی زندگی،قبیلوں پر مشتمل تھی،یہاں تک کہ چند شہر جو حجاز اور یمن وغیرہ میں تھے،اسی ترتیب سے چلائے جاتے تھے ۔ دنیائے عرب بد ترین حالات سے گزر رہی تھی تہذیب و تمدن کے بجائے ان میں بے حیائی ،عیاشی ،شراب نوشی اور جوا کھیلنا رائج تھا ۔لڑکیوں کو زندہ دفن کیا جاتا تھا ۔لوگوں کی زندگی اکثر چوری ،ڈاکہ زنی ،قتل اور مال مویشوں کو لوٹ کر چلائی جاتی تھی ۔ ظلم وستم اور خونریزی کو سب سے بڑا فخر سمجھا جاتا تھا ۔خدائے متعال نے ایسے ماحول میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دنیا کی اصلاح اور رہبری کے لئے مبعوث فرمایا اورقرآن مجید کو آپؐ پر نازل کیا ۔ جس میں حق شناسی کے معارف،انصاف کے نفاذ کے طریقے اور مفید نصیحتیں موجود ہیں ،اورآنحضرتؐ کو مامور فرمایا تاکہ آسمانی سند سے لوگوں کوانسانیت اور حق پیروی کرنے کی دعوت دیں ۔پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعثت سے پہلے بت پرستی کے ماحول میں زندگی بسر کرنے کے باوجود کبھی،بتوں کی تعظیم میں سر تسلیم خم نہیں کیا اور ہمیشہ خدائے یکتا کی پرستش کرتے رہے ،کبھی مکہ کے نزدیک واقع غار حرامیں جاتے تھے اور لوگوں کے شورو غوغا سے دور اپنے پروردگار سے مناجات کرتے تھے ۔جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی عمر شریف کے چالیس سال گزارنے کے بعدپروردگار عالم کی طرف سے مقام رسالت وپیغمبری پرمبعوث ہوئے توقرآن مجید کا پہلا سورہ (اِقرء باسم

ربک)آپؐپر نازل ہوا اورآپؐلوگوں کی دعوت و تبلیغ پرما مور ہوئے ۔ابتدائی مرحلہ میں جو ماموریت ذمہ داری آپؐ پر تھی وہ یہ تھی کہ دعوت کو مخفی طورپر شروع کریں ۔

سب سے پہلے جو شخص آپؐپر ایمان لایا وہ حضرت علی بن ابیطالب علیہ السلام تھے ،وہ آپؐکے گھر میں زندگی بسر کرتے تھے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود ان کی تربیت فرماتے تھے ،حضرت علیؑ کے بعد حضرت خدیجہ کبریٰ سلام اللہ علیہا نے اسلام قبول کیا ۔ایک مدت تک یہ دونوں آنحضرتؐکے ساتھ نماز پڑھتے رہے جبکہ اس وقت دوسرے لوگ شرک و کفر میں زندگی بسر کررہے تھے ،کچھ دنوں کے بعد تھوڑے سے لوگ آنحضرتؐ پر ایمان لائے ۔پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تین سال کے بعد خدا کی طرف سے حکم ہوا کہ اعلانیہ طور پر دعوت دیں اوراپنے رشتہ داروں سے اس کا آغاز کریں۔آنحضرتؐنے اس حکم کے مطابق اپنے تمام رشتہ داروں کو جمع کیا اوران کے سامنے اپنی رسالت کا اعلان کیا اور یہ بشارت دی کہ جوبھی ان میں سب سے پہلے آپکی دعوت کو قبول کرے گا وہی آپ کا جانشین ہوگاآپؐنے اس اعلان کو تین بار دوہرایا لیکن ان میں سے کسی نے قبول نہیں کیا،بلکہ ہر بارصرف حضرت علی علیہ السلام اٹھے اورآنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اپیل کو قبول کیا ۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی حوصلہ افزائی فرمائی ۔ اور ان کو اپنا جانشین بنانے کا وعدہ کیا ۔آخر میں ان لوگوں نے کھڑے ہوکر ہنسی اڑاتے ہوئے حضرت ابو طالب سے مخاطب ہو کر کہا : ''اس کے بعد تمہیں اپنے فرزندکی اطاعت کرنی چاہئے ''پھر وہ لوگ چلے گئے۔اسکے بعد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اعلانیہ طور پر عام دعوت کا آغازکیا،لیکن لوگوں سے شدید ،سخت، عجیب اورناقابل برداشت مقابلہ کرنا پڑا ۔مکہ کے لوگ اپنے وحشیانہ مزاج اور اپنی بت پرستی کی عادت کی وجہ سے دشمنی اورضد پر اترآئے اورآنحضرؐاورآپ کے پیروؤں کو جسمانی اذیت پہنچانے، مضحکہ اور توہین کرنے میں کوئی کسر باقی نہ رکھتے تھے اور ہرروز اپنی بیوقوفی اور سختی میں اضافہ کرتے تھے۔جتنا لوگوں کی طرف سے سختی اوردباؤ بڑھتا جا رہاتھا ،اتنا ہی آنحضرؐبھی اپنی دعوت میں صبرواستقامت،اورثابت قدمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے اور اسلام کے پیروؤں میں تدریجاًاضافہ ہوتارہا

لہذا کفار نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لالچ دینا شروع کی کہ انہیں کافی مال و دولت دیں گے یا انھیں حاکم کے طور پر منتخب کریں گے تاکہ وہ اپنی دعوت سے دست بردار ہو جائیں یا صرف اپنے خدا کی طرف دعوت دیں اور ان کے خداؤں کو نہ چھیڑیں ۔

لیکن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی تجویز کو ٹھکرا دیا اور اس خدائی فریضہ کو انجام دینے اور دعوت کو جاری رکھنے کے اپنے مستحکم عزم وارادے کا اعلان کیا ۔کفار جب طمع و لالچ کے راستے سے ناامید ہوگئے تو انہوں نے دوبارہ اپنے دباؤ میں اضافہ کیا اور مسلمانوں کو سخت جسمانی اذیتیں تکلیفیں پہنچانے لگے اور کبھی ان میں سے کچھ کو قتل کرتے تھے تاکہ انھیں اسلام سے روک سکیں ۔کفار نے قبیلۂ بنی ہاشم کے سردار حضرت ابو طالب کے لحاظ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قتل کرنے سے اجتناب کیا ،لیکن یہ لحاظ دوسری اذیتوں اور تکلیفوں کو روک نہ سکا ۔ایک مدت کے بعد مسلمانوں کا عرصۂ حیات اور تنگ ہو گیا اور ظلم وستم اپنی انتہا کو پہنچ گیا حالت یہ ہو گئی تھی کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحاب کو حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت دیدی تاکہ کچھ دنوں تک آرام کی سانس لے لیں ۔ایک جماعت نے حضرت علیؑ کے بھائی حضرت جعفر بن ابیطالب کی سر کردگی میں اپنے اہل وعیال کے ہمراہ حبشہ کی طرف ہجرت کی (جعفر پیغمبر اکرمؐ کے منتخب صحابیوں میں سے تھے) ۔کفار مکہ جب مسلمانوں کی ہجرت سے آگاہ ہوئے تو انہوں نے اپنے دو تجربہ کار افراد کو کافی مقدار میں تحفہ و تحائف کے ساتھ حبشہ کے بادشاہ کے پاس بھیجا،اورانہوں نے بادشاہ سے مکہ کے مہاجرین کو واپس بھیجنے کا تقاضا کیا ،لیکن جعفر بن ابیطالب نے اپنے بیانات سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سراپا نورانی شخصیت اور اسلام کے بلند اصولوں کی حبشہ کے بادشاہ ، مسیحی پادریوں اور ملک کے حکام کے سامنے تشریح کی اور سورۂ مریم کی چند آیتوں کی تلاوت فرمائی ۔

حضرت جعفر بن ابیطالب کا حق پر مبنی یہ بیان ایسا دلچسپ و موثر تھا کہ بادشاہ اور مجلس میں موجود تمام لوگوں نے آنسو بہائے ۔ نتیجہ میں بادشاہ نے کفار مکہ کے تقاضا کو مسترد کیا اور ان کے بھیجے ہوئے تحفوں کو واپس کر دیا اور حکم دیا کہ مسلمان مہاجرین کے آرام وآسائش کے تمام امکانات فراہم کئے جائیں۔کفار مکہ نے اس روئداد کے بعدآپس میں معاہدہ کیا کہ بنی ہاشم ،جو پیغمبر اسلام کے رشتہ

دار تھے ،اور ان کے حامیوں کے ساتھ قطع تعلق کر کے مکل طورپر سوشل بائیکاٹ کریں، اس سلسلہ میں انہوں نے ایک عہد نامہ لکھا اور عام لوگوں سے دستخط لے کر اسے کعبہ میں رکھا ۔بنی ہاشم، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ مکہ سے باہر جانے پر مجبور ہوئے اور شعب ابو طالب نامی کے ایک درہ میں پناہ لی او رانتہائی سختی اور بھوک میں زندگی بسر کرتے تھے۔اس مدت کے دوران کسی نے شعب ابو طالب سے باہر آنے کی جرائت تک نہیں کی، دن میں شدید گرمی اور رات کو عورتوں اور بچوں کی فریادوں سے دست وگریبان تھے۔کفار تین سال کے بعد عہد نامہ کے محو ہونے اور بہت سے قبائل کی طرف سے ملامتوں کے نتیجہ میں اپنے معاہدہ سے دست بردار ہوئے اور بنی ہاشم کا محاصرہ ختم ہوا ،لیکن انہی دنوں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تنہا حامی حضرت ابو طالب اورآنحضرتؐکی شریک حیات حضرت خدیجہ کبری ؑکا انتقال ہوگیا ۔ پیغمبراسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے اور مشکل ہوگئی ۔آپؐمیں یہ طاقت نہیں رہی کہ لوگوں کے درمیان جائیں یا خود کو کسی کے سامنے ظاہر کریں یا کسی خاص جگہ پر رہیں ۔یہاں تک کہ آپؐ کی جان کی کوئی حفاظت نہیں تھی ۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طائف کی طرف سفرجس سال پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور بنی ہاشم شعب ابو طالب کے محاصرہ سے باہر آئے ،وہ بعثت کا تیرھواں سال تھا ۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان ہی دنوں شہر طائف کی طرف سفر کیا ۔ (طائف مکہ سے تقریبا سو کلو میٹر کی دوری پر ایک شہر ہے)آپؐنے طائف کے باشندوں کو اسلام کی دعوت دی ،لیکن اس شہر کے جاہل ہر طرف سے آپؐپر حملہ آور ہوئے اورآپؐکو برا بھلا کہا ،سنگسار کیا اورآخر کار آنحضرتؐ کو شہر سے باہر نکال دیا گیا ۔پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم طائف سے مکہ لوٹے اور کچھ مدت تک مکہ میں رہے ،چونکہ وہاں پر جان کی کوئی حفاظت نہیں تھی،اس لئے لوگوں کے درمیان نہیں آتے تھے۔ کفار مکہ کے سردار اوربزرگ شمع رسالت کو گل کرنے کی خاطر مناسب فرصت کو دیکھتے ہوئے ،دار الندوہ ۔جو مجلس شوری کے مانند تھا ۔ میں جمع ہوئے اور ایک مخفیانہ میٹنگ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قتل کرنے کا آخری منصوبہ بنایا ۔مذکورہ منصوبہ یہ تھا کہ قبائل عرب کے ہر قبیلہ سے ایک شخص کو چن لیا جائے اور تمام منتخب افراد ایک ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر پر حملہ کر کے

آپؐ کو قتل کر ڈالیں۔ اس منصوبہ میں تمام قبائل کو شریک کرنے کا مقصود یہ تھا کہ آنحضرتؐ کا قبیلہ بنی ہاشم آپؐ کے خون کا بدلہ لینے کے لئے قیام نہ کر سکئے اور قتل کا منصوبہ بنانے والوں سے نہ لڑ سکے۔ اور اسی طرح بنی ہاشم میں سے ایک آدمی کو شریک کر کے قبیلۂ بنی ہاشم کی زبان مکمل طور پر بند کردی ۔اس فیصلے کے مطابق، مختلف قبائل کے تقریبا چالیس افراد آنحضرتؐ کے قتل کے لئے منتخب ہوئے، انہوں نے رات کے اندھیرے میں آنحضرتؐ کے گھر کا محاصرہ کیا ،حملہ آور سحر کے وقت گھر میں داخل ہوئے تاکہ منصوبہ کو عملی جامہ پہنائیں،لیکن ارادۂ الٰہی ان کے ارادہ سے بلند ہے، کہ جس سے ان کے منصوبہ پر پانی پھر گیا ۔خدائے متعال نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی کئی اور کفار کے منصوبہ سے آگاہ فرمایااور حکم فرمایا کہ راتوں رات مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کریں ۔پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے واقعہ کی روداد سے حضرت علی علیہ السلام کو آگاہ فرمایا اور حکم دیا کہ رات کو آپؐ کے بستر پر سو جائیں اور ان سے کچھ وصیتیں کیں اور رات کے اندھیرے میں گھر سے باہر نکلے ،راستے میں حضرت ابو بکر کو دیکھا ،انھیں بھی اپنے ساتھ مدینہ لے کر گئے ۔مدینہ کے کچھ بزرگ آنحضرتؐ کی ہجرت سے پہلے مکہ آکر آپؐ سے ملاقات کی اور آپ پر ایمان لائے تھے اور ضمناً ایک عہدنامہ لکھا تھا کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ تشریف لائیں تو وہ ان کی حمایت میں ایسے ہی دفاع کریں گے جیسا وہ اپنی جان و عزت کا دفاع کرتے ہیں ۔

مدینہ کے یہودیوں کی بشارت

یہودیوں کے بہت سے قبیلوں نے آنحضرتؐ کے اوصاف اورآپکی جگہ کے بارے میں اپنی کتابوں میں پڑھا تھا اور اپنے وطن کو ترک کر کے حجاز آکر مدینہ اور اس کے اطراف میں پڑاؤ ڈالا تھا اور نبی امی کے ظہور کا انتظار کر رہے تھے۔چونکہ وہ لوگ دولت مند تھے،اس لئے اعراب کبھی کبھی ان پر حملہ کر کے ان کے مال و دولت کو لوٹ لیتے تھے ۔یہودی ہمیشہ مظلومیت کے عالم میں ان سے مخاطب ہو کر کہتے تھے : ''ہم تم لوگوں کے ظلم و ستم پر یہاں تک صبر کریں گے کہ نبی امی مکہ سے ہجرت کرکے اس علاقہ میںآ جائیں، اس دن ہم آنحضرتؐ پر ایمان لاکر تم لوگوں سے انتقام لیں گے'' ۔اہل مدینہ کے فوراً ایمان لانے کے اہم عوامل میں سے ایک ان

ہی بشارتوں کا ان کے ذہنوں پر اثر تھا ،آخر کار وہ لوگ ایمان لے آئے ۔ لیکن یہودیوں نے قومی تعصب کی بنا پر ایمان لانے سے گریز کیا ۔

نبی کی بشارتوں کی طرف قرآن مجید کا اشارہ

خدائے متعال اپنے کلام پاک میں کئی جگہوں پران بشارتوں کی طرف اشارہ فرماتا ، بالخصوص اہل کتاب کے ایک گروہ کے ایمان کے بارے میں فرماتا ہے ۔ (الذّین یتّبعون الرّسول النّبی الامّی الذّی یجدونہ مکتوباً عندہم فی التّوریۃ والانجیل یامرہم بالمعروف و ینھٰہم عن المنکر و یحلّ لہم الطیّبٰت ویحرّم علیہم الخبٰئث ویضع عنہم اصرہم و الاغلل التّی کانت علیہم[۱]) ''جولوگ کہ رسول نبی امی کا اتباع کرتے ہو جس کا ذکر اپنے پاس توریت اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں کہ وہ نیکیوں کا حکم دیتا ہے اور برائیوں سے روکتا ہے اور پاکیزہ چیزوں کو حلال قرار دیتا ہے اور خبیث چیزوں کو حرام قرار دیتا ہے اور ان پرسے احکام کے سنگین بوجھ اور قید وبند کو اٹھادیتا ہے''...مزید فرماتا ہے:(ولمّا جاء ہم کتٰب من عند اللّٰہ مصدّق لما معہم و کانوا من قبل یستفتحون''[۲]) (...اور جب ان کے پاس خدا کی طرف سے کتاب آئی ہے جوان کی توریت وغیرہ کی تصدیق بھی کرنے والی ہے اور اسکے پہلے وہ دشمنوں کے مقابلہ میں اسی کے ذریعہ طلب فتح بھی کرتے تھے ۔'

پیغمبر اسلام صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم کا مدینہ میں ورود اسلام کی ترقی کی زمین شہر یثرب جس کا بعد میں مدینہ نام رکھا گیا ۔ میں ہموار ہوی اور اس کا سبب یہ تھا کہ اہل مدینہ داخلی جنگ ۔جو برسوں سے اوس وخزرج نامی دو قبیلوں کے درمیان جاری تھی ۔سے تنگ آچکے تھے ،آخر کار وہ اس فکر میں تھے کہ اپنے لئے ایک بادشاہ کا انتخاب کر کے اس قتل و غارت کو ختم کریں ۔انہوں نے اس کام کے لئے،اپنے چند معروف افراد کو مکہ بھیجا تاکہ اس سلسلہ میں مکہ کے سرداروں سے گفتگو کریں ۔یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب مکہ میں پیغمبراسلام صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی دعوت کو اعلانیہ طور پر شروع کیا تھا ۔مدینہ کی معروف شخصیتیں جب مکہ پہنچ گئیں اور

---

[۱] اعراف،۱۵۷
[۲] بقرہ،۹

انھوں نے اپنے مقصد کو قریش کے سرداروں کے سامنے پیش کیا،تو قریش کے سرداروں نے اس عذرو بہانہ سے ان کے ساتھ صلاح ومشورہ کرنے سے پہلو تہی کی کہ ایک مدت سے اس شہر میں محمدؐ نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے اور ہمارے مقدس خداؤں کو برا بھلا کہا ہے، اور ہمارے جوانوں کو گمراہ کیا ہے اور ہمیں فکر مند کیا ہے۔اس بات کو سن کر اہل مدینہ ہل کر رہ گئے،کیونکہ انھوں نے مدینہ میں یہودیوں سے بارہا یہ پیشگوئی سنی تھی کہ مکہ میں نبی امی ظہور کریں گے،لہذا ان کے دماغ میں یہ خیال پیدا ہوا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جاکر انھیں دیکھیں اور ان کی دعوت کی کیفیت سے آگاہ ہو جائیں ۔جب وہ آنحضرتؐ کی خدمت میں پہنچے اورآپؐ کے بیانات اور قرآن مجید کی آیات کوسنا تو وہ ایمان لے آئے اورآنحضرتؐسے وعدہ کیا کہ اگلے سال مدینہ کے کچھ لوگوں کے ہمراہ آکر اسلام کی ترقی کے اسباب فراہم کریں گے ۔دوسرے سال مدینہ کے سرداروں کی ایک جماعت مکہ آئی،رات کے وقت شہر سے باہر تنہائی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملاقات کی اور آپکی بیعت کی اور مدینہ میں دین اسلام کو رائج کرنے کا عہد وپیمان کیا اور کہا کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ تشریف لائیں تو وہ دشمنوں سے آپؐ کی اس طرح حفاظت ودفاع کریں گے جیسا وہ اپنے خاندان کا دفاع کرتے ہیں اس کے بعد یہ لوگ مدینہ لوٹے،اہل مدینہ میں سے اکثر لوگوں نے اسلام قبول کیا اور اس طرح شہر مدینہ اسلام کا پہلا شہر بن گیا ۔

لہذا جب انھوں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تشریف لانے کی خبر سنی تو وہ بہت خوشحال ہوئے اور انتہائی بے تابی کے ساتھ آنحضرتؐکے استقبال کے لئے بڑھے اور آپ کا شایان شان استقبال کیا اور انتہائی خلوص نیت سے اپنی جان ومال کو اسلام کی ترقی کے لئے آپکی خدمت میں پیش کیا اسی لئے ان کا نام ''انصار'' رکھا گیا۔خدائے متعال اپنے کلام پاک میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہجرت کے واقعہ اور انصار کی خدمات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان کی قدردانی کرتا ہے:(والذین تبوء والدار والایمٰن من قبلھم یحبّون من ہاجر إلیھم و لا یجدون فی صدورھم حاجۃً مّا اوتو ویؤثرون علی انفسھم ولو کان بھم خصاصۃ) (حشر،۹) ''اور جن لوگوں نے دارالہجرت اور ایمان کو ان سے پہلے اختیار کیا تھا وہ ہجرت کرنے والوں کو دوست رکھتے ہیں اور جو کچھ انھیں دیا

گیا ہے اپنے دلوں میں اس کی طرف سے کوئی ضرورت نہیں محسوس کرتے ہیں اور اپنے نفس پر دوسروں کو مقدم کرتے ہیں چاہے انھیں کتنی ہی ضرورت کیوں نہ ہو''۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جنگوں کا ایک مختصر جائزہ

۱۔جنگ بدر: آخر کار ۲ھ میں مسلمانوں اور کفار مکہ کے درمیان پہلی جنگ سرزمین بدر میں ہوئی۔اس جنگ میں کفار کے سپاہیوں کی تعداد تقریبا ایک ہزار تھی جو جنگی سازوسامان اور اسلحہ سے مکمل طور پر لیس تھے اور مسلمانوں کے پاس ان کی نسبت ایک تہائی افراد تھے جو اچھی طرح سے مسلح بھی نہیں تھے۔لیکن خدائے متعال کی عنایتوں سے اس جنگ میں مسلمانوں کو شاندار فتح حاصل ہوئی اور کفار کو بری طرح شکست کا سامنا کرنا پڑا۔اس جنگ میں کفار کے ستر افراد مارے گئے،ان میں سے تقریبا نصف حضرت علی علیہ السلام کی تلوار سے قتل ہوئے۔اس کے علاوہ ان کے ستر آدمی اسیر کر لئے گئے اور باقی افراد تمام جنگی سازوسامان چھوڑ کر بھاگ گئے۔

۲۔جنگ احد: ۳ ہجری میں کفار مکہ نے ابوسفیان کی سرکردگی میں تین ہزار افراد کے ساتھ مدینہ پر حملہ کیا اور احد کے بیابان میں ان کا مسلمانوں کے ساتھ آمنا سامنا ہوا۔پیغمبر اسلام نے اس جنگ میں سات سو مسلمانوں کے ہمراہ کفار کے سامنے صف آرائی کی۔جنگ کی ابتداء میں مسلمانوں کا پلہ بھاری تھا،لیکن کئی گھنٹوں کے بعد بعض مسلمانوں کی کوتاہی کی وجہ سے لشکر اسلام کو شکست کا سامنا کرنا پڑا اور کفار نے ہر طرف سے مسلمانوں پر تلواروں سے وار کیا۔

اس جنگ میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا حضرت حمزہ تقریبا ستر اصحاب پیغمبرؐ،جن میں اکثر انصار تھے،کے ساتھ شہید ہوئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیشانی مبارک زخمی ہوئی اور آپ کے سامنے کے دانتوں میں سے ایک دانت ٹوٹ گیا۔ایک کافر نے آپ کے شانہ مبارک پر ایک ضرب لگا کر آواز دی: ''میں نے محمد کو قتل کر دیا''اس کے نتیجہ میں لشکر اسلام پراگندہ ہوا

۔صرف حضرت علی علیہ السلام چند افراد کے ہمراہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اردگرد آپؐ کی حفاظت کرتے ہوئے ثابت قدم رہے اور حضرت علی علیہ السلام کے علاوہ سب شہید ہوئے حضرت علی علیہ السلام نے آخر تک مقابلہ کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دفاع کیا ۔آخری وقت ،اسلام کے فراری فوجی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گرد دوبارہ جمع ہوئے ،لیکن دشمن کے لشکر نے اس قدر کامیابی کو غنیمت سمجھ کر جنگ سے ہاتھ کھینچ لیا اور مکہ روانہ ہوے ۔لشکر کفار چند فرسخ طے کرنے کے بعد اس بات پر غور کرنے کے بعد سخت پشیمان ہوئے کہ انہوں نے جنگ کو آخری فتح تک کیوں جاری نہ رکھا تاکہ مسلمانوں کی عورتوں اور بچوں کو اسیر کر کے ان کے اموال کو لوٹ لیتے ۔اس لئے مدینہ پر دوبارہ حملہ کرنے کے لئے آپس میں مشورہ کررہے تھے۔لیکن انھیں یہ خبر ملی کہ لشکر اسلام جنگ کو جاری رکھنے کے لئے ان کے پیچھے آرہا ہے ۔وہ اس خبر کو سن کر مرعوب ہوئے اور پھر سے مدینہ لوٹنے کا ارادہ ترک کر کے تیزی کے ساتھ مکہ کی طرف بڑھ گئے ۔

حقیقت بھی یہی تھی ،کیوں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خدا کے حکم سے مصیبت زدہ لوگوں کا ایک مسلح لشکر تیار کر کے حضرت علی علیہ السلام کی سرپرستی میں ان کے پیچھے روانہ کیا تھا ۔اس جنگ میں اگر چہ مسلمانوں کو زبردست نقصان اٹھانا پڑا لیکن حقیقت میں یہ اسلام کے نفع میں ختم ہوئی خصوصاً اس لحاظ سے کہ دونوں طرف نے جب جنگ بندی کے معاہدہ پر اتفاق کیا تو اسی وقت طے پایا تھا کہ اگلے سال اسی وقت بدر میں پھر سے جنگ لڑیں گے۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے اصحاب کے ایک گروہ کے ساتھ وعدہ کے مطابق وقت پر بدر میں حاضر ہوگئے ،لیکن کفار وہاں نہ پہنچے ۔اس جنگ کے بعد مسلمانوں نے اپنے حالات کو بہتر بنایا اور جزیرہ نمائے عرب میں مکہ اور طائف کے علاوہ تمام علاقوں میں پیش قدمی کی۔

۳۔جنگ خندق:تیسری جنگ جو عرب کفار نے پیغمبر اسلامؐ کے ساتھ لڑی ،اور جو اہل مکہ کی رہبری میں آخری اور ایک زبردست جنگ تھی ،اسے ''جنگ خندق'' یا ''جنگ احزاب'' کہتے ہیں ۔جنگ احد کے بعد مکہ کے سردار ابوسفیان کی سرکردگی میں اس فکر میں تھے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر آخری اور کاری ضرب لگا کر نور اسلام کو ہمیشہ کے لئے بجھادیں۔ اس کام کے

لئے عرب قبائل کوابھارا اور اپنے تعاون اور مدد کے لئے دعوت دی ۔ طوائف کے یہودی بھی اسلام کے ساتھ جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کرنے کے باوجود چوری چھپے اس آگ کو ہوا دے رہے تھے اورآخر کار اپنے عہد وپیمان کو توڑ کر کفار کے ساتھ تعاون کرنے کا کھل کر معاہدہ کیا ۔جس کے نتیجے میں ۵ھ میں قریش،عربوں کے مختلف قبائل اور طوائف کے یہودیوں پر مشتل ایک بڑااور سنگین لشکر تمام جنگی سازو سامان سے لیس ہو کر مدینہ پر حملہ آور ہوا ۔پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پہلے ہی دشمن کے اس منصوبے سے آگاہ ہو چکے تھے۔اس لئے آپؐ نے اپنے اصحاب سے مشورہ کیا ۔ایک طویل گفتگواور صلاح ومشورہ کے بعد،پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک معزز صحابی سلمان فارسی کی تجویز پر شہر مدینہ کے اردگرد ایک خندق کھودی گئی اور لشکر اسلام نے شہر کے اندر پناہ لی ۔دشمن کی فوجیں جب مدینہ پہنچیں تو انھیں مدینہ کے اندر داخل ہونے کا راستہ نہیں ملا،مجبور ہو کر انہوں نے شہر مدینہ کو اپنے محاصرہ میں لے لیا اور اسی صورت میں جنگ شروع کی ۔جنگ اور محاصرہ کچھ طولانی ہوگیا ۔اسی جنگ میں عرب کا نامور شجاع اور شہسوار عمروبن عبدود،حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھوں قتل ہوا ۔آخر کار طوفان،سردی، محاصرہ کے طولانی ہونے،عربوں کی خستگی اور یہودواعراب کے درمیان اختلاف کے نتیجہ میں محاصرہ ختم ہوا اور کفار کا لشکرمدینہ سے چلا گیا ۔

۴۔جنگ خیبر:جنگ خندق کے بعد،جس کے اصلی محرک یہودی تھے،جنہوں نے کفار عرب کا تعاون کر کے اعلانیہ طورپر اسلام کے ساتھ اپنے معاہدہ کو توڑ دیا تھا،پیغمبر اسلامؐ نے خدا کے حکم سے مدینہ میں موجودیہودی کے قبائل کی گوشالی اور تنبیہ کرنے کے لئے ان کے ساتھ چند جنگیں لڑیں اور یہ سب جنگیں مسلمانوں کی فتحیابی پر ختم ہوئیں ۔ان میں سب سے اہم ''جنگ خیبر'' تھی ۔ خیبر کے یہودیوں کے قبضہ میں چند مستحکم اور مضبوط قلعے تھے اور انکے پاس جنگجوؤں کی ایک بڑی تعداد تھی،جوجنگی سازوسامان سے لیس تھے ۔اس جنگ میں حضرت علی علیہ السلام نے یہودیوں کے نامور پہلوان ''مرحب''کو قتل کر کے یہودیوں کے لشکر کو تہس نہس کر دیا اور اس کے بعد قلعہ پر حملہ کیا اور قلعہ کے صدردروازے کو اکھاڑدیا اور اسطرح اسلام کا لشکر قلعہ کے اندر داخل ہوا اورفتح وظفر کے پرچم کو قلعہ پر لہرادیا ۔اسی جنگ میں،جو۵ھ میں ختم ہوئی حجاز کے یہودیوں کا خاتمہ ہوا ۔

بادشاہوں اور سلاطین کو دعوت اسلام

۶ھ میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کئی بادشاہوں ،سلاطین اور فرمانرواؤں، جیسے:شاہ ایران،قیصر روم،سلطان مصر اور حبشہ کے بادشاہ نجاشی کے نام چند خطوط تحریر فرمائے اور انھیں اسلام کی دعوت دی ۔نصرانیوں اور مجوسیوں کے ایک گروہ نے جزیہ دے کر امن سے رہنے کا وعدہ کیا اور اسطرح اسلام کے ذمہ میںآ گئے ۔آنحضرتؐ نے کفار مکہ سے جنگ نہ کرنے کا ایک معاہدہ کیا ۔اس معاہدہ کے جملہ شرائط میں یہ شرط بھی تھی کہ مکہ میں موجود مسلمانوں کو کسی قسم کی اذیت نہ پہنچائی جائے اور اسلام کے دشمنوں کی مسلمانوں کو نقصان پہنچانے میں مدد نہ کی جائے ۔

لیکن کفار مکہ نے کچھ مدت کے بعد اس معاہدہ کو توڑ دیا ،جس کے نتیجہ میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ کو فتح کرنے کا فیصلہ کیا اور ۸ھ میں دس ہزار کے ایک لشکر کے ساتھ مکہ پر حملہ کیا ۔مکہ کسی جنگ،خونریزی اور مزاحمت کے بغیر فتح کیا اور خانہ کعبہ کو بتوں سے صاف کیا ۔عام معافی کا اعلان فرمایا ۔مکہ کے سرداروں کو۔جنھوں نے بیس سال کے عرصہ میں آپؐ سے کافی دشمنی کی تھی اور آپؐ کے اورآپ کے اصحاب کے ساتھ ناروا سلوک کیا تھا ۔اپنے پاس بلایا اور کسی قسم کی شدت ،برے سلوک اور سختی کے بغیر نہایت مہر بانی اور لطف و کرم سے انھیں معاف فرمایا ۔

۵۔جنگ حنین: پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ کو فتح کرنے کے بعد ،اس کے اطراف منجملہ شہر طائف کو فتح کرنے کے لئے اقدام کیا اور اس سلسلہ میں عربوں سے متعدد جنگیں لڑیں کہ ان میں سے ایک ''جنگ حنین ''ہے۔''جنگ حنین''،پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اہم جنگوں میں سے ہے۔

یہ جنگ فتح مکہ کے کچھ ہی دنوں بعد حنین،میں قبیلہ ہوازن سے ہوی ۔لشکر اسلام نے دوہزار سپاہوں سے ہوازن کے کئی ہزار سواروں کا مقابلہ کیا اور ان کے درمیان ایک گھمسان کی جنگ ہوی۔ہوازن،نے جنگ کے آغاز میں مسلمانوں کو بری طرح شکست

دیدی،یہاں تک کہ حضرت علی علیہ السلام،کہ جن کے ہاتھ میں اسلام کا پرچم تھا ،جو پیغمبر اسلام کے آگے آگے لڑرہے تھے اور چند گنے چنے افراد کے علاوہ سب بھاگ گئے ۔ لیکن کچھ دیر کے بعد ہی پہلے انصاراور پھر دوسرے مسلمان دوبارہ میدان کارزار کی طرف واپس لوٹے اور ایک شدیداور سخت جنگ لڑی اور دشمن کو تہس نہس کر کے رکھ دیا ۔اس جنگ میں دشمن کے پانچ ہزار سپاہی لشکر اسلام کے ہاتھوں اسیر ہوئے ،لیکن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم پر مسلمانوں نے تمام اسیروں کو آزاد کردیا ،صرف چند افراد ناراض تھے کہ آنحضرت نے ان کے حصے میں آئے افراد کو پیسے دیکر خرید لیا اور پھر انہیںآزاد کر دیا ۔

٦۔جنگ تبوک:پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ۹ ہجری میں قیصر روم سے جنگ کرنے کی غرض سے تبوک پر لشکر کشی کی(تبوک شام او رحجازکی سرحدپر ایک جگہ ہے)کیونکہ افواج پھیلی تھی کہ قیصر روم نے اس جگہ پر رومیوں اور اعراب کے ایک لشکر کو تشکیل دیا ہے ۔ جنگ موتہ بھی اس کے بعد رومیوں کے ساتھ وہیں پر لڑی گئی جس کے نتیجہ میں جعفر بن ابیطالب، زید بن حارثہ اور عبداللہ بن رواحہ جیسے اسلامی فوج کے سردار شہید ہوئے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے تیس ہزار سپاہیوں کے ساتھ تبوک پر حملہ کیا لیکن اسلامی لشکر کے پہنچنے پر وہاں موجود افراد بھاگ گئے تھے۔آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم تین دن تبوک میں ٹھہرے ۔ اس کے اطراف کی پاک سازی کرنے کے بعد واپس مدینہ لوٹے۔

اسلام کی دوسری جنگیں:پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مذکورہ جنگوں کے علاوہ مدینہ منورہ میں اپنے دس سالہ قیام کے دوران تقریبا اَسی چھوٹی بڑی جنگیں لڑی ہیں، جن میں سے ایک چوتھائی جنگوں میں آپؐ نے بذات خود شرکت فرمائی۔

آنحضرتؐ نے جن جنگوں میں شرکت فرمائی ،دوسرے کمانڈروں کے بر خلاف کہ وہ پناہ گاہ میں بیٹھ کر فرمان جاری کرتے ہیں ،آپؐبذات خودسپاہیوں کے شانہ بہ شانہ لڑتے تھے ،لیکن کسی کو ذاتی طور پر قتل کرنے کا آپؐ کے لئے کبھی اتفاق پیش نہیں آیا ۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معنوی شخصیت کا ایک جائزہ

مستند تاریخی اسناد کے مطابق، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک ایسے ماحول میں پرورش پائی تھی جو جہالت، فساد اور خلاقی برائیوں کے لحاظ سے بدترین ماحول تھا ۔ آپ نے ایک ایسے ہی ماحول میں کسی تعلیم وتربیت کے بغیر اپنے بچپن اور جوانی کے ایام گزارے تھے ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اگر چہ ہرگز بت پرستی نہیں کی اور خلاف انسانیت کاموں میں آلودہ نہیں ہوئے ، لیکن آپؐ ایسے لوگوں میں زندگی گزار رہے تھے کہ کسی بھی صورت میں آپؐ کی زندگی سے اس قسم کے روشن مستقبل کا اشارہ تک نہیں ملتا تھا، سچ یہ ہے کہ ایک غریب ونادار یتیم اور کسی سے تعلیم وتربیت حاصل نہ کرنے والے شخص سے یہ سب برکتیں قابل یقین نہیں تھیں ۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی حالت میں ایک زمانہ گزارا، یہاں تک کہ انہی راتوں میں سے ایک رات کو جب آپؐ اپنے آرام ضمیر اور خالی ذہن کے ساتھ عبادت میں مشغول تھے ، اچانک اپنے آپ کو ایک دوسری شخصیت میں پایا ۔ آپکی پوشیدہ باطنی شخصیت ایک آسمانی شخصیت میں تبدیل ہو گئی ، انسانی معاشرے کے ہزاروں سال پہلے کہ افکار کو خرافات سمجھا اور دنیا والوں کی روش اور دین کو اپنی حقیقت پسندانہ نگاہوں سے ظلم وستم کے روپ میں دیکھا ۔

دنیا کے ماضی اور مستقبل کو آپس میں جوڑ دیا ، سعادت بشری کی راہ کی تشخیص کر دی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھ اور کان نے حق وحقیقت کے علاوہ نہ کچھ دیکھا اور نہ کچھ سنا ، آپؐ کی زبان کلام خدا سے پیغام آسمانی اور حکمت وموعظہ کے لئے کھل گئی، اندرونی ضمیر جو تجارت ، لین دین اور روزہ مرہ کی مصلحتوں میں سر گرم تھا ، وہ دل و جان سے دنیا اور دنیا والوں کی اصلاح اور بشر کی ہزاروں سال کی گمراہی اور ظلم وستم کو ختم کرنے پر اتر آیا اور حق وحقیقت کو زندہ کرنے کے لئے تن تنہا قیام کیا اور دنیا کی وحشتناک متحد مخالف طاقتوں کی کوئی پروا نہ کی معارف الٰہیہ کو بیان کیا اور کائنات کے تمام حقائق کا سرچشمہ خالق کائنات کی وحدانیت کو سمجھا ۔ انسان کے اعلیٰ اخلاق کی بہترین تشریح فرمائی اور ان کے روابط کو کشف اور واضح کیا، جو بیان فرماتے تھے خود دوسروں سے پہلے

اس کے قائل ہوتے تھے اور جس چیز کی ترغیب فرماتے تھے، پہلے خود اس پر عمل کرتے تھے ۔ شریعت اور احکام ،جو عبادتوں اور پرستشوں کے ایک مجموعہ پر مشتمل ہیں ،وہ خدائے یکتا کی عظمت وکبریائی کے سامنے بندگی کوایک اچھے انداز میں پیش کرتے ہیں ۔اس کے علاوہ عدلیہ اور تعزیرات سے متعلق دوسرے قوانین بھی لائے ،کہ جو انسانی معاشرے کے تمام ضروری مسائل کا اطمینان بخش جواب دیتے ہیں ،وہ ایسے قوانین ہیں جو آپس میں مکمل طور پر ایک دوسرے سے مرتبط ہیں اور توحید،انسانی احترام و عالی اخلاق کی بنیاد پر استوار و پائدار ہیں ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی لائی ہوئی عبادات ومعاملات پر مشتمل قوانین کا مجموعہ،اس قدر وسیع اور جامع ہے کہ عالم بشریت میں انفرادی واجتماعی زندگی کے تمام مسائل موجود ہیں اور زمانہ کے گزرنے کے ساتھ ساتھ پیش آنے والی گوناگوں ضرورتوں کی تحقیق کر کے تشخیص کا حکم دیتا ہے ۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے دین کے قوانین کو عالمی اورابدی جانتے ہیں ،یعنی آپکا اعتقاد ہے کہ آپؐ کا دین تمام انسانی معاشروں کی دنیوی واخروی ضرورتوں کو ہر زمانے میں پورا کرسکتا ہے،اور لوگوں کو اپنی سعادت کے لئے اسی روش کو اختیار کرنا چاہئے ۔

البتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس بات کو عبث اور مطالعہ کے بغیر نہیں فرمایا ہے،بلکہ خلقت کی تحقیق اور عالم انسانیت کے مستقبل کی پیشینگوئی کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں ۔دوسرے الفاظ میںیہ کہا جائے کہ: اولاً :اپنے قوانین اورانسان کی جسمی اور روحی خلقت کے درمیان مکمل توافق وہم آہنگی کو واضح کردیا ۔ثانیا : مستقبل میں رونما ہونے والی تبدیلیوں اور مسلمانوں کے معاشرے کو پہنچنے والے نقصانات کو مکمل طور پر مد نظر رکھنے کے بعد اپنے دین کے احکام کے ابدی ہونے کا حکم فرمایا ہے ۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جو پیشنگوئیاں قطعی دلیلوں کے ذریعہ ہم تک پہنچی ہیں،ان کے مطابق آپؐ نے اپنی رحلت تک کے عمومی حالات کی تشریح فرمائی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان معارف کے اصولوں اور شرائط کوپراکندہ طور پر قرآن مجید میں لوگوں کے لئے تلاوت فرمائی ہیں کہ اس کی حیرت انگیز فصاحت وبلاغت نے عرب دنیا کے فصاحت وبلاغت کے اساتذہ اور ماہروں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا اور دنیا کے دانشمندوں کے افکار کو متحیر کر کے رکھدیا ہے ۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان تمام کارناموں کو ۲۳ سال کے عرصہ میں انجام دیا ہے کہ جن میں سے ۱۳سال جسمانی اذیت ،اور کفار مکہ کی ناقابل برداشت مزاحمتوں میں گزارے اور باقی دس سال بھی جنگ ،لشکر کشی، کھلم کھلا دشمنوں کے ساتھ بیرونی مقابلہ اور منافقین اور روڑے اٹکانے والوں کے ساتھ اندرونی مقابلہ اور مسلمانوں کے امورکی باگ ڈور سنبھالنے میں اوران کے عقائد واخلاق واعمال اور ہزاروں دوسری مشکلات کی اصلاح کرنے میں گزارے ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ پورا راستہ ایک ایسے غیر متزلزل ارادہ سے طے کیا،جو حق کی پیروی اور اسے زندہ کرنے کے لئے تھا ۔آپؐ کی حقیقت پسندانہ نظر صرف حق پر ہوتی تھی اور خلاف حق کو کوئی اہمیت نہیں دیتی تھی۔اگرکسی چیز کواپنے منافع کے یا میلانات اور اپنے عمومی جذبات کے موافق پاتے تھے تو ان میں سے جس کو حق جانتے اسے قبول فرماتے اور اسے مسترد نہیں کرتے تھےاورجس کو باطل سمجھتے تھے اسے مسترد کر دیتےاور ہرگز قبول نہیں کرتے تھے ۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غیر معمولی معنوی شخصیت

اگرہم انصاف سے مذکورہ مطالب پر تھوڑاسا غور وخوص کریں گے،توکسی شک وشبہہ کے بغیر یہ قبول کرنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ ان حالات اور ماحول میں ایسی شخصیت کا پیدا ہونا معجزہ اور خدائے متعال کی خاص تائید کے علاوہ کچھ نہیں تھا ۔اس لحاظ سے ،خدائے متعال اپنے کلام پاک میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے امی ہونے یتیمی اور سابقہ مفلسی کے بارے میں یاد دہانی کراتا ہے ،اور ان کو عطا کی گئی شخصیت کوایک آسمانی معجزہ شمار کرتا ہے اوراسی سے آپکی دعوت کی حقانیت کا استدلال کرتا ہے چنانچہ فرماتا

ہے: (الم یجدک یتیما فآوی *و وجدک ضالآ فھدیٰ * و وجدک عائلًا فاغنی[1]) ''کیا اس نے تم کو یتیم پاکر پناہ نہیں دی ہے ؟اور کیا تم کوگم گشتہ پاکر منزل تک نہیں پہنچایا ہے؟اور تم کو تنگ دست پاکر غنی نہیں بنایا ہے؟'' (وماکنت تتلوا من قبلہ من کتاب ولا تخطہ بیمینک[2]) ''اور اے پیغمبر!آپ اس قرآن سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے کچھ لکھتے تھے''...

(وان کنتم فی ریب مما نزّلنا علی عبدنا فاتو بسورۃٍ من مثلہ[3]) ''اگر تمھیں اس کلام کے بارے میں کوئی شک ہے جسے ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے تو اس کا جیسا ایک ہی سورہ لے آؤ''..

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت

تنہا اصل جس پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خدا کے حکم سے اپنے دین کی بنیاد رکھی اور اسے دنیا والوں کے لئے سعادت کا سبب قرار دیا،وہ توحید کی اصل ہے ۔توحید کی اصل کے مطابق،جوخالق کائنات پرستش کا سزاوار ہے وہ خدائے یکتا ہے ،اور خدائے متعال کے علاوہ کسی اور کے لئے سر تعظیم خم نہیں کیا جاسکتا ۔

اس بناپر ،انسانی معاشرہ میں جوروش عام ہونی چاہئے،وہ یہ ہے کہ سب آپس میں متحد اور بھائی بھائی ہوں اور کوئی اپنے لئے خدا کے سواکسی کو بلا قید وشرط حاکم مطلق قرار نہ دے،چنانچہ خدائے متعال فرماتا ہے: (قل یااہل الکتاب تعالوا الی کلمۃٍ سواء بیننا وبینکم الا نعبد الااللہ ولا نشرک بہ شیئا ولایتخذ بعضنا بعضا ارباباً من دون اللہ[4]) ''اے پیغمبر !آپ کہدیں کہ اہل کتاب !آؤایک منصفانہ کلمہ پر اتفاق کر لیں کہ خدا کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کریں،کسی کو اس کا شریک نہ بنائیں آپس میں ایک دوسرے کو خدائی کا درجہ نہ دیں''...اس آسمانی حکم کے مطابق،آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی سیرت میں سبھی کو برابر وبرادر قرار دیتے تھے اور احکام وحدودالہیٰ کے

---

[1] ضحی،۶۔۸
[2] عنکبوت،۴۸
[3] بقرہ،۲۳
[4] آل عمران،۶۴

نفاذ میں ہرگز امتیازی سلوک اور استثنا کے قائل نہیں تھے ،اس طرح اپنے اور پرائے ،طاقت ور اور کمزور،امیر وغریب اور مرداورعورت میں فرق نہیں کرتے تھےاور ہرایک کے حق کو دین کے احکام وقوانین کے مطابق اس تک پہنچاتے تھے ۔

کسی کو کسی دوسرے پر حکم فرمائی اور فرمانروائی اور زبردستی کرنے کا حق نہیں تھا ۔لوگ قانون کے حدود کے اندر زیادہ سے زیادہ آزادی رکھتے تھے ۔(البتہ قانون کے مقابلہ میں آزادی نہ صرف اسلام میں بلکہ دنیا کے اجتماعی قوانین میں بھی کوئی معنی نہیں رکھتی ہے)آزادی اور اجتماعی عدالت کی اسی روش کے بارے میں خدائے متعال اپنے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تعارف کراتے ہوئے فرماتا ہے: (الّذین یتّبعون الرّسول النبیّ الامیّ الذی یجدونہ مکتوباً عندہم فی التوریۃ والانجیل یامرہم بالمعروف وینہٰہم عن المنکر و یحلّ لہم الطیبت ویحرّم علیہم الخبٰئث ویضع عنہم اصرہم والاغلل التی کانت علیہم فالذین امنوا بہ وعزّروہ ونصروہ واتّبعوا النّور الذی انزل معہ اولئک ہم المفلحون*قل یا ایہا النّاس انّی رسول اللّہ الیکم جمیعا[1])''جو لوگ رسول نبی امی کا اتباع کرتے ہیں کہ،جس کا ذکر اپنے پاس توریت اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں کہ وہ نیکیوں کا حکم دیتا ہے اور برائیوں سے روکتا ہے اور پاکیزہ چیزوں کو حلال قرار دیتا ہے اور خبیث چیزوں کو حرام قرار دیتا ہے اور ان پرسے احکام کے سنگین بوجھ اور قید وبند کو اٹھا دیتا ہے پس جولوگ اس پر ایمان لائے،اس کا احترام کیا ،اس کی امداد کی اوراس نور کا اتباع کیا جواس کے ساتھ نازل ہوا ہے وہی درحقیقت فلاح یافتہ اور کامیاب ہے • پیغمبر !کہدو اے لوگو!میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول اور نمائندہ ہوں''...یہاں پر معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی زندگی میں اپنے لئے کسی قسم کا امتیاز نہیں برتتے تھے اور ہر گز وہ شخص جو پہلے سے آپکو نہیں جانتا تھا ،اس میں اور دوسروں میں امتیاز نہیں برتا جاتا تھا ۔آپؐاپنے گھر کا کام خودانجام دیتے تھے،ہرایک کو ذاتی طور پر شرف یابی بخشتے تھے، حاجتمندوں کی باتوں کوخود سنتے تھے،تخت اور صدر محفل کی جگہ پر نہیں بیٹھتے تھے ۔راستہ چلتے وقت جاہ وحشم اور سر کاری تکلفات سے نہیں چلتے تھے ۔اگر کوئی مال آپؐ کے ہاتھ میں آتا تو اپنے ضروری مخارج کے علاوہ باقی مال کو فقرا میں تقسیم

---

[1] اعراف۱۵۷،۱۵۸

کرتے تھے اور کبھی اپنی ضرورت کی اشیاء کو بھی حاجتمندوں میں تقسیم کر کے خود بھوکے رہتے تھے اور ہمیشہ فقیرانہ زندگی گزارتے تھے اور فقراء کے ساتھ ہم نشیں ہوتے تھے ،لوگوں کے حقوق کی دادرسی میں کبھی غفلت اور لاپر وائی نہیں کرتے تھے ،لیکن اپنے ذاتی حقوق میں زیادہ تر عفو و بخشش سے کام لیتے تھے ۔جب فتح مکہ کے بعد قریش کے سرداروں کو آپؐ کی خدمت میں حاضر کیا گیا ،توآپؐنے کسی قسم کی تندی اور سختی کا مظاہرہ نہیں کیا بلکہ سبھی کو عفو کیا ،جبکہ ہجرت سے پہلے انہوں نے مستقل آپؐپر ظلم کئے تھے اور ہجرت کے بعد بھی فتنے برپا کر کے آپؐکے ساتھ خونین جنگیں لڑی تھیں ۔آپؐاورآپؐ کے اہل بیتؑ پر خدا کا درودو سلام ہو۔

بخوبی جان لینا چاہئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دین اور توحید کے نشر کے علاوہ کوئی مقصد نہیں رکھتے تھے ،اور اچھے اخلاق ،خندہ پیشانی اور واضح ترین استد لال وبرہان سے لوگوں کو توحید کی دعوت دیتے تھے اور اپنے اصحاب کو بھی اسی روش پر عمل کرنے کی نصیحت فر ماتے تھے ،چنانچہ خدائے متعال آپؐکواس طرح حکم فر ماتا ہے:(قل ہذہ سبیلی ادعوا الی اللہ علی بصیرۃ انا و من اتبعنی[1]) '' آپ کہد یجئے کہ یہ میرا راستہ ہے کہ میں بصیرت کے ساتھ خدا کی طرف دعوت دیتا ہوں اور میرے ساتھ میرا اتباع کرنے والا بھی ہے'' آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس امر کی طرف انتہائی توجہ رکھتے تھے کہ اسلامی معاشرہ میں ہر فرد (اگرچہ غیر مسلمان اور اسلام کے ذمہ دار میں ہو)اپنا حق حاصل کرے اور الٰہی قوانین کے نفاذ میں کسی قسم کا استثنا پیدا ہونے نہ پائے اور حق و عدل کے سامنے سب مساوی ہوں،کوئی کسی پر (تقویٰ کے علاوہ)کسی قسم کا امتیاز نہ جتلائے اورمال ودولت یاحسب ونسب اور عام قدرت کے بل بوتے پر کسی پر ترجیح حاصل کرنے کی کوشش نہ کرے،فخر نہ جتائے اور معاشرے کے مالدار لوگ کمزوروں اور محتاجوں پر زبر دستی نہ کریں اور اپنے ماتحتوں پر ظلم نہ کریں ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود بھی فقیرانہ زندگی بسر کرتے تھے ،اور اٹھنے بیٹھنے اور راستہ چلنے میں ہر گز تکلفات سے کام نہیں لیتے تھے ۔اپنے گھریلو کام بھی انجام دیتے تھے،آپؐکے پاس محافظ ونگہبان نہیں تھے ۔لوگوں کے درمیان عام شخص جیسے لگتے تھے

---

[1] یوسف،۱۰۸

،جب لوگوں کے ہمراہ چلتے تھے تو کبھی آگے نہیں بڑھتے تھے، جب کسی محفل میں داخل ہوتے تو نزدیک ترین خالی جگہ پر بیٹھ جاتے،اصحاب کو نصیحت فرماتے تھے کہ دائرے کی صورت میں بیٹھیں تاکہ محفل صدرنشین کی حالت پیدا نہ کرے،جس کو دیکھتے ، چاہے عورت ہو یا بچہ سب کو سلام کرتے تھے ۔

ایک دن آپؐ کا ایک صحابی آپؐ کے سامنے خاک پر گر کر سجدہ کرنا چاہتا تھا توآپؐ نے فرمایا:کیا کر رہے ہو؟یہ قیصرو کسریٰ کی روش ہے اور میری شان پیغمبری اور بندگی ہے،آپؐ نے اپنے صحابیوں کو نصیحت فرماتے تھے کہ حاجتمندوں کی حاجتوں اور کمزوروں کی شکایتوں کو مجھ تک ضرور پہنچائیں اوراس سلسلہ میں کوتاہی نہ کریں۔کہا جاتا ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو آخری نصیحت لوگوں کو کی وہ غلاموں اور عورتوں کے بارے میں تھی ۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت کے بارے میں چند نکات

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے نیک اخلاق میں دوست ودشمن میں معروف ومشہور تھے۔آپؐکے حسن اخلاق کا یہ عالم تھا کہ،ظالم دشمنوں اورنادان دوستوں کی بد اخلاقی اورآزار و بے ادبی وجسمانی اذیتوں کے باوجود آپ کی تیوری پر بل نہ آتے تھے اورناراضگی کا اظہار نہیں کرتے تھے۔سلام کرنے میں عورتوں بچوں اور ماتحتوں پر سبقت کرتے تھے ۔جب آپؐکو خدا کی طرف سے دین کی تبلیغ اور لوگوں کی رہبری کرنے کی ذمہ داری ملی ،توآپؐنے فریضہ کی انجام دہی میں ایک لمحہ بھی کوتاہی نہیں کی اور اپنی انتھک کوششوں کی بنا پر کبھی آرام سے نہیں بیٹھے ۔ہجرت سے تیرہ سال پہلے مکہ میں،مشرکین عرب کی طرف سے ناقابل برداشت مشکلات اوراذیتوں کے باوجود عبادت ودین خدا کی تبلیغ میں مسلسل مشغول رہتے تھے۔ہجرت کے بعد دس سال کے دوران بھی دین کے دشمنوں کی طرف سے روزبروز مشکلات اور یہودیوں اور مسلمان نمامنا فقوں کی طرف سے روڑے اٹکا ئے جاتے رہے۔معارف دین اور قوانین اسلام کو حیرت انگیز وسعت کے ساتھ لوگوں تک پہنچایا دشمنان اسلام سے ۸۰ سے زیادہ جنگیں لڑیں اس کے علاوہ اسلامی معاشرے کی باگ ڈور ۔جو ان دنوں تمام جزیرۂ نما عرب پر پھیلا ہوا تھا ۔آپؐکے ہاتھوں میں تھی ،یہاں تک کہ

لوگوں کی چھوٹی سے چھوٹی شکایتوں اور ضرورتوں کو بھی کسی رکاوٹ کے بغیر خود بر طرف فرماتے تھے۔پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شجاعت اور شہامت کے بارے میں اتنا ہی کافی ہے کہ آپؐنے اس وقت تن تنہا حق کی دعوت کا پرچم بلند کیا ،جبکہ دنیا بھر میں ظلم وزبردستی اور حق کشی کے علاوہ حکومت نہیں کی جا سکتی تھی آپؐنے وقت کے ظالموں سے بے انتہا جسمانی اذیتیں اور تکلفیں اٹھائیں ،لیکن یہ سب چیزیں آپؐ کے عزم وارادے میں سستی اور کمزوری پیدا نہ کرسکیں اورآپ نے کسی جنگ میں پیٹھ نہیں دکھائی ۔پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہایت پاکیزہ نفس کے مالک تھے ، فقیرانہ لباس پہنتے تھے اور سادہ زندگی گزارتے تھے،آپ ؐکے اورنوکروں وغلاموں کے درمیاں کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا ،آپؐ کے پاس کافی مال ومنال آتا تھا لیکن اسے مسلمان فقراء میں تقسیم کرتے تھے ،تھوڑی مقدار میں اپنی اور اپنے اہل وعیال کی زندگی کے لئے لیتے تھے۔

بعض اوقات کئی دنوں تک آپؐ کے گھر سے دھواں نہیں اٹھتا تھا اورپکا ہوا کھانا نصیب نہیں ہوتا تھا ۔زندگی میں صفائی خاص کر عطر کو بہت پسند فرماتے تھے ۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی اپنی حالت نہیں بدلی ،جو تواضع و فروتنی آپؐ کی ابتدائی زندگی میں تھی وہی آخر تک رہی اور اس گراں قدر حیثیت کے مالک ہونے کے باوجود،ہر گز اپنے لئے ایسے امتیاز کے قائل نہ ہوئے جس سے آپکی اجتماعی قدر و منزلت دکھائی دیتی ۔آپؐ کبھی تخت پر نہیں بیٹھے، محفل کی صدر نشین کو کبھی اپنے لئے مخصوص نہ کیا ،راستہ چلتے وقت کبھی دوسروں سے آگے نہیں بڑھے اور کبھی حکمراں اور فرمانروا کا قیافیہ اختیار نہیں کیا ۔ جب اپنے اصحاب کے ساتھ کسی عام محفل میں تشریف فرما ہوتے تھے ،تو اگر کوئی اجنبی شخص آپؐسے ملاقات کے لئے آجاتا تھا تو وہ آپکو نہیں پہچان پاتا تھا اوروہاں پر موجود لوگوں سے مخاطب ہو کر کہتا تھا :آپ میں کون شخص پیغمبر خداؐ ہے ؟پھر لوگ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تعارف کراتے تھے۔پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی پوری زندگی میں کسی کو گالی نہیں دی اور کبھی بیہودہ کلام نہیں کیا،کبھی قہقہہ لگا کر نہیں ہنسے اور ،کوئی ہلکا اور بے فائدہ کام انجام نہ دیا ۔غور وخوض کو پسند فرماتے تھے ،ہردردمند کی بات اور ہرایک کا اعتراض سنتے تھے ،پھر جواب دیتے تھے ،کبھی کسی کی بات نہیں کاٹتے تھے ،آزاد تفکر میں رکاوٹ نہیں بنتے تھے ،لیکن اشتباہ

کرنے والے کو اشتباہ کو واضح کر کے اس کے اندورونی زخم پر مرہم لگاتے تھے ۔پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مہربان اور انتہائی نرم دل تھے ،ہر مصیبت زدہ کی مصیبت کو دیکھ کر رنجیدہ ہوتے تھے ،لیکن بدکاروں اور مجرموں کو سزا دینے میں نرمی نہیں کرتے تھے اور سزا کو جاری کرتے وقت اپنے اور پرایے اور بیگانہ وآشنا میں کوئی فرق نہیں کرتے تھے ۔ایک انصاری کے گھر میں چوری ہوئی تھی ،اس سلسلہ میں ایک یہودی اور ایک مسلمان ملزم ٹھہرائے گئے ۔انصار کی ایک بڑی جماعت آنحضرتؐ کے پاس آئی اور دباؤڈالا کہ مسلمانوں خاص کر انصار کی آبرو بچانے کے لئے ،صرف یہودی کو سزادی جائے ۔کیونکہ انصار کے ساتھ یہودیوں کی کھلم کھلادشمنی تھی ۔لیکن آنحضرتؐ نے حق کو ان کی مرضی کے برخلاف ثابت کیا یہودی کی آشکارا طور پر حمایت کی اور مسلمان کو سزا سنادی ۔

جنگ بدر کی پکڑ دھکڑ کے دوران مسلمانوں کی صفوں کو منظم کرتے ہوئے جب آنحضرت ایک سپاہی کے پاس پہنچے جو تھوڑا سا آگے تھا ،تو آپ نے اپنے عصا سے اس سپاہی کے پیٹ پر رکھ کر تھوڑا سا ڈھکیلا تاکہ پیچھے ہٹے اور صف سیدھی ہو جائے ۔سپاہی نے کہا : یارسول اللہ !خدا کی قسم میرے پیٹ میں درد ہونے لگا ۔میں آپؐ سے قصاص لوں گا ۔آنحضرتؐ نے اپنے عصا کو اس کے ہاتھ میں دیدیا ،اور اپنے شکم سے لباس ہٹادیا اور فرمایا آؤ قصاص لے لو ۔سپاہی نے بڑھ کر آنحضرتؐ کے شکم مبارک کو چوما اور کہا :''میں جانتا ہوں کہ آج قتل کیا جاؤں گا ،میں اس طرح آپؐ کے بدن مقدس کا بوسہ لینا چاہتا تھا''[1] اس کے بعد اس سپاہی نے دشمن پر حملہ کیا اور تلوار چلائی یہاں تک کہ شہید ہوگیا ۔

مسلمانوں کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وصیت

عالم بشریت ،کائنات کے دوسرے ان تمام اجزاء کے مانند تغیر وتبدل کی حالت میں ہے کہ جس کا ہم مشاہدہ کرتے ہیں۔اور لوگوں کی بناوٹ میں جو اختلاف پایا جاتا ہے اس کی وجہ سے انسان میں مختلف سلیقے وجود میںآئے ہیں کہ جن کے نتیجہ میں لوگ ،فہم وادراک کی

---

[1] طبری ،تاریخ ،ج ۲،ص۱۴۹

تیزی وکندی ،حفظ اورافکار کی فراموشی میں مختلف ہیں ۔اس لحاظ سے ،عقائد اوراسی طرح رسومات اور ایک معاشرہ میں جاری قوانین کی ایک پائدار بنیاد کی حفاظت کے لئے اگر باایمان وقابل اعتماد نگہبان ومحافظ نہ ہوں،تووہ تھوڑی ہی مدت کے بعد تغیر وتبدل اور انحراف کا شکار ہو کر نابود ہو جائیں گے ۔مشاہدہ اور تجربہ ہمارے لئے اس مسئلہ کو واضح ترین صورت میں ثابت کرتا ہے ۔پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے عالمی اورابدی دین کو درپیش خطرے سے بچانے کے لئے پائدارو محکم سند اور باصلاحیت محافظ کے طورپرکتاب خدا اور اپنے اہل بیت علیہم السلام کو لوگوں کے کے سامنے پیش کیا چنانچہ شیعہ اور سنی راویوں نے تواتر کے ساتھ نقل کیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بار ہا فرمایا :''میں اپنے بعد،خدا کی کتاب اور اہل بیت،کو تم لوگوں میں چھوڑ رہا ہوں،یہ دونوں کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے،جب تک تم لوگ ان سے متمسک رہوگے،گمراہ نہیں ہوگے[1]۔

پیغمبراسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت اور جانشینی کا مسئلہ

وہ آخری شہر،جس کا فتح ہونا اسلام کے جزیرۂ نما عرب پر تسلط جانے کا سبب بنا،شہر ''مکہ'' تھا،کہ جہاں پر حرم خدا اور کعبہ ہے ۔یہ شہر ۸ھ میں اسلامی لشکر کے ہاتھوں فتح ہوا اور اس کے فوراہی بعد شہر طائف بھی فتح ہوا ۔۱۰ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فریضہ حج انجام دینے کے لئے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے ۔حج کے اعمال اور لوگوں تک ضروری تعلیمات پہنچانے کے بعد مدینہ روانہ ہوئے ۔راستہ میں ''غدیر خم ''نامی ایک جگہ پر قافلہ کو آگے بڑھنے سے روکنے کا حکم فرمایا اور مختلف علاقوں سے آئے ہوئے ایک لاکھ بیس ہزار حاجیوں کے درمیان حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھ کو پکڑ کر بلند کیا اور تمام لوگوں میں حضرت علیؑ کی ولایت اور جانشینی کا اعلان فرمایا ۔پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس اقدام سے اسلامی معاشرہ میں والی کا مسئلہ۔کہ جو اسلامی معاشرہ میں مسلمانوں کے امورپر ولایت رکھتا ہے اور کتاب وسنت اور دینی معارف اور قوانین کی حفاظت کرتاہے۔حل ہوا اور آیۂ

---

[1] (انی تارک فیکم الثقلین !کتاب اللہ وعترتی اہل بیتی !ما ان تمسکتم بہمالن تضلوابعدی ابداوانہمالن یفترقا حتی یرداعلی الحوض) (غایۃ المرام،ص۲۱۲الغدیر،ج۱،ص۵۵)

شریفہ: (یا ایہا الرّسول بلّغ ما انزل الیک من ربّک وان لم تفعل فا بلغت رسالتہ[1]) کا حکم نافذ ہوا ۔پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ لوٹے، ستر دن کے بعد، تقریبا ۲۸ ماہ صفر ۱۱ھ کو رحلت فرمائی ۔

قرآن مجید، نبوت کی سند

سب سے بڑی دلیل کہ جس کو پیغمبر اکرمؐ نے سند نبوت کے طور پر پیش کیا ہے نیز معارف اسلام یعنی اصول و فروع کے لئے ماخذ و مصدر ہے کہ جس پر سب سے زیادہ اعتماد کیا جاتا ہے وہ کتاب آسمانی یعنی قرآن مجید ہے ۔قرآن مجید ،خدائے متعال کے کلام اور خطاب کا ایک مجموعہ ہے ،جو مقام کبریائی کی عزت و عظمت کے مصدر سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا اور اس کے ذریعہ راہ سعادت کی نشاندہی کی گئی ۔قرآن مجید عالم بشریت کو ایسے علمی و عملی احکام و قوانین کی نشاندہی کرتا ہے کہ جن پر عمل کر کے انسان دنیا وآخرت کی سعادت حاصل کر سکتا ہے ۔

قرآن مجید پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کا معجزہ ،حجت اور ایک ایسی سند وثبوت ہے جو دشمن کو ہر جہت سے عاجز اور کمزور بنا دیتا ہے اور ہر قسم کے عذر، اعتراض، نزاع اور لڑائی جھگڑے کے راستہ کو اس کے لئے بند کردیتا ہے اور اپنے مقاصد کوواضح ترین صورت میں ثابت کرتا ہے ۔قرآن مجید اپنے مقاصد میں لوگوں کو آنکھیں بند کر کے تقلید کرنے کی دعوت دینے کے بجائے اس کے ساتھ عام اور خدادادمنطق کی زبان میں بات کرتا ہے اور کچھ معلومات کی یاد دہانی کرتا ہے، جنھیں انسان خواہ نخواہ اپنی فطرت سے درک کرتا ہے ،اوریاد دہانی کراتاہے کہ انسان کبھی ان کو قبول کرنے اور اعتراف کرنے سے پہلو تہی نہیں کرسکتا ہے۔خدائے متعال فرماتا ہے: (إنہ لقول فصل *وماھو بالھزل[2]) ''بیشک یہ قول فیصل ہے اور مذاق نہیں ہے ۔''قرآن مجید ایک مطلب کو بیان کرتا ہے ،جہاں تک اس کی دلالت کی شعاعیں پھیلتی ہیں، ہمیشہ اور سبھی کے لئے زندہ وپایندہ ہے ،نہ لوگوں کی معمولی باتوں کے مانند بعض جہات سے فہم وتفکر کے ذریعہ اس پر احاطہ کیا جاسکتا ہے اور بعض لحاظ سے غفلت اور لاپر وائی کا اس میں

---

[1] مائدہ ،۶۷
[2] طارق،۱۳،۱۴

امکان ہو،بلکہ یہ ایسے خدائے متعال کا کلام ہے جو ہرظاہروباطن اور مصلحت ومفسدہ سے آگاہ ہے ۔اس لحاظ سے ہر مسلمان پر لازم ہے کہ اپنی حقیقت پسندانہ آنکھوں کو کھول دے اور ہمیشہ ان دوآیۂ شریفہ کو مد نظر رکھے ،خدا کے کلام کو زندہ اور پائندہ جانے ۔اورجو دوسروں نے سمجھ کر بیان کیا ہے ،اس پر اکتفانہ کرے ،آزادفکر کے راستے کواپنے اوپر بند نہ کرے، کیونکہ یہ انسانیت کا تنہا خصوصی سرمایہ ہےاور قرآن مجید اس پر عمل کرنے کی بہت تاکید کرتا ہے ۔

قرآن مجید ہمیشہ اور سبھی کے لئے قول فیصل اور ایک زندہ حجت ہے اوریہ کتاب کسی خاص گروہ کے فہم تک محدود و منحصرنہیں ہو سکتی ہے،خدائے متعال فرماتا ہے: (ولایکونوا کالذّین اوتوا الکتٰب من قبل فطال علیھم الامد فقست قلوبھم[1]) ’’اوروہ (مسلمان)ان اہل کتاب کی طرح نہ ہو جائیں ،جنھیں کتاب دی گئی توایک عرصہ گزرنے کے بعد ان کے دل سخت ہوگئے‘‘ قرآن مجید لوگوں سے چاہتا ہے کہ وہ اپنی فطرت کی طرف پلٹیں ،حق کو قبول کریں ،یعنی پہلے اپنے آپ کو بلا قید و شرط حق کو قبول کرنے پرآمادہ کریں اور جب دیکھیں کہ یہ حق ہے اور ان کی دنیوی واخروی سعادت ومنافع اسی میں ہے ،تو شیطانی وسوسوں اور ہواوہوس کی آواز کی طرف کان دھرے بغیر اسے قبول کریں ۔اس کے بعد،اسلامی معارف کو اپنے زندہ شعور کے سپرد کریں ،اگر دیکھیں کہ یہ حق ہےاور انھیں قبول کرکے ان پر عمل کرنے میں ان کے لئے حقیقی مصلحت وآسودگی ہے تو ان کے سامنے تسلیم ہو جائیں اور البتہ اس صورت میں انسانی معاشرے میں عام ہونے والی زندگی کی روش اور دین،ایسے ضوابط اور احکام ہوں گے جنھیں انسان اپنے فطری میلانات کے تحت چاہتا ہے ۔آخر ایک یکسان روش ہوگی جس کے تمام اجزاء ومواد انسان کی خصوصی بناوٹ سے مکمل ہم آہنگ ہوں گے اورتضادوتناقض سے مکمل طورپر دور ہوں گے،نہ ایک ایسی متضاد روش جو کہیں پر معنویات سے وجود میں آتی ہو اور کہیں پر مادیات سے اور کہیں عقل سلیم کے موافق ہو اور بعض مواقع پر ہواہوس کے تابع ہو ۔

[1] حدید ,١۶

خدائے متعال قرآن مجید کی توصیف میں فرماتا ہے: (یہدی الی الحق والی طریق مستقیم "[1] (یہ کتاب) حق وانصاف اور سیدھے راستہ کی طرف ہدایت کرنے والی ہے'' نیز فرماتا ہے: (ان ہذا القرآن یہدی للّتی ہی اقوم[2]) ''بیشک یہ قرآن اس راستہ کی طرف ہدایت کرتا ہے جو بالکل سیدھا ہے''۔۔ایک دوسری آیت میں اسلام کی اس توانائی کے سبب کو اسلام کے انسان کی خلقت کے مطابق ہونے کو بتاتا ہے کیونکہ بالکل واضح ہے کہ جو روش وراستہ انسان کی فطری خواہشوں اور حقیقی ضرورتوں کو پورا کرے، وہ انسان کو بہترین صورت میں کامیاب وخوش بخت بنا سکتا ہے:(فاقم وجہک للدّین حنیفا فطرت اللہ التی فطر النّاس علیہا لا تبدیل لخلق اللہ ذلک الدین القیّم[3]) ''آپ اپنے رخ کو دین کی طرف رکھیں اور باطل سے کنارہ کش رہیں کہ یہ دین وہ فطرت الٰہی ہے جس پر اس نے انسانوں کو پیدا کیا اور خلقت الٰہی میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی ہے۔یقیناًیہی سیدھا اور مستحکم دین ہے'' نیز فرماتا ہے: (۔کتٰب انزلنہ الیک لتخرج النّاس من الظّلمات الی النّور[4]) ''یہ کتاب ہے جسے ہم نے آپ کی طرف نازل کیا ہے تاکہ آپ لوگوں کو حکم خدا سے تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے آئے''۔۔

قرآن مجید ،لوگوں کو ایک ایسے راستہ کی طرف دعوت دیتا ہے کہ جو خود بھی روشن ہو اور منزل مقصود کو بھی واضح طور پر دکھائے ،یہ راستہ قطعا وہی راستہ ہوگا جو انسان کی فطری خواہشات،جو اسکی واقعی ضرورتیں ہیں ،کو پورا کر سکے اور عقل سلیم کی نظر سے موافق ہونا چاہئے اور یہ وہی دین فطرت ہے جسے ''اسلام '' کہتے ہیں۔لیکن جس روش کی بنیاد معاشرہ کی ہواوہوس اور شہوانی خواہشات کے لئے یا معاشرے کے بااثر افراد کے ذریعہ رکھی گئی ہو ،اسی طرح جو روش اسلاف کی اندھی تقلید پر بنی ہو، اسی طرح جو راہ وروش ایک پسماندہ اورناتواں ملت نے ایک توانا اور قدرتمند ملت سے حاصل کر کے عقل و منطق سے اس کی تحقیق کئے بغیر جو کچھ اس سے حاصل کیا ہے،اسے آنکھیں بند کرکے قبول کر کے خود کو اسکے مشابہ بنائے ،ایسی روشیں تاریکی میں ڈوبنے کے علاوہ کچھ نہیں ہے

[1] احقاف ,۳۰
[2] اسراء,۹
[3] روم,۳۰
[4] ابراہیم ,۱

اور حقیقت میں یہ ایک ایسے راستہ پر چلنے کے مترادف ہے کہ جہاں منزل مقصود تک پہنچنے کی کوئی ضمانت نہیں ہے ,چنانچہ خدائے متعال فرماتا ہے: (او من کان میتا فاحیینہ وجعلنا لہ نوراً یمشی بہ فی النّاس کمن مثلہ فی الظّلمات لیس بخارج منہا[1]) ''کیا جو شخص مردہ تھا پھر ہم نے اسے زندہ کیا اور اس کے لئے ایک نور قرار دیا جس کے سہارے وہ لوگوں کے درمیان چلتا ہے اسکی مثال اسکی جیسی ہو سکتی ہے جو تاریکیوں میں ہو اور ان سے نکل بھی نہیں سکتا ہو''۔

[1] انعام,۱۲۲

قرآن مجید کی اہمیت

قرآن مجید ایک آسمانی کتاب ہے جو عالمی وابدی دین اسلام کی پشت پناہ ہے ۔اس میں معارف اسلامی کے کلیات دلکش انداز میں بیان ہوئے ہیں،اس لحاظ سے اس کی قدر و قیمت دین خدا کی قدر وقیمت کے مساوی ہے،وہ دین جس سے انسان کی حقیقی سعادت و خوشبختی وابستہ ہے،وہ ہرچیز سے زیادہ قیمتی،اہم اوربلند ہے بلکہ قدر وقیمت میں کوئی چیز اس سے قابل موازنہ نہیں ہے ۔اسکے علاوہ قرآن مجید خدائے متعال کا کلام اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا لافانی معجزہ ہے ۔

قرآن مجید کا معجزہ

یقیناً عربی زبان،ایک قوی اور وسیع زبان ہے،جو انسان کے باطنی مقاصد کو واضح ترین اور دقیق ترین صورت میں بیان کر سکتی ہے اور یہ اس خصوصیت میں مکمل ترین زبانوں میں سے ایک ہے۔تاریخ سے ثابت ہو چکا ہے کہ عصر جاہلیت (قبل از اسلام)کے اعراب اکثر خانہ بدوش اور تہذیب وتمدن سے بے بہرہ اورزندگی کے بیشتر حقوق سے بالکل محروم تھے ۔لیکن وہ قدرت بیان اور کلام کی فصاحت وبلاغت میں ایک بلند مقام رکھتے تھے،چنانچہ تاریخ کے صفحات میں ان کا حریف پیدا نہیں کیا جاسکتا ۔

ادبیات عرب کے میدان میں، فصیح کلام کی بہت قدر وقیمت تھی اورادیبانہ اور فصیح کلام کا کافی احترام کیا جاتا تھا .اعراب جس طرح،بتوں اوراپنے خداؤں کو خانہ کعبہ میں نصب کرتے تھے،اسی طرح صف اول کے ادیبوں اورشعراء کے دلکش اشعار کو بھی کعبہ کی دیوارپر لٹکا تے تھے ۔اس کے باوجود کہ وہ ایک وسیع زبان کو ان تمام علامتوں اور دقیق قواعد وضوابط اورکم ترین غلطی اور اشتباہ سے استعمال کرتے تھے اور کلام کی فصاحت وبلاغت میں کمال دکھاتے تھے،جب ابتدائی ایام میں پیغمبراسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قرآن مجید کی چند آیتیں نازل ہوئیں،تواعراب اور اس قوم کے ادیبوں اور سخنوروں میں ہلچل مچ گئی اورقرآن مجید کا دلکش اورپُر معنی بیان کا دلوں پر ایسا اثر ہوا کہ دل والوں کواپنا فریفتہ بناکر رکھدیا اور وہ ہر فصیح کلام کو بھول گئے اور نامورشعراء جو اپنے

اشعار کعبہ کی دیوار پر لٹکائے تھے ،انہیں اتار دیا ۔یہ خدائی کلام ،اپنی ابدی زیبائی و دلکشی سے ہر دل کو اپنی طرف کھینچ لیتا تھا اور اپنی شیرین بیانی سے شیرین زبانوں پر تالا لگا دیتا تھا ۔لیکن دوسری جانب مشرکوں اور بت پرستوں کے لئے انتہائی تلخ وناگوار تھا ،کیونکہ خدا کا کلام اپنے موثر بیان اور قطعی حجت سے دین توحید کو برہان واستدلال بخشتا تھا اور شرک وبت پرست کی روش کی سرزنش کرتا تھا ۔جن بتوں کو لوگ خدا کہتے تھے ان کے سامنے نیازمندی کا ہاتھ پھیلاتے تھے ،ان کی بارگاہ میں قربانیاں پیش کرتے تھے اور ان کی پوجا کرتے تھے ،قرآن ان کی مذمت کرتا اورانھیں پتھر اور لکڑی کے بے جان وبے فائدہ مجسمے سے تعبیر کرتا تھا ،وحشی اعراب جنہوں نے غرورو تکبر میں غرق ہو کر اپنی زندگی کی بنیاد خونخواری اور ڈاکہ زنی پر ڈالی تھی ..کو حق پرستی کے دین اورعدالت وانسانیت کے احترام کی طرف دعوت دیتا تھا ،یہی وجہ تھی کہ اعراب جنگ و لڑائی کے راستہ سے سامنے آگئے اوراس شمع ہدایت کو خاموش کرنے کے لئے ہر ممکنہ کوشش کرتے رہے لیکن اپنی بے جا کوششوں میں ناامیدی و ناکامی کے علاوہ کچھ نہیں پایا ۔اوائل بعثت میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ولید نامی ایک ادیب اور فصاحت وبلاغت کے ماہر کے پاس لے گئے ۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سورۂ ''حم سجدہ '' کی چند آیتوں کی تلاوت فرمائی ۔ولید اپنے تکبر وغرور کے باوجود بڑی سنجیدگی سے سن رہا تھا ،یہاں تک کہ آنحضرتؐ نے اس آیۂ شریفہ کی تلاوت فرمائی: (فان اعرضوا فقل انذرتکم صٰعقة مثل صٰعقة عاد وثمود[1]) '' پھر اگر یہ اعراض کریں تو کہہ دیجئے کہ ہم نے تم کو ویسی ہی بجلی کے عذاب سے ڈرایا ہے جیسی قوم عاد وثمود پر نازل ہوئی تھی ۔''

جوں ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس آیہ شریفہ کی تلاوت کی ،ولید کی حالت بگڑ گئی ،اس کا بدن کانپنے لگا،اس کے ہوش اڑ گئے، محفل درہم برہم ہوگئی ،اور لوگ متفرق ہوگئے ۔اس کے بعد،کچھ لوگ ولید کے پاس آئے اور اس سے شکوہ کیا اور کہا کہ تم نے ہمیں محمدؐ کے سامنے رسوا کر کے رکھدیا !اس نے جواب میں کہا :خدا کی قسم ہرگز نہیں !تم لوگ جانتے ہو کہ میں کسی سے نہیں ڈرتا ہوں اور کوئی لالچ بھی نہیں رکھتا ہوں اور تم لوگ جانتے ہو کہ میں سخن شناس ہوں ،جو باتیں میں نے محمدؐ سے سنیں ان میں لوگوں کی

---

[1] فصلت،۱۳

باتوں کی شباہت نہیں پائی جاتی ،یہ دلفریب اور دلکش کلام تھا ،نہ اسے شعر کہہ سکتے ہیں اور نہ نثر ،بامعنی اور عمیق کلام ہے ۔ اگر میں اس کلام کے بارے میں اپنا نظریہ پیش کرنے پر مجبور ہی ہوں تو مجھے تین دن کی مہلت دیں تاکہ میں اس پر غور کرسکوں ۔ جب تین دن گزرنے کے بعد اس کے پاس گئے تو ولید نے کہا : محمد کا کلام سحر وجادو ہے جو دلوں کو اپنا فریفتہ بنا لیتا ہے ۔ مشرکین ولید کی راہنمائی پر قرآن مجید کو سحر وجادو کا نام دیکر اس کو سننے سے پرہیز کرتے تھے اور لوگوں کو بھی اسے سننے سے منع کرتے تھے ،بعض اوقات جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجدالحرام میں قرآن مجید کی تلاوت فرماتے تھے ،تو کفار شور مچاتے اور تالیاں بجاتے تھے تاکہ دوسرے لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آواز سن نہ سکیں ۔

اس کے باوجود کہ وہ لوگ قرآن مجید کے فصیح اور دلکش بیان کے عاشق ہوئے تھے ،اکثر و بیشتر آرام سے نہیں بیٹھتے تھے اور رات کی تاریکی سے استفادہ کرکے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر کی دیوار کے پیچھے جمع ہوکر قرآن مجید کی تلاوت کو سنتے تھے ،پھر سرگوشی میں ایک دوسرے سے کہتے تھے :اس کلام کو مخلوق کا کلام نہیں کہا جاسکتا ہے ،خدائے متعال اس مطلب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے :(نحن اعلم بما یستمعون بہ اذ یستمعون الیک واذ ہم نجوی اذ یقول الظّٰلمون ان تتّبعون الا رجلا مسحوراً[1]) ''ہم خوب جانتے ہیں کہ یہ لوگ آپ کی طرف کان لگا کر سنتے ہیں تو کیا سنتے ہیں اور جب یہ باہم رازداری کی بات کرتے ہیں تو ہم اسے بھی جانتے ہیں، یہ ظالم آپس میں کہتے ہیں تم لوگ ایک جادو زدہ انسان کی پیروی کر رہے ہو ۔''

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ،بعض اوقات کعبہ کے نزدیک لوگوں کو قرآن مجید کی تلاوت کی طرف دعوت دیتے تھے ،عرب کے سخنور جب آپؐ کے نزدیک سے گزرتے تھے تو جھک کر گزرتے تھے ۔تاکہ دیکھے اور پہچانے نہ جائیں ،چنانچہ خدائے متعال فرماتا ہے :(الا انہم یثنون صدورہم لیستخفوا منہ[2]) ''ترجمہ کا خلاصہ :وہ اپنے آپ کو پیغمبرؐ سے چھپانے کے لئے جھک جاتے ہیں ۔' پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر تہمتیں کفار ومشرکین نے نہ صرف قرآن مجید کو سحر وجادو کہا ،بلکہ وہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

---

[1] اسراء ،۴۷
[2] ہود ،۵

کی پوری دعوت کو ہی جادو کہتے تھے ۔ جب بھی آپؐ لوگوں کو راہ خدا کی دعوت دیتے تھے اور انھیں کچھ حقائق کی یاد دہانی کراتے تھے یا کوئی وعظ و نصیحت فرماتے تھے تو کفار کہتے تھے : ''جادوکر رہاہے ''،جبکہ تمام حالات میں،آپؐان کے لئے ایسے مسائل کوواضح فرماتے تھے ،کہ وہ خداداد فطرت اور انسانی شعور سے ان کی حقیقت کو درک کرتے تھے اورآپؐانہیں سیدھا اور واضح راستہ دکھاتے تھے کہ انسانی معاشرے کی سعادت وکامیابی کو جادو نہیں کہا جاسکتا ہے۔کیا یہ کہنا جادو ہےکہ ''اپنے ہاتھوں سے پتھر ولکڑی کے بنائے ہوئے،بتوں کی پرستش نہ کرو اور اپنے فرزندوں کو انکی قربانی نہ کرو اور خرافات کی پیروی نہ کرو ''اور کیا پسندیدہ اخلاق،جیسے سچائی، صحیح،خیر خواہی،انسان دوستی، صلح وصفا،انصاف، عدالت اور انسانی حقوق کے احترام کو جادو کہا جاسکتا ہے؟خدائے متعال اپنے کلام پاک میں اس مطلب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: (ولئن قلت انکم مبعوثون من بعد الموت لیقولن الذین کفروا ان ہذا إلاّ سحر مبین[۱])ترجمہ کا خلاصہ : ''جب آپ کفار سے کہتے ہیں کہ :موت کے بعد دوبارہ زندہ ہو جاؤ گے تو کہتے ہیں کہ جادو کرتا ہے''۔

قرآن مجید کی مشرکین کو مناظرہ کی دعوت

کفارومشرکین کہ جن کے دلوں میں بت پرستی نے جڑپکڑ لی تھی،اسلام کی دعوت کو قبول کرنے اور حق وحقیقت کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے لئے ہرگز تیار نہیں تھے.لہذاپیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تردید کرتے ہوئے کہتے تھے : ''یہ جھوٹا ہے اور جس قرآن کوخدا سے نسبت دیتا ہے ،یہ اس کا اپنا کلام ہے''اس تہمت کو دور کرنے کے لئے قرآن مجید نے شدید رد عمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے عربوں کے میدان فصاحت وبلاغت کے ہراول دستے کو مقابلہ کی دعوت دیتے ہوئے ان سے چاہا کہ اگر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں ان لوگوں کا شک و شبہہ صحیح ہے اور وہ سچ کہتے ہیں توقرآن مجید کے کلام کے مانند کلام لے آئیں اور اس طرح اسلام کی دعوت کے بے بنیاد ہونے کو ثابت کریں چنانچہ خدائے متعال فرماتا ہے: (ام یقولون تقولہ بل لا یو

---

[۱] ہود،۷

منون *فلیاّ توا بحدیث مثلہ ان کانوا صادقین[1] '' یا یہ کہتے ہیں کہ نبی نے قرآن گڑھ لیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ ایمان لانے والے نہیں ہیں اگر یہ اپنی بات وں میں سچے ہیں تو یہ بھی ایسا ہی کوئی کام لے آئیں ۔ ''(ام یقولون افترٰیہ قل فأتوا بسورۃٍ مثلہ وادعوا من استطعتم من دون اللہ ان کنتم صٰدقین[2]) ''کیا یہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ اسے پیغمبر نے گڑھ لیا ہے تو کہد یجئے کہ تم اس کے جیسا ایک ہی سورہ لے آؤ اور خدا کے علاوہ جسے چاہو اپنی مدد کے لئے بلا لو اگر تم الزام میں سچے ہو ۔ ''کفار و مشرکین عرب ،جو سخوری کے استاد اور ملک فصاحت و بلاغت کے فرمانروا تھے ، سخوری میں اس تکبر وغرور کے باوجود اس دعوت کو قبول کرنے سے پہلو تہی کرتے ہوئے مقابلہ سے چشم پوشی کی اور کلام کے مقابلہ کو خونین مقا بلہ میں تبدیل کرنے پر مجبور ہوئے یعنی ان کے لئے رسوائی اور مقابلہ کی نسبت قتل ہونا زیادہ آسان تھا ۔عرب سخور قرآن مجید کا جواب لانے سے عاجز ہوئے ،نہ صرف نزول قرآن کے زمانے میں زندگی گزارنے والے ،بلکہ جو نزول قرآن کے زمانے کے بعد پیدا ہوئے وہ بھی اس کا کوئی جواب نہ لا سکے اور مقابلے کے بعد شکست کھا کر پیچھے ہٹ گئے ۔

انسان کی فطرت ہمیشہ اس چیز کی طرف مائل ہوئی ہے کہ اس سے کوئی شا ہکار یا ہنر ظاہر ہو جائے اور لوگوں کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کرے ،اگرچہ یہ کارنامہ مکہ بازی اور رسی کھینچنے کے مانند معاشرہ میں براہ راست اثر بھی نہ رکھتا ہو ،پھر بھی لوگوں کی ایک جماعت اس کی جیسی مثال یا اس سے بہتر مثال پیش کرنے اور اس کا مقابلہ کرنے کی فکر میں لگ جاتے ہیں ،اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کے بھی گھات میں کچھ لوگ ہمیشہ رہے ہیں کہ اگر اس آسمانی کتاب سے مقابلہ کرنے کی فرصت مل جائے تو اس سے گریز نہ کریں گے ۔

یہ لوگ مقابلہ سے عاجز آچکے تھے اور سحر و جادو کو بہانہ بناکر یہ نہیں کہہ سکے کہ قرآن مجید جادو ہے ،کیونکہ جادو ایک ایسا عمل ہے جو خاصیت کے مطابق حق کو باطل اور باطل کو حق ظاہر کرتا ہے ،جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ کے روپ میں پیش کرتا ہے اور اگر

[1] طور،۳۳،۳۴
[2] یونس ،۳۸

قرآن مجید اپنے زیبا لحن اور فصیح نظم سے دلوں کو جذب کرتا ہے تو یہ اس کی فطری خاصیت کی زیبائی ہے اور علم جادو سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے .اگر لفظ کے ذریعہ کچھ مقاصد کی طرف دعوت دیتا ہے اور کچھ معارف کے بارے میں لوگوں کو یاد دہانی کراتا ہے کہ انسانی شعور اور خداداد فطرت سے ان کی حقیقت کو سمجھ سکیں اور لوگوں کو کچھ رفتار وکردار کا جیسے :حق شناسی ،نیک نیتی ،عدل وانصاف اور انسان دوستی کو قبول کرنے پر مجبور کرے تو ان کی تعریف کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے ۔چونکہ قرآن مجید، حقیقت کو بیان کرنے کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں ہے ،اس لئے یہ لوگ عاجز ہو کر یہ بھی نہ کہہ سکے ہیں کہ قرآن مجید کلام بشر سے مافوق ہے اس لئے کہ زیبائی، دلکشی ،بلاغت اور کشش میں بے نظیر ہے اور یہ اس کے کلام خدا ہونے کی دلیل نہیں بن سکتی ہے ۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جائے کہ ہر ایک صفت یا مہارت ،جیسے جرئت ،شجاعت، پڑھنا اور لکھنا وغیرہ جو قابل ترقی ہے ، لا محالہ تاریخ بشریت میں ان میں سے ایک غیر معمولی ذہنیت والا مقابلہ میں جیت کر اول آتا ہے ،کیا حرج ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عربی بول چال کے اس مقابلہ میں کامیاب قرار پا کر فصاحت وبلاغت میں اول آئیں ،اس صورت میں آپؐ کا کلام باوجود اس کے کہ کلام بشر ہے ناقابل مناقشہ ہو گا ۔پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہم عصر سخن وروں نے یہ بات نہیں کہی اور نہ ہی قرآن مجید کے حریفوں میں سے کوئی شخص یہ کہہ سکا اور ثابت کر سکا ،کیونکہ ہر صفت یا مہارت جو کسی غیر معمولی ہنر مند کے ذریعہ ترقی کے کمال تک پہنچتی ہے ،کچھ بھی آخر کار یہ ایک ایسا امر ہے جو انسان کی قابلیت اور استعداد سے وجود میں آتا ہے اور فطرت بشر کا نتیجہ ہے ،لہذا یہ کام دوسروں کے لئے ممکن ہے کہ اس غیر معمولی ذہین شخص کے نقش قدم پر چل کر ضروری سعی و کوشش کے ذریعہ اسی غیر معمولی ذہین انسان کی طرح ایک کارنامہ انجام دیں اگرچہ کسی بھی جہت سے اس سے بہتر نہ ہو ۔

اس حالت میں مذکورہ غیر معمولی شخص ،جو راستہ کھولنے والا پہلا شخص ہے ،صرف پیشوا اور پیش رو ہو سکتا ہے ،مثلا سخاوت میں حاتم طائی سے بلند کوئی شخص نہیں ہو سکتا ہے ،لیکن اس کے جیسا کام انجام دیا جاسکتا ہے ،خوشنویسی میں میر کے برابر اور نقاشی میں مانی کے مقام تک نہیں پہنچ سکتے ہیں ،لیکن مناسب کوشش اور جستجو کے نتیجہ میں میر کے نہج پر ایک کلمہ لکھا جاسکتا ہے یا مانی کے

اسلوب پر نقاشی کا ایک چھوٹا سا نمونہ بنایا جا سکتا ہے۔اس عام قانون کی بنا پر،اگر قرآن مجید فصیح و بلیغ ترین انسانی کلام (نہ کلام خدا) ہوتا تو دوسروں کے لئے خاص کر دنیا کے نامور سخن وروں کے لئے ممکن تھا کہ اسی اسلوب کا تجربہ کر کے ،ایک کتاب یا کم ازکم قرآن مجید کے سوروں کے مانند ایک سورہ کو بناتے ۔قرآن مجید نے مقابلہ کے مرحلہ میں لوگوں سے اپنے جیسے کلام کا تقاضا کیا ہے نہ کہ اس سے بہتر کا :(فلیا توا بحدیث مثلہ[1] ((فاتوا بسورة مثلہ[2] (فاتوا بعشر سور مثلہ مفتریٰت[3]) (لا یاتون بمثلہ ولو کان بعضہم لبعض ظہیرا[4]).

قرآن مجید کی تعلیمات

قرآن مجید ۲۳سال کے عرصہ میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کے دوران تدریجا نازل ہوا اور انسانی معاشرہ کی ضرورتوں کا حل پیش کیا ۔قرآن مجید ،ایک ایسی کتاب ہے کہ خود اس کے بیانات کے مطابق لوگوں کی سعادت کی طرف رہنمائی کے علاوہ اس کا کوئی مقصد نہیں ہے ۔ صحیح اعتقاد پسندیدہ اخلاق اور شائستہ عمل،جو انسان کے انفرادی واجتماعی سعادت کی بنیادیں ہیں ،کی فصیح زبان میں تعلیم دیتا ہے: (ونزّلنا علیک الکتٰب تبیانا لکلّ شیء[5]) ''اور ہم نے آپ پرکتاب نازل کیا ہے جس میں ہرشے کی وضاحت موجود ہے'' قرآن مجید نے اسلامی معارف کو خلاصہ کے طور پر بیان کیا ہے ۔

ان معارف کی تفصیلات خاص کر فقہی مسائل کی وضاحت کے لئے ،لوگوں کو خانہ نبوت کا دروازہ کھٹکھٹانے کی طرف ہدایت کرتا ہے چنانچہ فرماتا ہے: (وانزلنا الیک الذّکر لتبیّن للنّاس مانزّل الیہم[6]) ''اور آپ کی طرف بھی ذکر کو (قرآن)نازل کیا ہے تاکہ ان کے لئے ان احکام کو واضح کردیں جو ان کی طرف نازل کئے گئے ہیں''...

---

[1] طور،۳۴
[2] یونس ،۳۸
[3] ہود،۱۳
[4] اسراء ، ۸۸
[5] نحل،۸۹
[6] نحل ،۴۴

(وما انزلنا علیک الکتب الاّ لتبیّن لہم الذی اختلفوا فیہ[1]) ''اور ہم نے آپ پر کتاب صرف اس لئے نازل کی ہے کہ آپ ان مسائل کی وضاحت کردیں جن میں یہ اختلاف کئے ہوئے ہیں'' جان لیجئے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کتاب خدا کی تفسیر اوردین کے معارف کی وضاحت کے لئے اپنے اہل بیت علیہم السلام کے کلام کو اپنے کلام کے مانند قرار دیتے ہوئے فرمایا '' :قرآن مجید اور میرے اہل بیتؑ قیامت کے دن تک ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گےاور جوبھی شخص قرآن مجید سے استفادہ کرنا چاہتا ہے،اسے میرے اہل بیتؑ کے دامن کوپکڑنا چاہئے[2]۔''.

قرآن مجید کی نظر میں علم وجہل

قرآن مجید میں علم ودانش کی جو تعریف اور غور و حوض کی جو تشویق کی گئی ہے،وہ کسی اور آسمانی کتاب میں پائی نہیں جاتی ۔اسی طرح جہل ونادانی کی جو سرزنش کی گئی ہے وہ بھی قرآن مجید کے خصوصیات میں سے ہے ۔قرآن مجید نے علم ودانش کو زندگی اور جہل ونادانی کو موت سے تعبیر کیا ہے۔اور اسلام سے قبل فساد سے بھرے ماحول کو (جاہلیت) کا ماحول کہا ہے چنانچہ فرماتا ہے: ہل یستوی الذّین یعلمون والذّین لا یعلمون[3]) ''کیا وہ لوگ جو جانتے ہیں ان کے برابر ہو جائیں گے جو نہیں جانتے ؟''(اومن کان میتا فاحیینہ وجعلنا لہ نورا یمشی بہ فی الناس کمن مثلہ فی الظّلمات لیس بخارج منہا[4]) ''جو شخص مردہ تھا پھر ہم نے اسے زندہ کیا اوراس کے لئے ایک نور قراردیاجس کے سہارے وہ لوگوں کے درمیان چلتا ہے اس کی مثال اس شخص کی سی ہو سکتی ہے جوتاریکیوں میں ہواوران سے نکل بھی نہ سکتا ہو''۔

(فانہا لا تعمی الابصار ولکن تعمی القلوب التی فی الصدور[5]).'در حقیقت آنکھیں اندھی نہیں ہوتی ہیں بلکہ وہ دل اندھے ہوتے ہیں جو سینوں کے اندر پائے جاتے ہیں'' (لہم قلوبٌ لا یفقہون بہا و لہم اعین لا یبصرون بہا ولہم آذان لا یسمعون!..''ان کے پاس دل

---

[1] نحل،۶۴
[2] حقاق الحق،ج۹،ص۳۰۹۔۳۷۵۔
[3] زمر،۹
[4] انعام ،۱۲۲
[5] حج، ۴۶

ہیں مگر سمجھتے نہیں ہیں اور آنکھیں ہیں دیکھتے نہیں ہیں اور کان ہیں سنتے نہیں ہیں ۔ یہ چوپایوں جیسے ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں (ومایستوی الاعمی والبصیر *ولا الظلمات ولا النور *ولا الظل ولاالحرور * ومایستوی الاحیاء ولا الاموات.[۲]) ''اور اندھے اور بینا برابر نہیں ہو سکتے اور تاریکیاں اور نوردونوں برابر نہیں ہو سکتے اور سایہ اوردھوپ دونوں بربر نہیں ہو سکتے اورزندہ اور مردے برابر نہیں ہو سکتے''...خدائے متعال اپنے کلام پاک کی بہت سی آیتوں میں،انسان کو غوروفکر،اورتدبر کی ترغیب اور تشویق فرماتا ہے اور اپنے بندوں کو حکم دیتا ہے کہ آسمانوں ،زمین اور ان میں موجود گوناگون مخلوق کی خلقت کے بارے میں غورو فکر کریں ، بالخصوص انسان کی خلقت کے بارے میں غور و فکر سے کام لیں گزشتہ ملتوں اور امتوں کی تاریخ ،آثار ،رسو مات ،عادات اور طور طریقوں،جو حقیقت میں مختلف علوم وفنون انسانی ہیں ،مطالعہ کی تاکید کرتا ہے اور ان مطالعات کے ذریعہ اپنی حقیقی سعادت حاصل کریں۔اور جان لینا چاہئے کہ فنی نظریات اور علمی مسائل کی چھان بین کرنا اس دنیا کی چند روزہ محدود زندگی کی فلاح وبہبود کے لئے نہیں ہے،بلکہ علمی مطالعات کی بنیاد پر جاودانی حیات کی سعادت وآسائش حاصل کرنے ہونا چاہئے ۔خالق کائنات کے بارے میں قرآن مجید کی تعلیم (...افی اللہ شک فاطر السموات والارض[۳]) ''کیا تمھیں اللہ کے بارے میں شک ہے جو زمین وآسمان کا پیدا کرنے الاہے....؟''

وضاحت

دن کے اجالے میں تمام چیزیں آنکھوں کے سامنے نمایاں ہوتی ہیں، ہم اپنے آپ کو، گھر ، شہر، بیابان، پہاڑ، جنگل اور دریا کو دیکھتے ہیں۔ لیکن جب رات کااندھیرا چھاجاتا ہے توتمام وہ چیزیں جو روشن و نمایاں تھیں ، اپنی روشنی کو کھو دیتی ہیں، ہم اس وقت سمجھتے ہیں کہ ان کی وہ روشنی اپنی نہیں تھی بلکہ سورج سے مربوط تھی کہ وہ ایک قسم کے رابطہ کی وجہ سے انھیں روشن کئے ہوئے تھا۔ سورج بذات خود روشن ہے اور اپنے نور سے زمین اور اس میں موجود تمام چیزوں کو روشن اورنمایان کرتاہے۔ اگر ان اشیاء کی روشنی اپنی ہوتی تو ہرگز اسے کھو نہیں دیتیں۔

---

[۱] اعراف،۱۷۹
[۲] فاطر،۱۹،۲۲
[۳] ابراہیم ،۱۰

انسان اور دیگر تمام زندہ حیوانات اپنی آنکھوں، کانوں او ردیگر حواس سے اشیاء کو درک کرتے ہیں اور ہاتھ، پاؤں اور تمام اندرونی و بیرونی اعضاء سے سرگرمی انجام دیتے ہیں، لیکن وہ بھی ایک مدت کے بعد حس و حرکت کو کھو کرکسی قسم کی سرگرمی انجام نہیں دے پاتے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جائے کہ وہ مرجاتے ہیں۔ ہم اس چیز کا مشاہدہ کرنے کے بعد فیصلہ کرتے ہیں کہ ان جانداروں سے ظاہر ہونے والا شعور ، ارادہ اور تحرک، ان کے جسم و بدن سے نہیں ہے، بلکہ ان کی روح وجان سے ہے کہ جس کے نکل جانے کے بعد اپنی زندگی اور تحرک کو کھودیتے ہیں۔ اگر دیکھنے او رسننے کا تعلق مثلا صرف آنکھ او رکان سے ہوتا، تو جب تک یہ دونوں عضو موجود ہوتے دیکھنا اور سننا بھی جاری رہنا چاہئے تھا، جبکہ ایسا نہیں ہے۔

اسی طرح یہ عظیم کائنات کہ، جس کے اجزاء میں سے ہم بھی ایک جزو اور ایک وجود ہیں ہرگز شک و شبہ نہیں کر سکتے، کہ یہ کائنات اور ناقابل انکار خلقت ، اگر خود سے ہوتی، تو ہرگز اسے کھونہ دیتی، جبکہ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ اس کے اجزاء یکے بعد دیگرے اپنے وجود کو کھود یتے ہیں اور ہمیشہ تغییر و تبدل کی حالت میں ہوتے ہیں، یعنی ایک حالت کو کھوکر دوسری صورت اختیار کرتے ہیں۔ لہذا ہمیں قطعی فیصلہ کرنا چاہئے کہ تمام مخلوقات کی خلقت اوروجود کا سرچشمہ کوئی دوسری چیز ہے جوان کا خالق اور پروردگار ہے اور جوں ہی خلقت کا رابطہ اس ذات سے ٹوٹ جاتاہے تو وہ نیستی و نابودی کے دریا میں غرق ہو جاتی ہے۔

قرآن مجید کا احترام

معارف و احکام کا خزانہ اسلام کی آسمانی کتاب ''قرآن مجید'' ہے، جسے خدائے متعال نے وحی کے ذریعہ اپنے پیغمبرؐ پرنازل فرمایاہے۔ قرآن مجید دنیا کے مسلمانوں کی مادی و معنوی زندگی کا نہایت گرانقدر پشتپناہ ہے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و سلم نے امت کو بارہا اس کتاب کی اسی عنوان سے تاکید کیاور مکر ر طور پر (خاص کر اپنی زندگی کے آخری ایام میں) لوگوں سے فرمایا ہے:

''میں اپنے بعد دوگراں بہا چیزیں تم لوگوں میں چھوڑ رہا ہوں جو قیامت تک ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گی، جب تک تم

ان دونوں سے متمسک رہوگے، ہرگز گمراہ نہیں ہوگے، ان میں سے ایک قرآن مجید ہے اور دوسری میری عترت (اہل بیت) ہیں، جو قرآن مجید کو بیان کرنے والے ہیں''۔

قرآن مجید کے تقدس اور احترام کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ یہ: ا۔ کلام خدا ہے۔

۲۔ پیغمبرؐ کی قطعی اور زندہ سند ہے۔

۳۔ اسلام کے بنیادی قانون کا حامل ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم فرماتے ہیں: ''قرآن مجید سے جدا نہ ہونا، کیونکہ اس میں آپ کے اسلاف مستقبل میں آپ کے آنے والوں کے حالات موجود ہیں اور آپ لوگوں کے درمیان عدل و انصاف سے حکومت کرتا ہے۔''

راہ خدا میں جہاد اور فداکاری کے متعلق قرآن کا دستور

اجتماعی طریقے، ایک پھل دار درخت کے مانند ہیں، جسے شگوفہ دینے، پھلنے اور پھولنے کے لئے ایک مناسب زمین میں لگانا چاہئے، پھر اس کی آبیاری کرنی چاہئے تاکہ زمین میں اسکی جڑیں مضبوط و مستحکم ہو جائیں، اور اس کے بعد وہ نشو و نما پائے اور اس میں مناسب موسم میں، شگوفے نکلیں اور پھل آئیں۔ اسلام کا یہ درخت سوفیصدی اجتماعی دین ہے، اس کے مکمل موثر ہونے کے لئے مندرجہ ذیل مراحل کا طے کرنا ضروری ہے: ا۔ لوگ اسے قبول کریں۔

۲۔ تربیت کے ذریعہ، اس کی حفاظت کی جائے تاکہ اپنی زندگی کو جاری رکھ سکے۔

۳۔ اس کے قوانین کی عملی مخالفت کی روک تھام کی جائے، اور حوادث کے گزند سے ان کی حفاظت کی جائے تاکہ اپنے آثار و فوائد کو انسانی معاشرہ میں پھیلا سکیں۔

بحث کا خاتمہ

بحث کے اختتام پر یہ بات قابل توجہ ہے کہ قرآن مجید نے صرف فصاحت و بلاغت کی دلکشی سے ہی دوسروں کو عاجز نہیں کیا ہے، بلکہ اس لحاظ سے بھی عاجز کیا ہے، کہ اس میں انسان کی تمام ضرورتوں کا حقیقی حل موجود ہے اور غیبی خبروں کے اعتبار سے بھی کہ جن کی اس نے پیشگوئی کی ہے اور کچھ حقائق بیان بھی کئے ہیں اور دیگر جہات سے بھی جو اس آسمانی کتاب میں پائے جاتے ہیں، قرآن مجید چلینج کرتے ہوئے اعلان کرتا ہے کہ اس کی مثال پیش نہیں کر سکتے ہو۔

۳۔ معاد یا قیامت ''معاد''، دین مقدس اسلام کے تین اصولوں میں سے ایک اصول ہے اور اس مقدس دین کی ضروریات میں سے ہے۔ قرآن مجید کی سیکڑوں آیات اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ اطہار علیہم السلام کی ہزاروں روایتیں پوری وضاحت کے ساتھ بیان کرتی ہیں کہ خدائے متعال اپنے تمام بندوں کو موت کے بعد ایک معین دن کو پھر سے زندہ کرے گا اور ان کا اعمال کا حساب لے گا۔ پھر نیک کام انجام دینے والوں کو ابدی نعمت و لذت سے نوازے گا او ربد کرداروں کو ان کے کیفر کردار تک پہنچا کر ابدی عذاب میں مبتلا کرے گا۔ خدائے متعال قرآن مجید میں فرماتا ہے کہ تمام گذشتہ پیغمبروں نے، معاد اور روز قیامت کے بارے میں لوگوں کو یاد دہانی کرائی ہے۔

دوسرے آسمانی ادیان بھی دین اسلام کے مانند، معاد کو ثابت کرتے ہیں، اس کے علاوہ آثار قدیمہ کے توسط سے ہزاروں سال پرانی قبروں کی کھدائی سے ایسے آثار و علائم ہاتھ آرہے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلا اور ما قبل تاریخ کے بشر بھی انسان کے لئے موت کے بعد ایک قسم کی زندگی کا قائل تھا، اور یہاں سے یہ بات سمجھی جا سکتی ہے انسان اپنی سادہ سوچ سے بھی نیک انسانوں کے لئے جزا اور بد کاروں کے لئے سزا کا قائل ہے اور اس کے لئے ایک معین دن کو جانتے ہیں، چونکہ ایسا دن اس دنیا میں موجود نہیں ہے، اس لئے اس کا دوسری دنیا میں ہونا ضروری ہے۔

ادیان و ملل کی نظر میں معاد

تمام وہ مذاہب، جو خدا کی پرستش کی دعوت دیتے ہیں اور انسان کونیک کام انجام دینے کا حکم اور بد کاری سے روکتے ہیں،وہ موت کے بعد معاد اور دوسری زندگی کے قائل ہیں،کیونکہ وہ ہرگز معین نہیں کرتے ہیں کہ نیک کام کی اس وقت قدر و قیمت ہوگی جب نیکی کی جزا ہوگی اور چونکہ یہ جزا اس دنیا میں دیکھی نہیں جاسکتی ہے،اس لئے مرنے کے بعد دوسری دنیا اور ایک دوسری زندگی میں اس کا ہونا ضروری ہے۔یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اس دن کو کہ جسے قیامت کا دن کہا ہے،پوری وضاحت سے ثابت کیا ہے اور اس کی ناقابل انکار حالت میں تعارف کراتا ہے۔ اس پر اعتقاد کودین کے تین اصولوں میں سے ایک شمار کرتا ہے اور قرآن مجید میں اسی مطلب کو سابقہ پیغمبروں کی دعوت سے نقل کرتا ہے۔اس کے علاوہ ،آثار قدیمہ کے کشف ہوئے بہت سے مقبروں سے کچھ ایسے آثار و علامتیں پائی گئی ہیں، جواس چیز پر دلالت کرتی ہیں کہ قدیم انسان موت کے بعد دوسری زندگی پر ایمان رکھتا تھا اور اپنے عقائد کے مطابق کچھ فرائض انجام دیتا تھا تاکہ لوگ اس دنیا میں آرام و آسائش حاصل کریں۔

قرآن مجید کی نظر میں معاد

قرآن مجید نے سیکڑوں آیات میں معاد سے لوگوں کو آگاہ کیا ہے، اور اس کے بارے میں ہر قسم کے شک و شبہہ کی نفی کی ہے بصیرت کی افزائش اور عدم امکان کودور کرنے کے لئے اور اشیاء کی اولین خلقت اور خدا کی قدرت مطلقہ کے بارے میں بہت سے مواقع پر لوگوں کو یاد دہانی کراتے ہوئے فرماتا ہے: (اولم یر الانسان انا خلقناہ من نطفۃ فاذا ہو خصیم مبین* و ضرب لنا مثلاونسی خلقہ قال من یحی العظام و ہی رمیم* قل یحییھا الذی انشأھا اوّل مرّۃ و ہو بکل خلقٍ علیم [1]) "تو کیا انسان نے یہ نہیں دیکھا کہ ہم نے اسے نطفہ سے پیدا کیاہے اور وہ یکبارگی ہمارا کھلا ہوا دشمن ہوگیاہے اور ہمارے لئے مثل بیان کرتا ہے اور اپنی خلقت کو بھول گیا ہے، کہتا ہے کہ ان بوسیدہ ہڈیوں کو کون زندہ کرسکتا ہے؟آپ کہہ دیجئے کہ جس نے پہلی مرتبہ پیدا کیا ہے وہی زندہ بھی کرے گا اور وہ

[1] یسین، ۷۷۔۷۹

ہر مخلوق کا بہتر جاننے والا ہے'' اور کبھی جاڑے میں مردہ ہوجانے والی زمین کو بہار میں زندہ کر کے لوگوں کے انکار کو خدا کی قدرت کی طرف متوجہ کیا ہے، چنانچہ فرماتا ہے: (ومن آیاتہ انک تری الارض خٰشعۃ فاذا انزلنا علیھا الماء اہتزّت وربت ان الذی احیاھا لمحي الموتی انہ علی کل شیء قدیر[۱]) ''اور اس کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ تم زمین کو صاف اور مردہ دیکھ رہے ہواور پھر جب ہم نے پانی برسادیا توزمین لہلہانے لگی اور اس میں نشو و نما پیدا ہوگئی، بیشک جس نے زمین کو زندہ کیا ہے وہی مردوں کا زندہ کرنے والا بھی ہے اور یقیناًوہ ہر شے پر قادر ہے'' اور کبھی عقلی استدلال سے سامنے آکر انسان کی خدا داد فطرت کو اس حقیقت کے اعتراف پر ابھارا ہے، چنانچہ فرماتا ہے: (و ما خلقنا السماء و الارض و ما بینھما باطلاً ذلک ظن الذین کفروا فویل للذین کفروا من النار * ام نجعل الذین آمنوا و عملوا الصّٰلحٰت کالمفسدین فی الارض ام نجعل المتقین کالفجار[۲]) ''اور ہم نے آسمان اور زمین او ران کے درمیان کی مخلوقات کو بیکار نہیں پیدا کیا ہے (کیونکہ اگر مقصد یہی ہوتا کہ مثلاً انسان پیدا ہوتا اور چند دن گھومنے کے بعد سوتا اور مرجاتا اور اس طرح دوسرا انسان آتا اور اس سلسلہ کی تکرار ہوتی تو کائنات کی خلقت بیہودہ اورایک کھلونے سے زیادہ نہ ہوتی، جبکہ بیہودہ کام خدا سے کبھی انجام نہیں پاتاہے) یہ تو صرف کافروں کا خیال ہےاور کافروں کے لئے جہنم میں ویل کی منزل ہے کیا ہم ایمان لانے والےاور نیک عمل کرنے والوں کو زمین میں فساد برپا کرنے والوں جیسا قرار دیدیں یا صاحبان تقوی کو فاسق و فاجر افراد جیسا قرار دیدیں ۔ (کیونکہ اس دنیا میں اچھا اور برا کام انجام دینے والے اپنے اعمال کی مکمل جزا نہیں پا سکتے،اگر دوسری دنیا نہ ہوتی، کہ جہاں ان دونوں گروہوں کو ان کی رفتار و کردار کے مطابق واقعی سزاملتی تووہ دونوں گروہ خدا کے نزدیک یکسان ہوتے اور یہ عدل الٰہی کے خلاف ہے) ۔

---

[۱] فصلت،۳۹
[۲] ص،۲۷۔۲۸

موت سے قیامت تک

بدن مرتا ہے نہ کہ روح

اسلام کی نظر میں، انسان ،روح وبدن سے تشکیل پائی ہوئی ایک مخلوق ہے۔انسان کا جسم بھی بذات خود مادہ اور مادہ سے مربوط قوانین کی ترکیبات میں سے ایک ہے ،یعنی اس کے لئے حجم اور وزن ہے۔اس کی زندگی ایک زمان و مکان میں ہے، سردی ،گرمی وغیرہ سے متاثر ہوتا ہے اور تدریجاً بوڑھا اور کمزور ہوتا ہے اور ایک دن خدائے متعال کے حکم سے پیدا ہوا تھا ،آخر کار ایک دن تجزیہ ہو کر نابود ہو جاتا ہے۔ لیکن روح،مادی نہیں ہے اور مادہ کی مذکورہ خاصیتوں میں سے کوئی ایک اس میں نہیں پائی جاتی ہے،بلکہ علم ،احساس،فکر اور ارادہ کی صفت کے علاوہ دوسری معنوی صفات جیسے: محبت ،کینہ ،خوشی غم ،اور امید وغیرہ اس سے مخصوص ہیں ۔اور چونکہ روح میں مادہ کی مذکورہ خصوصتیں نہیں پائی جاتیں۔

لہذا معنوی خاصیتیں بھی مادی خاصیتوں سے الگ ہیں ،بلکہ دل ودماغ اور بدن کے دوسرے تمام اجزاء اپنی بے شمار سرگرمیوں میں روح اور معنوی صفات کے تابع ہوتے ہیں ،اور بدن کے اجزاء میں سے کسی ایک کو فرمانروا کا مرکز قرار نہیں دیا جاسکتا ۔خدائے متعال فرماتا ہے: (ولقد خلقنا الانسٰن من سلٰلةٍ من طین* ثم جعلناہ نطفة فی قرار مکین *ثم خلقنا النطفة علقة فخلقنا العلقة مضغة فخلقنا المضغة عظٰما فکسونا العظٰم لحماً ثم انشأنہ خلقا آخرا[1]...) ''اور ہم نے انسان کو گیلی مٹی سے پیدا کیا ہے پھر اسے ایک محفوظ جگہ پر نطفہ بنا کر رکھا ہے ،پھر نطفہ کو علقہ بنایا ہے اور پھر علقہ سے مضغہ پیدا کیا ہے اور پھر مضغہ سے ہڈیاں پیدا کی ہیں اور پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا ہے ،پھر ہم نے اسے ایک دوسری مخلوق بنا دیا ہے''...

[1] مؤمنون،۱۲،۱۴

اسلام کی نظر میں موت کے معنی

مذکورہ اصل کے مطابق اسلام کی نظر میں موت کا معنی یہ نہیں ہے کہ انسان نابود ہوتا ہے ،بلکہ یہ ہے کہ انسان کی روح لافانی ہے ،بدن سے اسکا رابطہ منقطع ہوجا تا ہے، نتیجہ میں بدن نابود ہو جاتا ہے اور روح بدن کے بغیر اپنی زندگی کو جاری رکھتی ہے ۔خدائے متعال فرماتا ہے: (وقالوأ اذا ضللنا فی الارض أءنا لفی خلق جدید بل ھم بلقاء ربھم کافرون *قل یتوفکم ملک الموت الذی وُکّل بکم ''[1](...اور کہتے ہیں کہ اگر ہم زمین میں گم ہوگئے (مر گئے)تو کیا نئی خلقت میں پھر ظاہر کئے جائیں گے ۔بات یہ ہے کہ یہ اپنے پرور دگار کی ملا قات کے منکر ہیں ۔آپ کہد یجئے کہ تم کو وہ ملک الموت زندگی کی آخری منزل تک پہنچائے گا جوتم پر تعینات کیا گیا ہے۔''

برزخ

اسلام کا نظریہ ہے کہ انسان،مرنے کے بعد ایک خاص طریقے سے زندہ رہتا ہے۔ اگر اس نے نیکی کی ہو تواسے نعمت وسعادت ملتی ہےاور اگربرا تھا تو عذاب میں ہو گا ،اور جب قیامت برپا ہوگی تو اسے عام حساب وکتاب کے لئے حاضر کیا جائے گا۔ جہاں پر انسان مرنے کے بعد قیا مت تک زندگی کرتا ہےاسے ''عالم برزخ'' کہتے ہیں ۔

اس سلسلہ میں خدائے متعال فر ماتا ہے:(...ومن ورآئھم برزخ الی یوم یبعثون[2])...''اور ان کے پیچھے ایک عالم برزخ ہے جو قیا مت کے دن تک قائم رہنے والا ہے'' (ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللّٰہ امواتا بل احیاء عند ربھم یرز قون''[3]اور خبر دار راہ خدا میں قتل ہونے والوں کومردہ خیال نہ کر نا وہ زندہ ہیں اور اپنے پروردگار کے یہاں رزق پا رہے ہیں ۔''قیامت یقینی ہے ہر انسان (بلااستثنا) اپنی خداداد فطرت سے،اچھائی اوربرائی کام میں فرق کو محوس کرتا ہےاور نیک کام کو (اگرچہ اس پر عمل نہ کرتا ہو)اچھا اور لازم العمل جانتا ہےاور برے کام کو(اگر چہ اس میں پھنسا بھی ہو)برااورلازم الاجتناب جانتا ہے ۔اس میں کسی

---

[1] سجدہ،١٠،١١

[2] مؤ منون ،١٠٠

[3] آل عمران ،١٦٩

قسم کا شک و شبہ نہیں ہے کہ اچھائی اور برائی ،نیکی اور بدی ان دو نوں صفتوں میں موجود سزا اور جزا کی جہت سے ہے اور اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ اس دنیا میں کوئی ایسا دن نہیں ہے جس میں اچھے اور برے انسانوں کوان کی اچھائی اور برائی کی سزا اور جزا دی جائے، کیونکہ ہم اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرتے ہیں کہ بہت سے نیک انسان اپنی زندگی انتہائی تلخی اور سختی میں گزارتے ہیں اور بہت سے برے انسان جو گناہ اور ظلم و ستم میں آلودہ ہیں لیکن پھر بھی خوشی اور آرام وآسائش میں زندگی گزارتے ہیں ۔اس بنا پر ،کہ اگر انسان کے لئے اپنے مستقبل میں اور اس دنیا کے علاو دوسری دنیا میں ایک ایسا دن نہ ہو کہ جس میں اس کے نیک اور برے اعمال کا حساب کر کے اسے مناسب سزا و جزا دی جائے یہ نظریہ (نیک کام اچھا اور واجب الاطاعت ہے اور برا کام برا اور واجب الاجتناب ہے)انسان کی فطرت میں قرار پایا ہے ۔

یہ تصور نہیں کیا جانا چاہئے کہ نیک کام کرنے والوں کی جزا جسے انسان اچھا سمجھتا ہے۔ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ معاشرہ کے انتظامات بر قرار ہوتے ہیں اور نیک لوگ زندگی کی سعادت حاصل کرتے ہیں اور نتیجہ میں اس منافع کا ایک حصہ خود نیکی کرنے والے کو ملتا ہے اور اسی طرح بدکار اپنے نا مناسب کردار سے،معاشرہ کو درہم برہم کردیتا ہے اور اسکا نا مناسب کام آخر کار خود اس کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے،کیونکہ یہ تصور اگر چہ سماج کے پسماندہ اور مفلس طبقہ کے لوگو ں میں کسی حدتک پایا جاتاہے .لیکن جو لوگ اپنی قدرت کے عروج پر پہنچے ہیں اور معاشرہ کا انتظام وخلل ان کی خوشبختی اور کامیابی میں موثر نہیں ہے،بلکہ معاشرہ میں جس قدر افراتفری اور فساد ہو اور لوگوں کے حالات بدتر ہوں وہ زیادہ خوشحال اور کامیاب ہوتے ہیں اور کوئی دلیل نہیں ہے کہ ان افراد کی فطرت نیک کام کو نیک اور برے کام کو برا جانے ۔یہ بھی تصور نہیں کرنا چاہئے کہ یہ لوگ اگر چہ اپنی چند روزہ زندگی میں کامیاب رہے ہوں، لیکن کسی وجہ سے ان کا نام ہمیشہ کے لئے عام طور پر آنے والی نسلوں کی نظروں میں ننگ و عار سمجھا جائے گا، کیونکہ ان کے نام کا ننگ وعار کی صورت میں ظاہر ہونا اور لوگوں کا ان کے بارے میں خیال رکھنا اس وقت ہوگا، جب وہ مرچکے ہوں گے اور اس ننگ و عار کا ان کی اس دنیا میں گئے خوشحال او رلذت اندوز زندگی پر کسی قسم کا اثر نہیں پڑے گا ۔اس صورت میں کوئی

دلیل نہیں ہوگی کہ انسان نیک کام کو اچھا جان کر اسے انجام دے اور برے کام کو برا جان کر اس سے پرہیز کرے،اور اس طرح مذکورہ نظریہ کا قائل ہو۔ اگر معاد کا وجود نہ ہو تو یہ اعتقاد قطعا ایک خرافائی اعتقاد ہوگا ۔لہذا ہمیں خالق کائنات کی طرف سے ہماری فطرت میں ودیعت کئے گئے اس مقدس اور مستحکم اعتقاد سے یہ سمجھنا چاہئے کہ معاد کا ہونا ضروری ہے اور انسان کے لئے ضرور ایک دن ایسا آئے گا، جس دن اسے خالق کائنات کے حضور اس کی رفتار و کردار کے حساب و کتاب کے لئے پیش کیا جائے گا جہاں پر اسے نیک کاموں کی جزااو ربرے کاموں کی سزادی جائے گی۔

عدل: خدائے متعال،عادل اوردادرس ہے،کیونکہ ''عدل''صفات کمالیہ میں سے ایک ہے،اور خدائے متعال تمام صفات کمالیہ کا مالک ہے ۔اس کے علاوہ خدائے متعال اپنے کلام پاک میں عدل کی بار بارتعریف ا ور ظلم وستم کی مذمّت کرتا ہے،اور لوگوں کو عدل کا حکم دیتاہے اور ظلم سے روکتا ہے ۔یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ جس چیز کوبرا سمجھتاہو وہ خود اس میں پائی جاتی ہواور جس چیز کو نیک اور خوبصورت سمجھتا ہو وہ اس میں موجود نہ ہو ! سورۂ نساء میں فرماتا ہے: (ان اللّٰہ لا یظلم مثقال ذرّة ''[1]...خدائے متعال ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا ''،نیز سورۂ کہف میں فرماتاہے: (...ولا یظلم ربّک احد ''[2]تیرا پروردگار کسی پر ظلم نہیں کرتا ہے' اسی طرح سورۂ نساء میں فرماتا ہے: (ما اصابکَ من حسنة فمن اللّٰہ و ما اصابأ من سیّءة فمِن نَّفسک''[3]...تم تک جو بھی اچھائی اور کامیابی پہنچی ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جو بھی برائی پہنچی ہے وہ خود تمہاری طرف سے ہے ۔

سورۂ سجدہ میں فرماتا ہے: (الذّی احسن کل شیء خلقه ''[4]...اس نے ہرچیز کو حسن کے ساتھ بنایاہے۔ ''اس بناپر،ہر مخلوق اپنی جگہ پر انتہائی حسن کے ساتھ خلق کی گئی ہے ۔بعض مخلوقات میں جو بدصورتی نا مناسب یا عیب ونقص پایا جاتا ہے،وہ موازنہ اور نسبت کی وجہ سے پیش آتا ہے ۔مثلا سانپ اور بچھو کا وجود ہماری نسبت بد اور نا مناسب ہے اور کانٹے کو جب پھول سے موازنہ کیا جاتاہے

---

[1] نساء،۴۰
[2] کہف،۴۹
[3] نساء،۷۹
[4] سجدہ،۱

تو کائنات زیبا نہیں ہوتا،لیکن یہ سب اپنی جگہ پر حیرت انگیز مخلوق اور سرا پا خو بصورت ہیں ۔دوسرے الفاظ میں یہ کہا جائے کہ تمام اشیاء اپنے وجوداور وجود کی بقا میں جس جس چیز کی محتاج ہین اور ان میں سے جو عیب پایا جاتا ہے ،وہ انھیں خود رفع نہیں کر سکتیں اور وہ اتفاقی طور پر اور خود بخود بھی رفع نہیں ہوسکتا ۔

بلکہ یہ سب عالم مشہود سے مافوق ایک مقام کی طرف سے فراہم کئے جاتے ہیں ۔وہی ہے جو ہر حاجت اور عیب کو دور کرتا ہے ،البتہ خودہر حاجت وعیب سے پاک و منزہ ہے ورنہ دوسرے مبداء کی ضرورت پڑے گی جواس کے عیب و نقص کودور کرے اور اس صورت میں وہ خود بھی عالم کے ضرورت مندوں میں سے ایک قرار پائے گا ۔وہی ہے ،جو اپنی لامتنا ہی قدرت اور علم سے کائنات کی ہر مخلوق کو وجود بخشتا ہے کائنات اور کائنات میں موجود ہ ہر شئی کو تکامل کی شاہراہ پر ناقابل استثناء قوانین کے ذریعہ مقصد اور کمال کی منزل کی طرف راہنمائی کرتا ہے اس بیان سے یہ نتیجہ نکلتے ہیں: ا۔خدائے متعال کائنات میں ،مطلق سلطنت کا مالک ہے اور ہر مخلوق جووجود میں آتی ہے اور ہرواقعہ جو رونما ہوتا ہے ،ان کا سرچشمہ اس کا حکم وفرمان ہے ۔

چنانچہ فرماتا ہے: (...لہ الملک و لہ الحمد[1]... مطلق سلطنت اوربادشاہی اسی سے مخصوص ہے اور حقیقت میں ہر ستائش کا وہی سزاوار ہے کیونکہ نیکی اور اچھائی اسکی خلقت سے پیدا ہوئی ہے '' (...اِن الحکم الاّ للّٰہ[2] '' ...حقیقت میں ہر حکم خدائے متعال کی طرف سے ہے''

۲۔خدائے متعال عادل ہے ،کیونکہ عدالت حکم میں یا اس کے جاری ہونے کی صورت میں یہ ہے کہ اس میں استثنا اور امتیاز نہیں ہے ۔یعنی جو مواقع حکم سے مربوط ہیں وہ یکساں ثابت ہوں اور جو مواقع قا بل نفاذ ہیں وہ یکساں نافذ کئے جائیں ۔چنانچہ معلوم ہوا کہ کائنات اور اس میں موجود چیزوں کا نظم و نسق کچھ ناقابل استثنا قوانین کے سایہ میں ہیں۔جن کا مجموعہ قانون علیت و معلولیت ہے ۔

---

[1] تغابن،۱
[2] یوسف،۴۰

چل رہا ہے ۔مثلاً آگ کچھ خاص شرائط کے ساتھ ،ایک جلنے والی چیز کو جلائے گی ، خواہ یہ کالا کوئلہ ہو یا ہیرا ،خشک لکڑی ہو یا ایک ضرورت مند مفلس کا لباس ۔اس کے علاوہ جس نے عدالت کو نظرانداز کیا،وہ اپنی کچھ ضرورتوں کو پورا کرنے کیلئے ظلم و ستم کو انجام دیتا ہے ۔خواہ یہ ضرورت مادی ہو جیسے کوئی شخص دوسرے کے مال کو لوٹ لیتا ہے اور اپنے انبار میں اضافہ کرتا ہے یا معنوی ضرورت ہو جیسے کوئی شخص دوسروں کے حقوق پر تجاوز کر کے یا قدرت اثرورسوخ اور تسلط کا اظہار کر کے لذت محوس کرتا ہے ۔چنانچہ یہ معلوم ہوا کہ،خالق کائنات کی ذات اقدس کے بارے میں کسی قسم کی حاجت قابل تصور نہیں ہے اور جو بھی حکم اس کے منبع جلال سے جاری ہوتا ہے،اگر ایک تکوینی حکم ہے تو وہ عام مصلحتوں کو پورا کرنے کے لئے ہے کہ خلقت کے لئے جس کی مراعات ضروری ہے اور اگر ایک تشریعی حکم ہے تو وہ اس کے بندوں کی سعادت اور خوشبختی کے لئے ہے اور اس کا نفع انہی کو ملتا ہے۔خدائے متعال اپنے کلام پاک میں فرماتا ہے: (ان اللہ لایظلم مثقال ذرةِ[1]''...

خدائے متعال ذرہ برابر ظلم نہیں کرتاہے'' (...وما اللہ یرید ظلماً للعباد) (غافر،۳۱) ''خدائے متعال اپنے بندوں پر ظلم کرنا نہیں چاہتاہے ۔''

امامت اور امت کی رہبری:اسلامی معاشرہ کے دینی اور دینوی امور کی سرپرستی کو ''امامت'' کہتے ہیں۔امامت دین اسلام کے مقدس اصولوں میں سے ایک مسلم اصول ہے ۔جن آیات میں خدائے متعال نے اپنے دین کی تشکیل کوبیان کیا ہے ،ان میں اس مطلب کی بھی وضاحت کی ہے ''امامت''کا مقصد لوگوں کی دنیا میں دین کی رہبری کرنا ہے اور پیشوا شخص کو ''امام'' کہتے ہیں۔شیعوں کا عقیدہ ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد خدائے متعال کی طرف سے ایک امام معین ہونا چاہئے تاکہ وہ معارف اور دینی احکام کا محافظ ونگہبان ہو اور حق کی طرف لوگوں کی راہنمائی کرے ۔جب ایک ملک میں ایک حکومت تشکیل پاتی ہے اور وہ لوگوں کے عمومی کام کا نظم و نسق ہے ،تو وہ کام خود بخود انجام نہیں پاتا ،بلکہ اگر کچھ شائستہ افراد اور

[1] نساء،۴۰

ماہر لوگ اس کی حفاظت کی کوشش نہ کریں تونظام باقی ہی نہ رہے اور لوگوں کو اپنے فوائد سے بہرہ مند بھی نہ کر سکے ۔ ۔انسانی معاشرہ میں جو بھی ادارہ وجود میں آتا ہے ،جیسے ثقافتی اور مختلف اقتصادی ادارے ،وہ بھی یہی حکم رکھتے ہیں اور ہر گز قابل وشائستہ مدیروں سے بے نیاز نہیں ہیں ورنہ بہت ہی کم مدت میں نابود ہو جائیں ۔یہ ایک واضح حقیقت ہے ،جسے سادہ لوح انسان بھی سمجھتا ہے اور بہت سے تجربوں اورآزمائشوں سے بھی اس کے صحیح ہونے کی گواہی ملتی ہے ۔بیشک دین اسلام کا نظام بھی یہی حکم رکھتا ہے کہ جس کے بارے میں جرأت کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ دنیا کا سب سے بڑانظام ہے اور وہ اپنی بقااور حفاظت میں بھی مدیروں کا محتاج ہے اور ہمیشہ شائستہ افراد کو چاہتا ہے تاکہ وہ اس کے قوانین اور معارف کو لوگوں تک پہنچائیں اور اس کے دقیق ضوابط اور قوانین کواسلامی معاشرہ میں نافذ کریں اور ان کی رعایت اور حفاظت میں کسی قسم کی غفلت ولا پر وائی نہ کریں ۔

دوسرے اعتبار سے، یہ کہ ہم نے نبوت کی دلیل میں ذکر کیا ہے ،کہ خلقت کے مقاصد میں سے ایک مقصد لوگوں کی سیدھے راستہ پر ہدایت کرنا ہے ۔جس طرح خدائے متعال نے اپنی تمام مخلوقات کی ضرورتوں کو پورا کیا ہے اور ان کی ترقی کے وسائل کو ان کے اختیار میں دیدیا ہے ،اس طرح اس کے أے ضروری ہے کہ انسان کے صحیح عقاأد ،پسندیدہ اخلاق اور نیک کاموں کی ضرورتوں کو پور کرنے کے لئے انبیاء کو بھیجے تا کہ وہ اس کےپیغام کو لوگوں تک پہنچائیں۔

اسی دلیل کی بنا پر ، خدائے مہربان کو چاہئے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ لیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد دین کی حفاظت اور لوگوں کی ہدایت کے لئے امام اور پیشوا معین کرے اور لوگوں کوان کی مرضی پر نہ چھوڑے ،جو اکثراوقات ہواوہوس سے مغلوب ہوتی ہے ۔جس طرح پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لوگوں کی ضرورتوں اور انسان کی انفرادی و اجتماعی بیماریوں کے علاج سے آگاہ کیا اور ان کو ہر طرح کے سہو ونسیان سے محفوظ رکھا ،اسی طرح ضروری ہے کہ امام اور ایک دینی پیشواکو بھی علم و عصمت عطا کرے ۔اس عقلی دلیل سے واضح ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد لوگوں کی ہدایت ،دین کے تحفظ او راسلام کے قوانین کو نافذ کرنے کیلئے خدا کی طرف سے امام معین ہو ۔

امام کی ضرورت پر ایک نقلی دلیل

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مختلف طریقوں سے روایت کی گئی ہے کہ امت اسلامیہ کے لئے آپکی رحلت کے بعد بعض پیشوا اور امام ہیں جو آپ کے جانشین ہوں گے ۔ایک معروف روایت ،جسے شیعہ وسنی راویوں نے نقل کیا ہے ،آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا '': امام بارہ افراد ہوں گے اور سب کے سب قریش سے ہوں گے[1] ''۔ایک اور مشہور روایت میں آنحضرتؐ نے جابر انصاری سے فرمایا '':امام بارہ افراد ہیں[2] ''اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک ایک کرکے ان کے نام بتائے اور جابر سے فرمایا '':تم اماموں میں سے پانچویں امام کو درک کروگے ،ان کو میرا اسلام کہنا[3] ''

اس کے علاوہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت امیرالمؤمنین علی علیہ السلام کو (خصوصاً)اپنے جانشین کے طور پر تعیین فرمایا ہے،آپؑ نے بھی اپنے بعد والے امام کا تعارف کرایا ،اسی طرح ہر امام نے اپنے بعد والے امام کا تعارف کرایا ۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جب سے تاریخ بشریت کا آغاز ہوا اور انسانیت کے خاندان میں اجتماعی زندگی بڑھتی گئی،تو دنیا کے اطراف واکناف میں ،چھوٹے یا بڑے ،ترقی یافتہ یا غیر ترقی یافتہ معاشرے وجود میں آتے گئے ،لیکن حاکم اور سرپرست کے بغیر کوئی معاشرہ زیادہ دنوں تک باقی نہ رہ سکا ۔جہاں پر بھی کوئی معاشرہ تشکیل پایا اس میں ایک حاکم اور سر پرست قہر و غلبہ یاانتخاب کے ذریعہ ہوا کرتا تھا ،یہاں تک کہ چھوٹے اور چند افراد پر مشتمل خاندانوں میں بھی یہی طریقہ رائج تھا ۔بیشک یہاں پر انسان اپنی خداداد فطرت سے سمجھتا ہے کہ ہر معاشرہ کے لئے ایک سر پرست کی ضرورت ہے۔ خدائے متعال فرماتا ہے: (فاقم وجھک لِلدّین حنیفاً فطرت اللہ الّتی فطر النّاس علیھا لاتبدیل لخلق اللہ ذٰلک الدّین القیّم ''[4]...آپ اپنے رخ کو دین کی طرف رکھیں اور باطل سے کنارہ کش رہیں کہ یہ دین وہ فطرت الٰہی ہے جس پر اس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے اور خلقت الٰہی میں کوئی تبدیلی نہیں

---

[1] احمد بن حنبل،مسند،ج۵،ص۹۲۔
[2] ینابیع المودہ ،باب ۷۷،ص۵۰۳۔
[3] ینابیع المودہ،باب ۹۴،ص۵۵۳و۵۵۴۔
[4] روم ،۳۰

ہو سکتی ہے۔یقیناًیہی سیدھا اور مستحکم دین ہے''پروردگار عالم،اس آیہ شریفہ میں اپنے دین کو دین فطرت سے تعبیر کرتا ہے اور بیان فرماتا ہے کہ اس مقدس دین کے احکام ان چیزوں کے مطابق ہیں کہ جن کو انسان اپنی خالص فطرت سے سمجھتا ہے ۔خدائے متعال ،اس آیہ شریفہ میں،انسان کے تمام فطری ادراکات اور اس کی خالص فطرت کے فیصلوں کو معتبر قرار دیتا ہے اور ان کی تائید کرتا ہے ان فطری فیصلوں میں سے ایک معاشرہ کی سرپرستی اور اسکی باگ ڈور سنبھالنا ہے۔

ولایت کے بارے میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بیان خدائے متعال اپنے پیغمبر اکرم کی توصیف میں فرماتا ہے: (لقد جاء کم رسول من انفسکم عزیزعلیہ ما عنتّم حریصُ علیکم بالمؤمنین رؤف رّحیم[1]) ''یقیناتمہارے پاس وہ پیغمبر آیا ہے جو تمھیں میں سے ہے اوراس پر تمہاری ہر مصیبت شاق ہوتی ہے وہ تمہاری ہدایت کے بارے میں حرص رکھتا ہے اور مومنین کے حال پر شفیق اور مہربان ہے''اس بات پر ہرگز یقین نہیں کیا جاسکتا ہے کہ وہ پیغمبرؐجو قرآن مجید کی نص کے مطابق اپنی امت پر تمام لوگوں سے زیادہ ہمدردو مہربان تھا،وہ احکام الٰہی میں سے ایک حکم کے بارے میں اپنی پوری عمر خاموش رہے،اور اس کے بیان سے چشم پوشی کرے جو اسلامی معاشرہ میں بلا شک و شبہ پہلے درجہ کی اہمیت کا حاصل ہو اور عقل سلیم اور فطرت کے مطابق ہو۔پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمام لوگوں سے بہتر جانتے تھے کہ اسلام کا تشکیل پایا ہوا یہ وسیع نظام (جو دنیا کے وسیع ترین نظاموں میں سے ہے)صرف دس بیس سال تک کے لئے نہیں ہے کہ اس کی سرپرستی کو آپ خود کریں ،بلکہ یہ نظام عالم بشریت کو ہمیشہ چلانے والا ہے ۔چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے بعد ہزاروں سال تک کے حالات کے بارے میں دور اندیشی فرماتے تھے،اور اس سلسلہ میں ضروری احکام جاری فرماتے تھے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جانتے تھے کہ دین،ایک اجتماعی نظام ہے اور کوئی بھی اجتماعی نظام حاکم اور سرپرست کے بغیر ایک گھنٹہ کے لئے بھی زندہ باقی نہیں رہ سکتا ۔اس بنا پر ،سرپرستی ضروری ہے تاکہ دین کے معارف اور قوانین کی حفاظت کی جائے اور معاشرہ کے نظام کو چلایا جا سکے اور لوگوں کی دنیاوآخرت کی سعادت کی طرف

[1] توبہ،١٢٨

رہنمائی ورہبری کی جائے ۔لہذا کیسے ممکن ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی رحلت کے بعد آنے والے کل کو بھول جائیں یا اس کے بارے میں کوئی دلچپی نہ رکھیں؟پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب کبھی جنگ یاحج کے لئے صرف کچھ دنوں کے لئے مدینہ سے باہر تشریف لے جاتے تھے ،تو لوگوں کے امور کو چلانے کے لئے کسی نہ کسی کو اپنا جانشین مقرر فرماتے تھے اوراسی طرح مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہوئے شہروں کے لئے گورنر مقرر فرماتے تھے اور جنگ پر روانہ ہونے والے فوجی لشکر یاگروہ کے لئے کمانڈر اورامیر مقرر فرماتے تھے اور کبھی اس حد تک فرماتے تھے کہ: ''تم لوگوں کا امیر فلاں شخص ہے اگر وہ ماراگیا تو فلاں شخص ہوگا ''۔پیغمبر اکرمؐ کی اس روش کے باوجود کیسے یقین کیا جاسکتا ہے کہ آپؐ نے اپنے سفر آخرت کے موقع پراپنی جگہ پر کسی کو معین نہیں کیا ہوگا؟

مختصر یہ کہ جو بھی شخص گہری نگاہ سے اسلام کے بلند مقاصد اور ان کولانے والے عظیم الشان پیغمبر کے مقصد پر نظر ڈالے ،توکسی شک وشبہہ کے بغیر تصدیق کرے گا کہ مسلمانوں کے لئے ولایت وامامت کا مسئلہ حل شدہ اور واضح ہو چکا ہے ۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ جانشین کا تقرر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے بعد مسلمانوں کے امور کی سرپرستی اور مسئلہ ولایت کے سلسلہ میں صرف سربستہ بیانات پرہی اکتفا نہیں فرمایا بلکہ پہلے ہی دن سے توحید ونبوت کی دعوت کے ساتھ ساتھ مسئلہ ولایت کو بھی واضح طور پر بیان فرمایا اور دین ودنیا کے تمام امور میں حضرت علی علیہ السلام کی سرپرستی اور جانشینی کو تمام مسلمانوں میں اعلان فرمایا ۔جیسا کہ بیان ہوا،اس روایت کے مطابق جسے شیعہ وسنی راویوں نے نقل کیا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب پہلے دن اعلانیہ دعوت دینے پر مامور ہوئے ۔توآپؐ نے اپنے رشتہ داروں کو دعوت دی اورانھیں ایک جگہ پر جمع کیا اوراس محفل میں حضرت علی علیہ السلام کے وزیر، وصی اور خلیفہ ہونے کوآشکار طور پر ثابت اور مستحکم فرمایا اوراسی طرح اپنی زندگی کے آخری ایام میں غدیر خم کے مقام پر ایک لاکھ بیس ہزار کے ایک عظیم مجمع میں حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھ کو پکڑ کر بلند کرکے فرمایا '': من کنت مولاہ فھذا علی مولاہ '''،جس جس کا میں مولا ہوں،اس کے یہ علیؑ بھی مولا ہیں'' امامت کی ضرورت پر

ایک دلیل چنانچہ نبوت کی بحث میں واضح ہوا کہ خالق کائنات کا اپنی مخلوق پر عنایت وتوجہ کا تقاضا یہ ہے کہ اپنی مخلوقات میں سے ہر مخلوق کی معین مقصد (جو کمال کے درجہ تک پہنچنا ہے) کی طرف رہنمائی کرے مثال کے طورپر پھل دار درخت کی رشد،نمو،کونپلیں کھلنے اور پھل دینے کی طرف راہنمائی کی جائے اور اسکی زندگی کا طریقہ ایک پرندہ کی زندگی کے طریقہ سے جدا ہے ۔اس طرح ایک پرندہ بھی اپنی زندگی خاص راستہ کو طے کرتا ہے اور اپنے خاص مقصد کے پیچھے جاتاہے،نہ کہ درخت کے راستہ اور مقصد کے پیچھے،اسی طرح ہر مخلوق کی اپنی منزل مقصود تک پہنچنے اور مناسب راستہ کو طے کرنے کے علاوہ کسی اور چیز کی طرف راہنمائی نہیں کی جاتی اور معلوم ہے

کہ انسان بھی خدا کی ایک مخلوق ہونے کے ناطے ہدایت کے اس کلی قانون میں شامل ہے ۔واضح ہوا کہ انسان کی زندگی کی سعادت چونکہ خود اس کے اختیار اور ارادہ سے حاصل ہوتی ہے ،لہذا ہدایت الٰہی اور،دعوت وتبلیغ بھی انبیاء اور دین کو بھیجنے کے ذریعہ ہونی چاہئے تاکہ خدائے متعال پر انسان کی کوئی حجت باقی نہ رہے ۔

ذیل کی آیت اسی معنیٰ پر دلالت کرتی ہے:(رسلاً مّبشّرین ومنذرین لئلاّیکون للناس علی اللّٰہ حجۃ بعد الرّسل[1]) ''یہ سارے رسول بشارت دینے والے اور ڈرانے والے اس لئے بھیجے گئے تاکہ رسولوں کے آنے کے بعد انسانوں کی حجت خدا پر قائم نہ ہونے پائے''،جو دلیل پیغمبروں کے بھیجنے اور دین کی دعوت کی برقراری کا تقاضا کرتی ہے وہی دلیل اس چیز کا بھی تقاضا کرتی ہے کہ،اپنی عصمت سے دین کی حفاظت اور لوگوں کی رہبری کرنے والے پیغمبر کی رحلت کے بعد ، خدائے متعال کو چاہئے کہ اوصاف کمالی میں (وحی ونبوت کے علاوہ)آپؐکے مانند ایک شخص کو آپؐ کا جانشین مقرر فرمائے تاکہ وہ دین کے معارف اوراحکام کی کسی انحراف کے بغیر حفاظت کرے اور لوگوں کی رہنمائی کرے ،ورنہ عام ہدایت کا نظام درہم برہم ہو جائے گا اور خدائے متعال پر لوگوں کی حجت تمام ہوجائے گی ۔

---

[1] نساء،۱٦۵

امام کی ضرورت

عقل میں چوں کہ خطا ولغزش پائی جاتی ہے لہذا وہ لوگوں کو خدا کے پیغمبروں سے بے نیاز نہیں کر سکتی،اسی طرح امت میں علمائے دین کی موجودگی اورانکی دینی تبلیغات،لوگوں کو امام کے وجود سے مستغنی نہیں کر سکتے،کیونکہ،جیسا کہ واضح ہوا کہ بحث اس میں نہیں ہے کہ لوگ دین کی پیروی کرتے ہیں یا نہیں،بلکہ بحث اس چیز میں ہے کہ خدا کا دین کسی قسم کی تحریف وتبدیلی یانابودی کے بغیر لوگوں تک پہنچ سکے ۔معلوم ہے کہ علمائے امت کتنے بھی صالح اور متقی ہوں،لیکن خطاو گناہ سے محفوظ و معصوم نہیں ہیں اور بعض معارف اوردینی قوانین کا ان سے پائمال ہونا یا تبدیل ہونا،اگرچہ عمداً نہ ہو،محال نہیں ہے ۔اس کی بہترین دلیل اسلام میں گوناگون مذاہب اوراختلافات کا وجود میں آنا ہے ۔لہذا،ہر حالت میں امام کا وجود لازم اور ضروری ہےتاکہ دین خدا کے معارف اور اس کے حقیقی قوانین اس کے پاس محفوظ رہیں اور جب بھی لوگوں میں استعداد پیدا ہو جائے وہ ان کی رہنمائی سے استفادہ کر سکیں ۔

امام کی عصمت

مذکورہ بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ امام کو بھی پیغمبر کے مانند خطاو معصیت سے محفوظ ہونا چاہئے،کیونکہ اگر ایسا نہ ہو تو دین کی دعوت ناقص رہے گی اور الٰہی ہدایت اپنا اثر کھودے گی ۔

امام کے اخلاقی فضائل

امام میں شجاعت،شہامت،عفت،سخاوت اور عدالت جیسی اخلاقی فضیلتیں موجود ہونی چاہئیں،کیونکہ جو معصیت سے محفوظ ہے وہی تمام دینی قوانین پر عمل کرتا ہے اور پسندیدہ اخلاق دین کی ضروریات میں سے ہیں اس لئے اس کو اخلاقی فضائل میں تمام لوگوں سے افضل ہونا چاہئے،کیونکہ کسی کا اپنے سے برتر وبالاتر کی رہبری کرنا بے معنی اور عدل الٰہی کے منافی ہے ۔

امام کا علم

چونکہ امام دین کا حامل اور تمام لوگوں کا پیشوا ہوتا ہے ،لہذا ضروری ہے کہ وہ لوگوں کی دنیا وآخرت اور انسان کی سعادت سے متعلق تمام مسائل کا علم رکھتا ہو،کیونکہ عقل کے مطابق جاہل کا پیشوا بننا جائز نہیں ہے اور عام الٰہی ہدایت کی رو سے بھی یہ بے معنی ہے ۔

ائمہ ہدیٰ علیہم السلام

ائمہ ہدیٰ علیہم السلام ،جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد آپؐ کے جانشین اوردین ودنیا کے پیشوا ہیں ،بارہ ہیں ۔اس سلسلہ میں شیعہ وسنی دونوں نے پیغمبر اکرمؐ سے بے شمار روایتیں نقل کی ہیں اور ان ائمہؑ میں سے ہر ایک نے اپنے بعد آنے والے امام کو معین فرمایا ہے۔ائمہ علیہم السلام کے اسمائے گرامی

۱۔ حضرت امیرالمؤمنین علی بن ابیطالب علیہ السلام

۲۔ حضرت امام حسن مجتبٰی علیہ السلام

۳۔ حضرت امام حسین سید الشہداء علیہ السلام

۴۔ حضرت امام سجادزین العابدین علیہ السلام

۵۔ حضرت امام محمد باقرعلیہ السلام

٦۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام

۷۔ حضرت امام موسی کاظم علیہ السلام

۸۔ حضرت امام علی رضا علیہ السلام

۹۔ حضرت امام محمد تقی علیہ السلام

۱۰۔ حضرت امام علی نقی علیہ السلام

۱۱۔ حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام

۱۲۔ حضرت امام عصر، حجتہ بن الحسن، عجل اللہ تعالی فرجہ الشریف

ائمۂ اطہار علیہم السلام کی عام سیرت

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد بارہ امام ۲۵۰ سال تک لوگوں کے درمیان تھے۔ لیکن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے دن سے ہی ان کے مخالفین پیدا ہوئے اور ہر ممکن وسیلہ سے، خلافت کے عہدے کو غصب کرکے دین کے فطری راستہ کو منحرف کردیا اس کے علاوہ مذکورہ مخالفین کا گروہ ہر احتمالی خطرے کے مقابلہ میں اپنی حیثیت کو مستحکم کرنے اوراپنی حکومت کی حفاظت میں، اہل بیت پیغمبر اسلام کے نور کو ہر وسیلہ سے بجھانے کے درپے تھے، ہر بہانہ سے ان پر دباؤ ڈالتے، جسمانی اذیتیں پہنچاتے، حتیٰ یہاں تک کہ قتل کرنے کی کوششیں بھی کرتے تھے۔

اسی سبب سے ائمہ ھدی، علیہم السلام عام اصلاحات کے سلسلہ میں کچھ نہیں کر سکتے تھے، یا اسلامی معاشرہ میں اسلام کے معارف و قوانین اور سیرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وسیع پیمانے پر پھیلانے سے قاصر تھے۔ یہاں تک کہ امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام بھی اپنی ظاہری خلافت کے پانچ سال کے دوران، اندورونی اختلافات اور طلحہ، زبیر، عائشہ اور معاویہ جیسے دعویداروں اور دیگر بانفوذ صحابیوں کی رخنہ اندازیوں کی وجہ سے ان سے خونین جنگیں لڑتے رہے اوراپنے عالی مقاصد اور اصلاحات تک دلخواہ صورت میں نہ پہنچ سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ائمہ ھدیٰ خدا کی طرف سے اپنی مسؤلیت اور ذمہ داری کے مطابق معاشرہ میں عمومی تعلیم

وتربیت ،خاص افراد کی تعلیم وتربیت اور معاشرہ کی عمومی اصلاحات،جیسے (حتی الامکان) امربالمعروف اورنہی عن المنکر کرنے پر اکتفا کی ۔یعنی دین کے معارف وقوانین کو کھلم کھلا طور پر معاشرہ میں بیان کرنے اورزمام حکومت کو اپنے ہاتھ میں لیکر معاشرہ کو دین کی اعلی مصلحتوں کے مطابق چلانے کے بجائے بااستعداد اورخاص افراد کی تربیت پر اکتفا کرتے تھے کیونکہ اس کے علاوہ ان کے لئے ممکن ہی نہیں تھا ۔وہ لوگوں کی خاطر وقت کی حکومتوں کے سامنے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے قیام کیا کرتے تھے تاکہ اس طرح دین کو نابود ہونے سے بچالیں اورخدا کا نورانی دین ،تدریجی طور پر خاموشی کے ساتھ نورافشانی کرتا رہے اور آگے بڑھتا رہے اور ایک دن پھر سے پہلی حالت پیدا کرکے دنیا کواپنے نورسے منور کردے ۔

ائمہ ھدیٰ علیہم السلام میں سے ہر ایک کی زندگی کے حالات اور امامت کے زمانے میں ان کی روش کی تحقیقات سے یہ حقیقت مکمل طور پر واضح ہوجاتی ہے ۔

پیغمبراکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیت علیہم السلام

عرف اورلغت میں ''اہل بیت '' اور مرد کا خاندان، مرد کے گھر کے چھوٹے معاشرے کے افرادکو کہا جاتا ہے،جن میں بیوی ، بیٹے،بیٹیاں اور نوکر شامل ہوتے ہیں جو مجموعی طورپر صاحب خانہ کے سائے میں زندگی بسر کرتے ہیں ۔بعض اوقات ''اہل بیت '' کے معنی کوعمومیت دے کراس لفظ کو اپنے قریبی رشتہ داروں جیسے باپ ،ماں ،بھائی،بہن ،چچا ،پھوپھی ،ماموں ،خالہ اور ان کی اولاد کے لئے استعمال کیا جاتا ہے ۔لیکن قرآن مجید اور احادیث میں لفظ کلمہ ''اہل بیت '' سے مذکورہ دو عرفی و لغوی معنی میں سے کوئی بھی معنیٰ مراد نہیں ہے ۔کیونکہ شیعہ و سنی سے منقول متواتر احادیث کے مطابق ''اہل بیت ''ایک ایسا عطیہ ہے جو حضرت پیغمبراکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ،حضرت علیؑ، حضرت فاطمہ زہراؑ ،حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین علیہم السلام سے مخصوص ہے۔اس بنا پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل خانہ اور دوسرے رشتہ دار،اگر چہ عرف و لغت کے لحاظ سے اہل بیت شمار ہوتے ہیں، لیکن اس اصطلاح کے اعتبار سے اہل بیت نہیں ہیں،یہاں تک کہ حضرت خدیجہ کبریٰ سلام اللہ علیہا ،جو پیغمبر اکرم

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سب سے زیادہ معززو محترم بیوی اور حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی والدۂ گرامی تھیں اہل بیت میں شمار نہیں ہوتیں اور اسی طرح آنحضرتؐ کے صلبی بیٹے حضرت ابراہیمؑ بھی ''اہل بیت'' کے اس زمرے میں شامل نہیں ہیں ۔ لیکن ان روایتوں اور دیگر احادیث کی روسے بارہ اماموں میں سے دوسرے نو امام، جو فرزند امام حسین علیہ السلام کی اولاد اور آپؑ کی نسل میں ہیں، اہل بیتؑ میں ہیں ۔ اس بناء پر اہل بیت چودہ معصومین علیہم السلام ہیں اور معمولا ''اہل بیت پیغمبر'' وہ تیرہ افراد ہیں جو پیغمبر کے بعد آپکی عترت کے طور پر مشہور ہیں ۔

پیغمبرؐ کے اہل بیت علیہم السلام، اسلام میں بہت سے فضائل ومناقب اور ناقابل موازنہ مقامات کے مالک ہیں، کہ ان میں سے درج ذیل دو مقام سب سے اہم ہیں: ۱۔ آیۂ شریفہ (...انما یرید اللہ لیذہب عنکم الرجس اہل البیت ویطہرکم تطہیراً[1]) کی روسے مقام عصمت وطہارت پر فائز تھے، اس مقام کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ہرگز گناہ کے مرتکب نہیں ہو سکتے۔

۲۔ حدیث ثقلین، جو متواتر حدیث ہے اور اس سے پہلے اسکی طرف اشارہ کیا گیا، کی روسے، عترت ہمیشہ قرآن مجید کے ہمراہ ہیں اور ان میں کبھی جدائی پیدا نہیں ہو سکتی یعنی وہ قرآن مجید کے معنی اور دین مبین اسلام کے مقاصد کو سمجھنے میں کبھی خطا ولغزش سے دوچار نہیں ہو سکتے۔ ان دو مقامات کا لازمہ یہ ہے کہ اسلام میں اہل بیت علیہم السلام کا قول وفعل حجت ہے (جیسا کہ شیعوں کا عقیدہ ہے)

اہل بیت علیہم السلام کی عام سیرت

اہل بیت علیہم السلام پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم وتربیت کے مکمل نمونہ ہیں اور ان کی سیرت بالکل پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت ہے۔ البتہ ۲۵۰ سال کا عرصہ (۱۱ھ یعنی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت سے ۲۶۰ھ یعنی حضرت حجت عج کی غیبت تک) ائمہ ھدی علیہم السلام نے لوگوں کے ساتھ گزارا، اس مدت میں ان کی زندگی مختلف حالات اور

[1] احزاب ۳۳

مراحل سے گزری کہ جن میں ائمہ اطہارؑ کی زندگی مختلف شکلوں میں ظاہر ہوئی،لیکن وہ اصلی مقصد یعنی اصول دین وفروع دین کوانحرافات اور تبدیل ہونے سے بچایا اور حتی الامکان لوگوں کی تعلیم وتربیت سے دست بردار نہیں ہوئے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ۲۳سال کی تبلیغ کے دوران، زندگی کے تین مراحل طے کئے ۔ابتدائی تین سال کے دوران مخفیانہ تبلیغ انجام دیتے تھے ،اس کے بعد دس سال تک کھلم کھلا تبلیغ میں مشغول رہے ،لیکن اس مدت کے دوران خود آپؐ اور آپکے پیرو انتہائی دباؤاور نہایت جسمانی اذیتوں میں زندگی گزارتے تھے اور ہر قسم کی عملی آزادی سے محروم تھے جو معاشرہ کی اصلاح میں اثر انداز ہوتی ہے ،اور اسکے بعد والے دس سال (جو ہجرت کے بعد میں ہیں)،آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک ایسے ماحول میں تھے کہ جس کا مقصد حق وحقیقت کو زندہ کرنا تھا،اور اسلام دن بہ دن فاتحانہ طورپر آگے بڑھ رہا تھا اور ہر لمحہ لوگوں کے لئے علم وکمال کا ایک نیا باب کھل رہا تھا ۔البتہ واضح ہے کہ ان تین مختلف مراحل کے مختلف تقاضے تھے جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت کو۔جس کا مقصد حق وحقیقت کو زندہ کرنے کے علاوہ کچھ نہیں تھا ۔گوناگوں صورتوں میں ظاہر کرتے ہیں۔

ائمہ ھدیٰ کے زمانہ میں جو مختلف اور گوناگوں حالات رونما ہوئے ،وہ تقریباً پیغمبر اسلامؐ کی ہجرت سے پہلے تبلیغی زمانہ سے شباہت رکھتے ہیں ۔ کبھی ائمہ اطہار ؑکے لئے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے پہلے تین سال کی طرح کسی بھی صورت میں اظہار حق ممکن نہیں تھا اور (وقت کے)امام بڑی احتیاط سے اپنا فریضہ انجام دیتے تھے،چنانچہ چوتھے امامؑ کے زمانہ میں اور چھٹے امامؑ کی آخری عمر میں یہی حالت تھی ۔ کبھی ہجرت سے پہلے دس سال کے مانند ،کہ جس مین پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ میں اعلانیہ طور پر دعوت دیتے تھے اور آپؐ ہر طرف سے اپنے پیروؤں پر کفار کی اذیتوں کی وجہ سے پریشان تھے،امام بھی معارف دین کی تعلیم اوراحکام کی اشاعت میں مشغول ہو جاتے تھے،لیکن وقت کے حکام انھیں جسمانی اذیت وتکلیف پہنچانے میں کوئی کسر باقی نہ رکھتے تھے اور ان کے لئے ہردن کوئی نہ کوئی مشکل ایجاد کرتے تھے۔البتہ،پیغمبر اکرم کی ہجرت کے بعد والے ماحول کے مانند جو زمانہ کسی حدتک ہے وہ امیرالمؤمنین حضرت علی علیہ السلام کی خلافت ظاہری کے پانچ سال کا زمانہ ، حضرت فاطمہ زہرا سلام

علیہااور امام حسن علیہ السلام کی زندگی کا تھوڑا سا زمانہ اور امام حسین علیہ السلام اور آپ کے اصحاب کا مختصر اور چند روزہ زمانہ تھا ،کہ جس میں حق و حقیقت اور کھلم کھلا طور پر ظاہر ہو رہی تھی اور صاف و شفاف آئینہ کی طرح پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے کے جیسے حالات پیش کئے جارہے تھے ۔خلاصہ یہ کہ ائمہ اطہار علیہم السلام ،مذکورہ مواقع کے علاوہ وقت کے حکمرانوں اور فرمانرواؤں کی آشکارا طور پر بنیادی مخالفت نہیں کر سکتے تھے،اس لئے اپنی رفتار وگفتار میں تقیہ کا طریقہ اپنانے پر مجبور تھے تاکہ وقت کے حکام کے ہاتھ کوئی بہانہ نہ آسکے ،اسکے باوجود ان کے دشمن گونا گوں بہانے بناکر ان کے نور کو خاموش کرنے اور ان کے آثار کو مٹانے میں کوئی دقیقہ فرو گزار نہیں کرتے تھے ۔

وقت کے حکّام کے ساتھ ائمہ اطہارؑ کے اختلافات کا اصلی سبب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے بعد اسلامی معاشرہ میں تشکیل پانے والی مختلف حکومتیں ،کہ جو اسلامی حکومت کا لیبل لگائے ہوئے تھیں ،وہ سب کی سب اہل بیت علیہم السلام سے بنیادی مخالفت رکھتی تھیں اور اس ختم نہ ہونے والی دشمنی کی ایک ایسی جڑ تھی جو کبھی خشک نہیں ہوتی تھی ۔یہ سچ ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اہل بیت علیہم السلام کے فضائل اور مناقب بیان فرمائے تھے کہ ان میں سے اہم ترین فضیلت معارف قرآن اور ان کا حلال و حرام کا جاننا تھا ،جس کی وجہ سے ان کے مقام کا احترام اور تعظیم کرنا تمام امت پر واجب تھا ،لیکن امت نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس نصیحت اور تاکید کا حق ادا نہ کیا ۔

بیشک پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب پہلے دن دعوت دی تو سب سے پہلے اپنے رشتہ داروں کو اسلام کی دعوت دی اور حضرت علی علیہ السلام کو اپنا جانشین مقرر کیا اور اپنی زندگی کے آخری دنوں میں بھی غدیر خم میں اور دوسرے مقامات پر آپؑ کی جانشینی کا اعلان کیا ۔لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد لوگوں نے دوسروں کو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جانشین منتخب کیا اور اہل بیت علیہم السلام کو ان کے مسلم حق سے محروم کردیا ،لہذا وقت کے حکام اہل بیتؑ کو ہمیشہ اپنا خطرناک رقیب سمجھتے رہے اور ان سے خائف رہتے تھے ،اور ان کا خاتمہ کرنے کے لئے گونا گوں امکانات اور وسائل سے استفادہ

کرتے تھے ۔لیکن اہل بیت علیہم السلام اور اسلامی حکومتوں کے درمیان اختلافات کا سب سے بڑا سبب کچھ اور تھا اگر چہ حکومت اسلامی مسلۂ خلافت کے فروعات میں سے تھی۔اہل بیت اطہار علیہم السلام امت اسلامیہ کے لئے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت کی اطاعت کو ضروری سمجھتے تھے اور اسلامی حکومت کو اسلام کے آسمانی احکام کی رعایت،تحفظ اور نفاذ کے لئے ذمہ دار سمجھتے تھے،لیکن جو اسلامی حکومتیں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد تشکیل پائیں،جیسا کہ ان کی کارکردگی سے ظاہر ہے،وہ اسلامی احکام کو مکمل طور پر نافذ کرنے کی رعایت اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت کی اطاعت کرنے کی پابند نہیں تھیں ۔

خدائے متعال اپنے کلام پاک میں کئی جگہوں پر،پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اور اسی طرح امت کو آسمانی احکام میں تبدیلی ایجاد کرنے سے منع فرماتا ہے یہاں تک کہ دینی احکام اور قوانین میں چھوٹی سے چھوٹی خلاف ورزی کی تنبیہ فرماتا ہے اور پیغمبر اسلامصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی انہی ناقابل تغییر احکام وقوانین کی روشنی میں،لوگوں کے درمیان ایک ایسی سیرت اختیار ہوئے تھے کہ دینی قوانین کو نافذ کرنے میں زمان ومکان اوراشخاص کے لحاظ سے کسی قسم کا فرق نہیں کرتے تھے۔آسمانی احکام کی رعایت کرنا ہر ایک کے لئے یہاں تک کہ خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے واجب تھا اور یہ احکام ہرایک کے حق میں لازم الاجرا تھےاور شریعت ہر حال میں اور ہر جگہ پر زندہ اور نافذ تھی ۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی مساوات و عدالت کے نتیجہ میں لوگوں سے ہر قسم کے امتیاز وفرق کو ہٹایا تھا ۔خود آنحضرت،جو خدا کے حکم سے واجب الاطاعت حاکم و فرمانروا تھے،اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں تمام لوگوں کی نسبت اپنے لئے کسی قسم کے امتیاز کے قائل نہیں تھے،عیش وعشرت سے پرہیز فرماتے تھے،اپنی حکومتی حیثیت میں کسی قسم کے تکلف سے کام نہیں لیتے تھے،اپنی حیثیت کی عظمت کو لوگوں کے سامنے ظاہر نہیں فرماتے تھےاور جاہ وحشم کا مظاہرہ نہیں کرتے تھےاور آخر کار دوسروں سے ایک معمولی اورظاہری امتیاز سے بھی پہچانے نہیں جاتے تھے ۔لوگوں کے مختلف طبقات میں سے کوئی

طبقہ امتیاز کے بل بوتے پر دوسروں پر فضیلت نہیں جتلاتا تھا ،عورت و مرد،اونچے اور نچلے طبقہ کے لوگ ،غنی و فقیر،قوی وکمزور ،شہری ودیہاتی اور غلام وآزاد سب ایک صف میں تھے اور کوئی بھی اپنے دینی فرائض سے زیادہ کا پابند نہ تھا اور معاشرہ کے قوی لوگوں کے سامنے جھکنے اور ظالموں کے سامنے حقیر ہونے سے معاشرہ کا ہر فرد محفوظ تھا۔

تھوڑا غورو فکر کرنے سے ہمارے لئے واضح ہو جاتا ہے (مخصوصاًپیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد سے آج تک جو ہم نے اندازہ کیا ہے) کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اپنی سیرت سے صرف یہ مقصد تھا کہ اسلام کے آسمانی احکام لوگوں میں عادلانہ اور مساوی طورپر نافذ ہو جائیں اور اسلام کے قوانین انحراف اورتبدیل ہونے سے محفوظ رہیں ،لیکن اسلامی حکومتوں نے اپنی سیرت کو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت سے مطابق وہم آہنگ نہیں کیا اور روش کو بدل دیا جس کے نتیجہ میں:

۱۔اسلامی معاشرہ میں نہایت کم وقت کے اندر شدید ترین صورت میں طبقاتی اختلافات رونما ہوئے اور مسلمان طاقتور اور کمزور دو گروہوں میں تقسیم ہوگئے اور اس طرح ایک گروہ کی جان و مال اور عزت دوسرے گروہ کے ہوا وہوس کا کھلونا بن گئی ۔

۲۔اسلامی حکومتیں اسلامی قوانین میں تدریجی طور پر تبدیلیاں پیدا کرنے لگیں اور کبھی اسلامی معاشرہ کی رعایت کے نام پر اور کبھی حکومت اور حکومت کی سیاسی حیثیت کے تحفظ کے عنوان سے دینی احکام پر عمل کرنے اوراسلامی قوانین کے نفاذ سے پہلوتہی کی گئی ۔یہ طریقہ دن بدن وسیع تر ہوتا گیا ۔یہاں تک کہ اسلامی حکومت کے نام پر چلنے والے ادارے اسلامی قوانین کی رعایت اور انہیں نافذ کرنے میں کسی قسم کی ذمہ داری کا احساس نہیں کرتے تھے۔معلوم ہے جب عام قوانین وضوابط کو نافذ کرنے والے افراد ہی مخلص نہ ہوں گے توان قوانین کاکیا حشر ہوگا!

خلاصہ اور نتیجہ

مذکورہ گفتگو سے معلوم ہوا کہ اہل بیت علیہم السلام کی معاصر اسلامی حکومتیں وقت کی مصلحتوں کے پیش نظر اسلامی قوانین میں تصرف کرتی تھیں اور ان ہی تصرفات کی وجہ سے ان کی سیرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت سے بالکل مختلف ہوتی تھی۔ لیکن اہل بیت علیہم السلام قرآن مجید کے حکم کے مطابق پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت کے احکام کو ہمیشہ کے لئے ضروری جانتے تھے۔ انہی اختلافات اور تضاد کے سبب وقت کی طاقتور حکومتوں نے اہل بیت علیہم السلام کا خاتمہ کرنے کے لئے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا اور ان کے نور کو بجھانے کے لئے ہر ممکن وسیلہ سے استفادہ کرتے تھے۔ اہل بیت اطہار علیہم السلام بھی اپنی الٰہی ذمہ داری کے مطابق، اپنے سخت اور منحوس دشمنوں کی طرف سے فراوان مشکلات سے دوچار ہونے کے باوجود، دین کے حقائق کی تبلیغ کر رہے تھے اور صالح افراد کو تعلیم دینے اور ان کی تربیت کرنے سے پیچھے نہیں ہٹتے تھے۔

اس مطلب کو سمجھنے کے لئے کافی ہے کہ ہم تاریخ کی طرف رجوع کریں اور حضرت علی علیہ السلام کی پانچ سالہ حکومت میں شیعوں کی اکثریت کو ملاحظہ کریں، کیونکہ تھوڑا غور کرنے سے ہم سمجھ لیں گے کہ یہ اکثریت حضرتؑ کی اسی ۲۵ سالہ گوشہ نشینی کے دوران وجود میں آئی۔ اسی طرح حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کے گھر پر گروہ در گروہ آنے والے شیعہ تھے جو خاموشی کے ساتھ حضرت امام سجاد علیہ السلام کے تربیت یافتہ تھے، یہ حقائق کے ایسے خوشہ چین تھے کہ حضرت امام موسیٰ ابن جعفر علیہ السلام حتی زندان کے ایک تاریک گوشہ میں بھی ان کی اشاعت فرماتے تھے۔

آخر کار اہل بیت علیہم السلام کی مسلسل تعلیم و تربیت کے نتیجہ میں، شیعہ جو پیغمبر اکرم کی رحلت کے وقت ایک معمولی تعداد میں تھے، ائمہ اطہار علیہم السلام کے آخری زمانے میں ایک بڑی تعداد میں تبدیل ہوئے۔ اہل بیت علیہم السلام کے کردار میں ایک استثنائی نکتہ جیسا کہ بیان کیا گیا، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیت علیہم السلام نے اپنی زندگی کا زمانہ مظلومیت اور محکومیت میں گزارا اور اپنی ذمہ داریوں کو تقیہ کے ماحول اور انتہائی سخت حالات میں انجام دیا۔ ان میں سے چار معصومین کی زندگی بہت کم مدت

کے لئے نسبتاً آزادانہ اور بلا تقیہ نظر آتی ہے۔ لہذا ہم ان چار شخصیتوں یعنی حضرت علیؑ، حضرت فاطمہؑ اور حسنینؑ علیہما اسلام کی تاریخ زندگی اور کردار کا اجمالی جائزہ پیش کرتے ہیں ۔

اہل بیت علیہم السلام کے فضائل

شیعہ اور سنی راویوں نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپؐ کے اہل بیتؑ کے مناقب میں ہزاروں احادیث نقل کی ہیں ہم یہاں پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیتؑ کے فضائل میں سے تین کو بیان کرتے ہیں کہ جن کے پہلے خود آنحضرتؐ ہیں: ا سنہ ۶ ہجری میں، شہر نجران کے نصرانیوں نے اپنے چند بزرگوں اور دانشوروں کو چن کر ایک وفد کی صورت میں مدینہ بھیجا ۔ اس وفد نے پہلے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مناظرہ اور کٹ حجتی کی، لیکن مغلوب ہوئے، اور خدائے متعال کی طرف سے آیۂ مباہلہ نازل ہوئی: (فمن حاجّک فیہ من بعد ما جاءک من العلم فقل تعالوا ندع ابناءنا وابناءکم ونساءنا ونساءکم وانفسنا وانفسکم ثم نبتھل فنجعل لعنت اللہ علی الکاذبین "[1]) پیغمبر! علم کے آجانے کے بعد جو لوگ تم سے کٹ حجتی کریں ان سے کہہ دیجئے کہ آؤ ہم لوگ اپنے اپنے فرزند، اپنی اپنی عورتوں اور اپنے اپنے نفسوں کو بلائیں اور پھر خدا کی بارگاہ میں دعا کریں اور جھوٹوں پر خدا کی لعنت قرار دیں ۔ "

اس آیہ شریفہ کے حکم کے مطابق پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نجران کے وفد کو مباہلہ کی دعوت دیدی، اس طرح سے کہ آپؐ، عورتوں اور فرزندوں کے ساتھ حاضر ہو کر جھوٹوں پر لعنت کریں تاکہ خدائے متعال ان کے لئے عذاب نازل کرے۔ نجران کے وفد نے مباہلہ کی تجویز کو قبول کیا، اور دوسرے ہی دن مباہلہ کا وقت مقرر کیا گیا ۔ دوسرے دن مسلمانوں کی بڑی تعداد اور نجران کا وفد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تشریف لانے کا منتظر تھا کہ دیکھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کس شان و شوکت کے ساتھ تشریف لاتے ہیں اور کن لوگوں کو مباہلہ کے لئے اپنے ساتھ لا رہے ہیں ۔ انہوں نے دیکھا کہ پیغمبر اکرم

---

[1] آل عمران، ٦١

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس شان سے تشریف لارہے ہیں کہ آپ کی آغوش میں حسین علیہ السلام ہیں اور حسن علیہ السلام ہاتھ پکڑے ہوئے ہیں، آپؐ کے پیچھے آپ کی بیٹی فاطمہ سلام اللہ علیہا اور ان کے پیچھے علی علیہ السلام ہیں اور آپؐ ان سے فرمارہے ہیں کہ جب میں دعا کروں توتم لوگ آمین کہنا ۔ اس نورانی وفد، جن کے وجود سے حق و حقیقت نمایاں تھی ،جو خدا کی پناہ گاہ کے سوا کسی پناہ گاہ پر بھروسہ کئے ہوئے نہیں تھے ،نے نجران کے وفد کو لرزہ بر اندام کردیا ،ان کے سردار نے اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر کہا :

''خدا کی قسم !میں ایسے چہروں کو دیکھ رہا ہوں کہ اگر یہ بارگاہ الہیٰ میں دعا کریں گے تو روئے زمین پر تمام نصاریٰ نابود ہو جائیں گے''۔اس کے بعد وہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مباہلہ سے دست بردار ہونے کی عذر خواہی کی ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا : لہذا اسلام لاؤ۔

انہوں نے کہا :اسلام لانے سے بھی معذور ہیں ۔

آپؐ نے فرمایا : تو پھر ہم تم لوگوں سے جنگ کریں گے۔

انہوں نے کہا : مسلمانوں سے لڑنے کی ہم میں طاقت نہیں ہے ،لیکن سالانہ جزیہ دیں گے اور اسلام کی پناہ میں زندگی کریں گے اسطرح اختلاف ختم ہوا ۔مباہلہ میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ حضرت علیؑ، حضرت فاطمہ زہراؑ اور حسنینؑ کے آنے سے واضح ہوا کہ آیہ شریفہ (ابنائنا ونسائنا وانفسنا)، پیغمبرؐ، علیؑ، فاطمہؑ، اور حسن وحسینؑ علیہم السلام کے علاوہ کوئی اور نہ تھا ۔دوسرے الفاظ میں یہ کہا جائے کہ جو پیغمبر نے ''اپنے نفس'' فرمایا اس سے مقصود خود آپؐ اور علیؑ تھے ،اور یہ جو فرمایا ''اپنی عورتیں ''اس سے مقصود فاطمہؑ تھیں اور یہ جو فرمایا ''اپنے فرزند'' اس سے مقصود ''حسنینؑ'' تھے ۔یہاں پر اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ علی علیہ السلام بمنزلۂ خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں ۔اور یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیت علیہم السلام چار افراد تھے ،کیونکہ شخص کے ہر اہل بیت، وہ لوگ ہیں کہ جن کا تعارف وہ خود کلمہ ''انفس ،نسائنا وابنائنا'' (ہمارے نفس، ہماری

عورتیں ،اور ہمارے بچوں) سے کرائے ہیں .اگر اہل بیتؑ میں ان کے علاوہ کوئی اور ہوتا توپیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کو بھی مباہلہ کے لئے ہمراہ ضرورلے آتے ۔اس سے ان چار ہستیوں کی عصمت ثابت ہوتی ہے،کیونکہ خدائے متعال پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیت علیہم السلام کی عصمت وطہارت کی گواہی دے رہا ہے: (...انما یرید اللہ لیذہب عنکم الرّجس اہل البیت و یطہرکم تطہیرا[1]) ''بس اللہ کا ارادہ ہے اے اہل بیت !تم سے ہر برائی کودور رکھے اور تم کو اس طرح پاک وپاکیزہ رکھے جو پاک وپاکیزہ رکھنے کا حق ہے ۔''

۲۔جیسا کہ عامہ وخاصہ (سنی وشیعہ)نے نقل کیا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایاہے '': مثلُ اہلِ بیتی کمثلِ سفینۃ نوحَ مَن رَکبہا نجیٰ وَمن تخلّف عنھا غرق ''''میرے اہل بیت کی مثال نوحؑ کی کشتی کے مانند ہے،جواس میں سوار ہوااس نے نجات پائی اور جس نے اس سے روگردانی کی وہ غرق ہوگیا۔''

۳۔پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ایک اور متواترہ روایت میں،جسے عامہ وخاصہ نے نقل کیا ہے،فرمایا ہے '': انی تارک فیکم الثقلین :کتاب اللہ وعترتی اہل بیتی لن یفترقا حتی یردا علیَّ الحوض ما ان تمسّکتم بہما لن تضلّوابعدی''میں تمہارے درمیان دوگراں قدر چیزیں چھوڑ رہا ہوں ،جو کبھی ایک دسرے سے جدا نہیں ہوں گی یہ دو چیزیں خدا کی کتاب اور میرے اہل بیتؑ ہیں جب تک ان دونوں سے متمسّک رہوگے،گمراہ نہیں ہوگے۔

ائمہ علیہم السلام کی تقرری

حضرت علی علیہ السلام کی امامت (جیسا کہ معلوم ہوا)خدا کی طرف سے اور پیغمبراکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نص سے تھی،اور اسی طرح دوسرے ائمہ علیہم السلام جو حضرت علی،کے بعد تھے،ہر امام نے اپنے بعد والے امام کا خدا کے حکم سے لوگوں میں تعارف کیاہے۔ چنانچہ حضرت علی علیہ السلام پہلے امام اور مسلمانوں کے پہلے پیشوا تھے،آپؑ نےاپنی شہادت کے وقت اپنے بیٹے

[1] احزاب۳۳)

امام حسن علیہ السلام کا تعارف کرایا اور امام حسن علیہ السلام نے بھی اپنی شہادت کے موقع پر اپنے بھائی حضرت امام حسین علیہ السلام کا تعارف کرایا اوراسی طرح بارہویں امام تک سلسلہ رہا ۔ہرامام سے اپنے بعد والے امام کے بارے میں نص کے علاوہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی (عامہ وخاصہ سے نقل کی گئی بہت سی حدیثوں کے مطابق)اماموں کے بارہ ہونے کے بارے میں یہاں تک کہ بعض حدیثوں میں ان کے ناموں کے ساتھ تعارف کرایا ہے ۔

ائمہ معصومین علیہم السلام کی زندگی کاایک مختصر جائزہ

حضرت امام علی علیہ السلام (مسلمانوں کے پہلے امام)

حضرت امیرالمومنین علی بن ابیطالب علیہ السلام پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم وتربیت کے پہلے کامل نمونہ تھے ۔ علی علیہ السلام نے بچپن سے ہی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دامن میں پرورش پائی تھی ،اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے آخری لمحہ تک ایک سایہ کے مانند ساتھ ساتھ رہے اور آپکی شمع وجود کے گرد پروانہ کی طرح پرواز کرتے رہے ۔جب آخری بار آپؑ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جدا ہوئے یہ وہ لمحہ تھا جب آپؑ نے آنحضرتؐکے جسد مطہر کوآغوش میں لے کر سپرد خاک کیا۔ حضرت علی علیہ السلام ایک عالمی شخصیت ہیں ۔دعوی کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ جتنی گفتگو اس عظیم شخصیت کے بارے میں ہوئی ہے ،اتنی کسی بڑے سے بڑے عالمی شخصیت کے بارے میں نہیں ہوئی ہے ۔

شیعہ وسنی اور مسلم وغیر مسلم دانشوروں اور مصنفوں نے حضرت علی علیہ السلام کی شخصیت کے بارے میں ایک ہزار سے زائد کتا بیں تالیف کی ہیں ۔آپؑ کے بارے میں دوست ودشمن بے شمار تحقیق اور کھوج کے باوجود آپؑ کے ایمان میں کسی قسم کا کمزور نقطہ پیدا نہیں کر سکے یاآپؑ کی شجاعت،عفت،معرفت،عدالت اور دوسرے تمام پسندیدہ اخلاق کے بارے میں شمہ برابر نقص نہیں نکال سکے،کیونکہ آپؑ ایک ایسے شخص تھے ،جو فضیلت وکمال کے علاوہ کسی چیز کو نہیں پہچانتے تھے اور اسی طرح آپؑ میں فضیلت وکمال کے علاوہ کوئی چیز نہیں پائی جاتی تھی ۔تاریخ گواہ ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت سے آج تک جتنے حکّام نے اسلامی معاشرہ میں حکومت کی ان میں صرف حضرت علی علیہ السلام ایسے ہیں کہ جنہوں نے اسلامی معاشرہ پر اپنی حکومت کے دوران پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت پر پوری طرح عمل کیا اور آنحضرتؐ کی روش سے ذرہ برابر منحرف نہیں ہوئے اوراسلامی قوانین اور شریعت کو کسی قسم کے دخل وتصرف کے بغیر اسی طرح نافذ کیا ،جس طرح پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کی حیات میں نافذ ہوئے تھے ۔ دوسرے خلیفہ کی وفات کے بعد نئے خلیفہ کو معین کرنے کے لئے خلیفہ دوم کی وصیت کے مطابق جو چھ رکنی کمیٹی بنا ئی گئی تھی، اس میں کافی گفتگو کے بعد خلافت کا مسئلہ علیؑ اور عثمان کے درمیان تذبذب میں پڑا علیؑ کو خلافت کی پیشکش کی گئی ،لیکن اس شرط پرکہ ''لوگوں میں خلیفہ اول اور دوم کی سیرت پر عمل کریں''،حضرت علیؑ نے ان شرائط کوٹھکراتے ہوئے فرمایا: ''میں اپنے علم سے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھوں گا۔''اس کے بعدوہی شرائط عثمان کے سامنے رکھی گئیں ،انہوں نے قبول کیا اور خلافت حاصل کی،اگر چہ خلافت ہاتھ میں آنے کے بعددوسری سیرت پر عمل کیا ۔

علی علیہ السلام نے راہ حق میں جن جاں نثاریوں،فداکاریوں اور عفو و بخشش کا مظاہرہ کیا ہے ان میں آپ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب میں بے نظیر تھے ۔اس حقیقت سے ہرگزانکار نہیں کیاجاسکتا ،کہ اگراسلام کا یہ جاں نثار اور سورمانہ ہوتا ،توکفارو مشرکین ہجرت کی رات کو،اس کے بعد بدرواحد،خندق وخیبر وحنین کی جنگوں میں نبوت کی شمع کوآسانی کے ساتھ بجھا کر حق کے پرچم کو سرنگوں کر دیتے۔ علی علیہ السلام نے جس دن سماجی زندگی میں قدم رکھا ،اسی لمحہ سے انتہائی سادہ زندگی گزارتے تھے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات میں ،آپکی رحلت کے بعد ،یہاں تک کہ اپنی با عظمت خلافت کے دنوں میں فقیروں اور پسماندہ ترین افراد جیسی زندگی بسر کرتے تھے ،خوراک ،لباس اور مکان کے لحاظ سے معاشرہ کے غریب ترین افراد میں اور آپ میں کوئی فرق نہیں تھا اورآپؑ فرماتے تھے ۔''

ایک معاشرے کے حاکم کواس طرح زندگی بسر کرنی چاہئے کہ ضرورت مندوں اور پریشان حال افراد کے لئے تسلی کا سبب بنے نہ ان کے لئے حسرت اور حوصلہ شکنی کا باعث ہو[1]۔''علی علیہ السلام اپنی زندگی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے محنت و مزدوری کرتے تھے، خاص کر کھیتی باڑی سے دلچسپی رکھتے تھے ،درخت لگاتے تھے اور نہر کھودتے تھے ،لیکن جو کچھ اس سے کماتے تھے یا جنگوں میں جومال غنیمت حاصل کرتے تھے ،اسے فقرا اورحاجتمندوں میں تقسیم کردیتے تھے ۔جن زمینوں کو آباد کرتے

[1] نہج البلاغہ فیض الاسلام ،خطبہ ۲۰۰،ص۶۶۳۔

تھے انھیں یا وقف کرتے تھے یا ان کو بیچ کر پیسے حاجتمندوں کو دیتے تھے ۔ اپنی خلافت کے دوران ایک سال حکم دیا کہ آپؑ کے اوقاف کی آمدنی کو پہلے آپؑ کے پاس لایا جائے پھر خرچ کیا جائے۔ جب مذکورہ آمدنی جمع کی گئی تو یہ سونے کے ۲۴ ہزار دینار تھے ۔ علی علیہ السلام نے اتنی جنگوں میں شرکت کی لیکن کبھی کسی ایسے دشمن سے مقابلہ نہ کیا جسے موت کے گھاٹ نہ اتار دیا ہو ۔ آپؑ نے کبھی دشمن کو پیٹھ نہ دکھائی اور فرماتے تھے ''؛ اگر تمام عرب میرے مقابلہ میں آجائیں اور مجھ سے لڑیں تو بھی میں شکست نہیں کھاؤں گا اور مجھے کوئی پروا نہیں ہے ۔''

علی علیہ السلام ایسی شجاعت وبہادری کے مالک تھے کہ دنیا کے بہادروں کی تاریخ آپؑ کی مثال پیش نہ کر سکی ،اس کے باوجود آپ انتہائی مہربان،ہمدرد،جوانمرد اور فیاض تھے۔ جنگوں میں عورتوں ، بچوں اور کمزوروں کو قتل نہیں کرتے تھے اور ان کو اسیر نہیں بناتے تھے بھاگنے والوں کا پیچھا نہیں کرتے تھے۔ جنگ صفین میں معاویہ کے لشکر نے سبقت حاصل کر کے نہر فرات پر قبضہ کرلیا اور آپؑ کے لشکر پر پانی بند کر دیا ، حضرت علی علیہ السلام نے ایک خونین جنگ کے بعد نہر سے دشمن کا قبضہ ہٹا دیا،اس کے بعد حکم دیا کہ دشمن کے لئے پانی کا راستہ کھلا رکھیں ۔

خلافت کے دوران کسی رکاوٹ اوردربان کے بغیر ہر ایک سے ملاقات کرتے تھے اورتنہااورپیدل راستہ چلتے تھے ، گلی کوچوں میں گشت زنی کرتے تھے اور لوگوں کو تقوی کی رعایت کرنے کی نصیحت فرماتے تھے اور لوگوں کو ایک دوسروں پر ظلم کرنے سے منع کرتے تھے ،بے چاروں اور،بیوہ عورتوں کی مہربانی اور فروتنی سے مدد فرماتے تھے ۔ یتیموں اورلاوارثوں کو اپنے گھر میں پالتے تھے ،ان کی زندگی کی ضرورتوں کو ذاتی طور پر پورا کرتے تھے اوران کی تربیت بھی کرتے تھے ۔

حضرت علی علیہ السلام علم کو بے حد اہمیت دیتے تھے اورمعارف کی اشاعت کے میں خاص توجہ دیتے تھے ،اور فرماتے تھے '' ؛نادانی کے مانند کوئی درد نہیں ہے[1] ''جمل کی خونین جنگ میں آپؑ اپنے لشکر کی صف آرائی میں مشغول تھے ،ایک عرب نے

---

[1] شرح غرر الحکم ،ج۲،ص۳۷۷،ح۲۸۸۲۔

سامنے آ کر ''توحید'' کے معنی پوچھے ۔لوگ ہر طرف سے عرب پر ٹوٹ پڑے اور اس سے کہا گیا ایسے سوالات کا یہی وقت ہے؟!حضرتؑ نے لوگوں کو اعرابی سے ہٹا کر فرمایا '': ہم لوگوں سے ان ہی حقائق کو زندہ کرنے کے لئے لڑ رہے ہیں[1] ''اس کے بعد اعرابی کو اپنے پاس بلایا ،اپنے لشکر کی صف آ رائی کرتے ہوئے اعرابی کو ایک دلکش بیان سے مسئلہ کی وضاحت فرمائی ۔اس قسم کے واقعات حضرت علی علیہ السلام کے دینی نظم وضبط اور ایک حیرت انگیز خدائی طاقت کی حکایت کرتے ہیں ۔جنگ صفین کے بارے میں مزید نقل کیا گیا ہے کہ ،جب دو لشکر دو تلاطم دریاؤں کے مانند آپس میں لڑ رہے تھے اور ہر طرف خون کا دریا بہہ رہا تھا ۔ تو حضرتؑ اپنے ایک سپاہی کے پاس پہنچے،اس سے پینے کے لئے پانی مانگا ۔

سپاہی نے لکڑی کا ایک پیالہ نکالااوراس میں پانی بھر کے پیش کیا ،حضرتؑ نے اس پیالہ میں ایک شگاف مشاہدہ کیا اور فرمایا : ''ایسے برتن میں پانی پینا اسلام میں مکروہ ہے ۔''سپاہی نے عرض کی :اس حالت میں کہ جب ہم ہزاروں تیروں اور تلواروں کے حملہ کی زد میں ہیں اس قسم کی دقت کرنے کا موقعہ نہیں ہے!اس سپاہی کو آپؑ نے جو جواب دیا،اس کا خلاصہ یہ ہے: ''ہم ان ہی دینی احکام و قوانین کو نافذ کرنے کے لئے لڑ رہے ہیں اور احکام چھوٹے بڑے نہیں ہوتے ہیں''اس کے بعد حضرتؑ نے اپنے دونوں ہاتھوں کو ملا کر سامنے کیا اور سپاہی نے پیالہ میں بھرا پانی آپؑ کے ہاتھوں میں ڈال دیا ۔

حضرت علی علیہ السلام پیغمبر اسلام کے بعد ایسے پہلے شخص ہیں کہ جنہوں نے علمی حقائق کو فلسفی طرز تفکر یعنی آزاد استدلال میں بیان فرمایااور بہت علمی اصطلاحیں وضع کیں اور قرآن مجید کی غلط قرأت اور تحریف سے حفاظت کے لئے عربی زبان کے قواعد ''علم نحو'' وضع کئے اور ان کو مرتب کیا ۔آپ کی تقریروں ،خطوط اور دیگر فصیح بیانات میں ،معارف الٰہی،علمی،اخلاقی ،سیاسی یہاں تک کہ ریاضی کے مسائل میں جو باریک بینیں پائی جاتی ہے ،یقیناً وہ حیرت انگیز ہیں۔

---

[1] بحارالانوار،ج۳،ص۲۰۷ ،ح۱۔

امام علی علیہ السلام کے فضائل کا خلاصہ

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کو چھ سال کی عمر میں حضرت ابوطالب کے یہاں سے اپنے گھر لے آئے اور ان کی پرورش اپنے ذمہ لے لی۔ حضرت علی علیہ السلام اسی دن سے ایک سایہ کے مانند پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ساتھ رہے اورآنحضرتؐ سے آخری بار اس وقت جدا ہوئے ،جب آپؑ نے آنحضرتؐ کے جسد مطہر کو سپرد خاک کیا۔ حضرت علی علیہ السلام پہلے کامل نمونہ ہیں جو پیغمبر اسلام کی تعلیم وتربیت کے مکتب میں پروان چڑھے۔ آپؑ پہلے شخص ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لائے اور آپؑ ہی سب سے آخر میں حضرتؐسے جدا ہوئے۔ بعثت کے پورے زمانہ میں جو خدمات حضرت علی علیہ السلام نے خدا کے دین کے لئے انجام دیئے ،دوست ودشمن گواہ ہیں کہ وہ خدمات کوئی اورانجام نہیں دے سکا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام نے اسلام کی سب سے اہم جنگوں میں شرکت فرمائی اور جنگ کے تمام خونین میدانوں میں مسلمانوں کے اندر بے مثال بہادری اور کامیابی کا راز آپ ہی تھے۔ چنانچہ بڑے بڑے صحابی جنگوں میں بار ہا بھاگ جاتے تھے ،لیکن آپؑ نے کبھی دشمن کو پیٹھ نہیں دکھائی اور کوئی حریف آپؑ کی تلوار کی وار سے بچ نہ سکا۔

اس بے نظیر شجاعت ،جوضرب المثل بن چکی تھی ،کے باوجودآپ ہمدرداور مہربان تھے ،کبھی اپنے زخمی دشمن کو قتل نہیں کرتے تھے اور جنگ سے بھاگنے والوں کاپیچھا نہیں کرتے تھے۔ حضرت علی علیہ السلام ،اپنی تقریروں،کلمات قصار اور اپنے گوہربار بیانات،جویادگار کے طورپر مسلمانوں کے پاس موجود ہیں ،کے اعتبار سے مسلمانوں میں قرآن مجید کے بلند مقاصد کے بارے میں معروف ترین شخص ہیں۔ آپؑ نے اسلام کے اعتقادی وعلمی معارف کو کما حقہ حاصل کر کے حدیث شریف ''انا مدینۃ العلم وعلی بابھا ''[1]کوثابت کردیا اوراس علم کو عملی جامہ پہنایا۔ حضرت علی علیہ السلام کا دینداری، عفت نفس اورزھدوتقویٰ میں کوئی نظیر نہیں

---

[1] بحار الانوار، ج۴۰،ص۲۰۱۔

تھا۔آپؑ اپنے معاش کے لئے روزانہ محنت ومشقت کرتے تھے، بالخصوص زراعت کو بہت پسند کرتے تھے ۔بنجر زمینوں کوآباد کرتے تھے،نہریں کھودتے تھے،درخت لگاتے تھے،جس جگہ کو آباد کرتے اسے مسلمانوں کے لئے وقف کر دیتے تھے یا اس کو بیچ کر پیسے فقراء میں تقسیم کر دیتے تھے اور خود نہایت زھد وقناعت کے ساتھ فقیرانہ زندگی گزارتے تھے۔ جس دن شہید ہوئے ۔

باوجوداس کے کہ تمام اسلامی ممالک کے فرمانروا تھے ۔آپؑ کی پونجی صرف سات سو درہم تھی جنھیں آپؑ اپنے گھر کے لئے ایک خدمت گار پر صرف کرنا چاہتے تھے۔ حضرت علی علیہ السلام کی عدالت ایسی تھی کہ خدا کے احکام کے نفاذ اور لوگوں کے حقوق کو زندہ کرنے میں ہرگز کسی طرح کے استثناء کے قائل نہیں تھے ۔آپؑ ذاتی طور پر گلی کوچوں میں گشت لگاتے تھے اور لوگوں کو اسلامی قوانین کی رعایت کرنے کی ترغیب دیتے تھے ۔

حضرت امیرالمؤمنین کا طریقہ

چنانچہ ہم جانتے ہیں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد مسلمانوں کے مسائل میں ولی ہونا،آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نص کے مطابق خدائے متعال کی طرف سے حضرت علی علیہ السلام کے لئے مخصوص تھا،لیکن اسے انتخابی خلافت میں تبدیل کیا گیا اور اس طرح خلافت کی کرسی پر دوسرے لوگوں نے قبضہ جمایا ۔ حضرت علی علیہ السلام اورآنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چند خاص صحابیوں جیسے سلمان فارسی ،ابوذرغفاری اورمقداد اسدی نے لوگوں سے ایک اعتراض کیا لیکن انھیں مثبت جواب نہیں ملا۔

حضرت علی علیہ السلام لوگوں سے کنارہ کشی اختیار کرکے ایک مدت تک اپنے گھر میں قرآن مجید جمع کرنے میں مصروف رہے اس کے بعد کچھ خاص صحابیوں اور چند دیگرافراد کی تعلیم وتربیت میں مشغول ہوئے ۔ حضرت علی علیہ السلام کا ماضی درخشان اور بے مثال تھا ۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات میں آپؑ آنحضرتؑ کے وزیر اور اسلامی فتوحات کی کلید تھے.علم ودانش میں،

فیصلہ دینے میں، سخن وری اور دیگر تمام معنوی فضائل میں آپؑ تمام مسلمانوں پر برتری رکھتے تھے ۔اس کے باوجود خلیفہ اول کے زمانے میں اجتماعی مسائل اور عمومی کام میں آپؑ سے کسی قسم کا استفادہ نہیں کیا گیا ،اس لئے آپؑ صرف خدا کی عبادت اور چند اصحاب کی علمی و عملی تربیت میں مشغول رہتے تھے اورایک عام انسان کی طرح زندگی گزارتے تھے ۔

خلیفہ دوم کے زمانے میں بھی کسی کام کوآپ کے حوالہ نہیں کیا جاتا تھا ،لیکن کسی حدتک آپ سے رجوع کرتے تھے اور اہم مسائل میں آپؑ کے نظریات سے استفادہ کیا جاتا اور آپ سے مشورہ لیا جاتا تھا ۔چنانچہ خلیفہ دوم نے بارہا کہا ہے:(اگر علی کی رہنمائی نہ ہوتی ،توعمرہلاک ہوجاتا[1]) ۔ خلیفہ سوم کے زمانہ میں لوگوں کی توجہ آپؑ کی طرف زیادہ ہوئی اوراس پوری ۲۵سالہ مدت میں آپؑ کی تعلیم وتربیت کا دائرہ دن بدن وسیع تر ہوتا گیا یہاں تک کہ مکتب ولایت سے بالواسطہ اور بلاواسطہ تربیت پانے والوں کی ایک بڑی جماعت نے خلیفہ سوم کے قتل کے فورابعد آپؑ کے پاس ہجوم کیا اورآپؑ کوخلافت قبول کرنے پر مجبور کیا ۔

حضرت امیرالمومنین نے خلافت کی باگ ڈور سنبھالتے ہی پیغمبراسلامؐ کی سیرت کو۔جیسے مدتوں سے فراموش کیا گیا تھا۔پھر سے زندہ کیا ۔آپؑ نے مساوات اوراجتماعی عدالت نافذ کرکے تمام بیجا امتیازات کوختم کردیا ۔تمام لاابالی گورنروں اورفرمانرواؤں کو معزول کردیااورانکے بیت المال سے لوٹے گئے مال ودولت اور خلیفہ کی طرف سے مختلف لوگوں کوبے حساب دی گئی جاگیروں و املاک کوضبط کیا،اور دینی ضوابط اورقوانین کی خلاف ورزی کرنے والوں کومناسب سزائیں سنائیں ۔

اثرو رسوخ رکھنے والے لیڈروں اورناجائز منافع حاصل کرنے والوں نے جب دیکھا کہ ان کے ذاتی منافع خطرے میں پڑ رہے ہیں،توانہوں نے مخالفت کاپرچم بلند کر کے عثمان کے خون کابدلہ لینے کے بہانے سے داخلی خونین جنگوں کی آگ بھڑکادی جوحضرتؑ کی مشکلات کاسبب اوراصلاحات رکھنے میں رکاوٹ بن گئیں ۔ حضرت علی علیہ السلام نے اپنی خلافت کے پانچ سالہ دور میں کمر توڑ مشکلات کے باوجود بے شمار افراد کی تربیت کی اوراپنی تقریروں اورفصیح بیانات کے ذریعہ علمی میدان کے مختلف

[1] بحارالانوار،ج۴۰ص۲۲۹۔

ہنر وفنون کے گراں بہا خزانے یادگار کے طور پر چھوڑ دئے ،ان میں سے ایک علم نحو کے اصولوں کا وضع کرنا ہے جو حقیقت میں عربی زبان کے قواعد وضوابط ہیں ۔آپؑ کی بر جستہ شخصیت کے اوصاف ناقابل بیان ہیں ،آپؑ کے فضائل بے انتہا اور بے شمار ہیں ۔تاریخ ہرگز کسی ایسے شخص کو پیش نہیں کر سکتی جس نے آپؑ کے برابر دنیا کے دانشوروں، مصنّفوں اور متفکروں کے افکار کو اپنی طرف جذب کیا ہو۔

حضرت امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام (دوسرے امام)

امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے اپنے والد گرامی کی شہادت کے بعد خلافت کی باگ ڈور سنبھالی۔آپؑ معاویہ کے بلوے کو دبانے کے لئے ایک لشکر کو مسلح اور منظم کرنے میں لگ گئے ۔آپؑ نے لوگوں میں اپنے نانااور والدگرامی کی سیرت کو جاری رکھا ۔لیکن کچھ مدت کے بعد معلوم ہوا کہ معاویہ کی مخفیانہ سازشوں اور ریشہ دوانیوں کی وجہ سے آپؑ کی کوششیں ناکام ہورہی ہیں ،آپؑ کے لشکر کے سردار معاویہ سے سازباز کر چکے ہیں ،اوریہاں تک آمادہ تھے کہ آپؑ کوگرفتار کرکے معاویہ کے حوالہ کردیں یا قتل کردیں ۔بدیہی ہے کہ ایسے حالات میں معاویہ سے جنگ کرنے میں امام حسن مجتبیٰؑ کے لئے شکست و ناکامی یقینی تھی، یہاں تک کہ اگر امامؑ تنہا یا اپنے نزدیک ترین افراد کے ساتھ مقابلہ کرتے ہوئے قتل ہوتے ،تو معاویہ کی سلطنت میں کسی قسم کی ہلچل نہ مچتی اور لوگوں کے دلوں پر بھی کوئی اثر نہ ہوتا،کیونکہ معاویہ اپنی مخصوص شاطرانہ چال سے آسانی کے ساتھ آپؑ کو مختلف ذرایع حتی اپنے ہی افراد کے ذریعہ قتل کراسکتا تھا،اس کے بعد لباس عزا پہن کر آپؑ کی انتقام کا دعویٰ کر کے فرزند پیغمبرؐ کے خون سے اپنے دامن کو دھوسکتا تھا ۔ان ناگفتہ بہ حالات کے پیش نظر حضرتؑ امام حسن مجتبی علیہ السلام نے معاویہ کی طرف سے صلح کی تجویز کو کچھ شرائط کے ساتھ قبول کیا اور خلافت سے دستبردار ہوگئے ۔لیکن معاویہ نے تمام شرائط کو پامال کرکے ان میں سے کسی ایک پر عمل نہیں کیا ۔حضرت امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے اس طرح اپنی ،اپنے بھائی حضرت امام حسینؑ اور اپنے چند اصحاب کی جان کو یقینی خطرہ سے بچالیا اور اپنے خاص اصحاب کا ایک مختصر ومحدود لیکن حقیقت پر مبنی معاشرہ تشکیل دیا اور اصلی اسلام کو بالکل نابود ہونے سے بچالیا ۔البتہ معاویہ

ایسا شخص نہیں تھا جو امام حسن مجتبیٰؑ کے مقصد اورآپؑ کے منصوبہ سے بے خبر رہتا،اس لئے صلح بر قرار ہونے اور پورے طور پر تسلط جمانے کے بعد معاویہ نے حضرت علی علیہ السلام کے دوستوں اورحامیوں کو جہاں کہیں پایا ان کو مختلف ذرائع سے نابود کردیا ،اگرچہ صلح کے شرائط میں سے ایک شرط یہ تھی کہ خاندان رسالتؐ کے حامی اوردوست امان میں رہیں گے۔بہر حال معاویہ نے اپنے بیٹے یزید کی ولی عہدی کے مقدمات کو مستحکم کرنے کے لئے امام حسن مجتبی علیہ السلام کو آپؑ کی بیوی کے ہاتھوں زہر دلا کر شہید کرایا ،کیونکہ صلح نامہ کے دوسرے شرائط میں یہ بھی تھا کہ معاویہ کے بعد خلافت پھر سے حضرت امام حسن مجتبیؑ کو ملے گی ۔

حضرت امام حسین علیہ السلام (تیسرے امام)

حضرت امام حسین علیہ السلام اپنے برادر بزرگوار کے بعد حکم خدا اور اپنے بھائی کی وصیت سے امامت کے عہدہ پر فائز ہوئے او رمعاویہ کی خلافت کے دوران تقریباًدس سال زندگی گزاری اوراس مدت میں اپنے بھائی حضرت امام حسن مجتبی علیہ السلام کی سیرت پر عمل کرتے رہے اور جب تک معاویہ زندہ تھا امامؑ کوئی موثرکام انجام نہ دے سکے ۔تقریباً ساڑھے نوسال کے بعد معاویہ مر گیا ،اور خلافت جو سلطنت میں تبدیل ہو چکی تھی اس کے بیٹے یزید کو ملی ۔

یزید ،اپنے ریاکار باپ کے برعکس ،ایک مست ،مغرور،عیاش،فحاشی میں ڈوبا ہوا اور لاابالی جوان تھا ۔یزید نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالتے ہی مدینہ کے گورنر کو حکم دیا کہ حضرت امام حسین علیہ السلام سے اس کے لئے بیعت لے ورنہ ان کا سر قلم کر کے اس کے پاس بھیجدے ۔اس کے بعد مدینہ کے گورنر نے حکم کے مطابق امام حسین علیہ السلام سے یزید کی بیعت کا تقاضا کیا،آپؑ نے مہلت چاہی اور رات کو اپنے اہل خانہ کے ساتھ راہی مکہ ہوئے ۔اور حرم خدا میں ،جو اسلام میں ایک سرکاری پناہ گاہ ہے پناہ لی ،لیکن وہاں پر کچھ مہینے گزارنے کے بعد ،سمجھ گئے کہ یزید کسی قیمت پر آپؑ سے دست بردار ہونے والا نہیں ہے ،اوربیعت نہ کرنے کی صورت میں ،آپؑ کا قتل ہونا قطعی ہے۔اور دوسری جانب سے اس مدت کے دوران عراق سے کئی ہزار خطوط حضرتؑ کی خدمت مین پہنچے تھے کی جن میں آپؑ کی مدد کا وعدہ دے کر ظالم بنی امیہ کے خلاف تحریک چلانے کی دعوت دی تھی ۔امام حسین علیہ

السلام عمومی حالات کے مشاہدہ سے اور شواہد و قرائن سے سمجھ چکے تھے کہ آپ کی تحریک ظاہری طور پر آگے نہیں بڑھ سکتی ہے،اس کے باوجود یزید کی بیعت سے انکار کر کے قتل ہونے پر آمادہ ہوئے اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ تحریک کا آغاز کر کے مکہ سے کوفہ کی طرف روانہ ہوئے۔ راستہ میں سرزمین کربلا (کوفہ سے تقریباً ستر کلومیٹر پہلے) دشمن کے ایک بڑے لشکر سے آپؑ کی مڈ بھیڑ ہوئی۔

امام حسین علیہ السلام راستہ میں لوگوں کو اپنی مدد کے لئے دعوت دے رہے تھے اور اپنے ساتھیوں سے تذکرہ کرتے تھے کہ اس سفر میں قطعی طور پر قتل ہونا ہے اور اپنا ساتھ چھوڑنے پر اختیار دیتے تھے، اسی لئے جس دن آپؑ کا دشمن سے مقابلہ ہوا تو آپ کے گنے چنے جان نثار ساتھی باقی بچے تھے جنھوں نے آپؑ پر قربان ہونے کا فیصلہ کیا تھا ،لہٰذا وہ بڑی آسانی کے ساتھ دشمن کی ایک عظیم فوج کے ذریعہ انتہائی تنگ محاصرہ میں قرار پائے اور یہاں تک کہ ان پر پانی بھی بند کیا گیا ،اور ایسی حالت میں امام حسین علیہ السلام کو بیعت کرنے یا قتل ہونے کے درمیان اختیار دیا گیا ۔

امام حسین علیہ السلام نے بیعت کرنے سے انکار کیا اور شہادت کے لئے آمادہ ہو گئے۔ ایک دن میں صبح سے عصر تک اپنے ساتھیوں کے ساتھ دشمن سے لڑتے رہے ۔اس جنگ میں خود امامؑ،آپؑ کے بیٹے، بھائی، بھتیجے، چچیرے بھائی اور آپؑ کے اصحاب کہ جن کی کل تعداد تقریبا ستر افراد کی تھی، شہید ہوئے ۔صرف آپؑ کے بیٹے امام سجاد علیہ السلام بچے،جو شدید بیمار ہونے کی وجہ سے جنگ کرنے کے قابل نہیں تھے ۔دشمن کے لشکر نے،حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے بعد مال کو لوٹ لیا اور آپؑ کے خاندان کو اسیر بنا لیا اور شہداء کے کٹے ہوئے سروں کے ہمراہ اسیروں کو کوفہ اور کوفہ سے شام لے جایا گیا ۔اس اسیری میں امام سجاد علیہ السلام نے شام میں اپنے خطبہ سے اسی طرح حضرت زینب کبریٰ سلام اللہ علیہا نے کوفہ کے مجمع عام میں اور کوفہ کے گورنر ابن زیاد کے دربار میں اور شام میں یزید کے دربار میں اپنے خطبوں سے حق سے پردہ اٹھایا اور بنی امیہ کے ظلم و ستم کو دنیا والوں کے سامنے آشکار اور واضح کردیا ۔بہرحال امام حسین علیہ السلام کی تحریک، ظلم، و زیادتی اور لاابالی کے مقابلہ میں خود آپؑ

اور آپؑ کے فرزندوں،عزیزوں اور اصحاب کے پاک خون کے بہنے اور مال کی غارت اور خاندان کی اسیری پر ختم ہوئی ۔یہ تحریک اپنی خصوصیات و امتیازات کے پیش نظر اپنی نوعیت کا ایک ایسا واقعہ ہے انقلاب کی تاریخ کے صفحات پر رقم ہے ۔یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اسلام اس واقعہ سے زندہ ہے اور اگر یہ واقعہ رونما نہ ہوتا تو بنی امیہ اسلام کا نام ونشان باقی نہ رکھتے۔اس جانکاہ واقعہ نے نمایاں طور پر پیغمبرؐ کے اہل بیت علیہم السلام کے مقاصد کو بنی امیہ اوران کے طرفداروں کے مقاصد سے جدا کر کے حق وباطل کوواضح وروشن کردیا ۔یہ واقعہ نہایت کم وقت میں اسلامی معاشرہ کے کونے کونے میں منتشر ہوا اور شدید انقلابوں اور بہت زیادہ خونریزوں کا سبب بنا جو بارہ سال تک جاری رہے وآخر کار بنی امیہ کے زوال کا ایک بنیادی سبب بنا ۔

اس واقعہ کا واضح ترین اثر لوگوں کی ایک بڑی تعداد کی معنوی پرورش کے نتیجہ میں رونما ہوا جن کے دلوں میں علی بن ابیطالبؑ کی ولایت نے جڑ پکڑ لی اوران لوگوں نے خاندان رسالت کی دوستی کواپنا لائحہ عمل بنالیا اور دن بدن ان کی تعداد اور طاقت بڑھتی گئی ۔اور آج کی دنیا میں تقریباً دس کروڑ مسلمان شیعہ کے نام سے موجود ہیں ۔

کیاامام حسن اورامام حسین علیہما السلام کی روش مختلف تھی ؟اگرچہ ان دو محترم پیشواؤں کی روش ۔جونص پیغمبرؐ کے مطابق برحق امام ہیں ۔ظاہراً مختلف نظرآتی ہیں،بعض لوگوں نے اس حدتک کہا ہے کہ:ان دوبھائیوں کے درمیان اس حد تک نظریاتی اختلاف پایاجاتا تھا کہ ایک نے چالیس ہزار سپاہی ہونے کے باوجود صلح کی اور دوسرے نے رشتہ داروں کے علاوہ چالیس دوست واحباب کے ساتھ جنگ کی حتی کہ شش ماہہ طفل شیرخوار کو بھی اس راہ میں قربان کیا ۔

لیکن عمیق اور دقیق تحقیقات سے اس نظریہ کے خلاف ثابت ہوتا ہے،کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ امام حسن علیہ السلام تقریباً ساڑھے نوسال معاویہ کی سلطنت میں رہے اور کھلم کھلا مخالفت نہیں کی ۔امام حسین علیہ السلام نے بھی اپنے بھائی کی شہادت کے بعد تقریباً ساڑھے نوسال معاویہ کی سلطنت میں زندگی گزاری اور تحریک کا نام تک نہیں لیا اور مخالفت نہیں کی ۔پس دونوں کی روش میں اس ظاہری

اختلاف کی اصلی ا بنیاد کو معاویہ اور یزید کی متضاد روشوں میں ڈھونڈ نا چاہئے نہ کہ ا ن دو محترم پیشواؤں کے نظریاتی اختلاف میں۔معاویہ کی روش بظاہرایک ایسی روش نہیں تھی جو بے دینی پر استوار ہو اوراپنی اعلانیہ مخالفت سے احکام دین کا مذاق اڑائے ۔معاویہ اپنے آپ کو ایک صحابی اور کاتب وحی کے طورپر پہچنواتا تھا اور اپنی بہن کے ذریعہ (جو زوجہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ام الأو منین تھیں)اپنے آپ کو ''خال المومنین''کہلاتا تھا اور خلیفہ دوم کا مور د اعتماد تھا اورعام لوگ خلیفہ پرپورا اعتماداورخاص احترام رکھتے تھے ۔

اسکے علاوہ اس نے لوگوں کی نظر میں پیغمبرؐکے قابل احترام اکثراصحاب (جیسے ابوہریرہ،عمروعاص،سمرہ،بسر اورمغیرۃبن شعبہ و غیرہ)کوگورنری اوردیگر حساس حکومتی عہدوں پر فائز کیا تھا جولوگوں کے حسن ظن کواس کی طرف مبذول کرتے تھےاور لوگوں میں اس کے فضائل اور دین کے سلسلہ میں صحابہ کے محفوظ ہونے کے بارے میں ۔یعنی جو کام بھی انجام دیں معذور ہیں۔ بہت سی روایتیں نقل کرتے تھے،لہذا معاویہ جوبھی کام انجام دیتا تھا وہ قابل توجیہ ہوتا تھا اور جب اس سے کام نہیں بنتا تھا تو معاویہ بھاری انعام واکرام اور لالچ دے کر اعتراض کرنے والوں کا منہ بند کرتا تھا ۔

جہاں پر یہ حربہ کارگر ثابت نہیں ہوتا تھا ،تواپنے انہی حامیوں اور طرفداروں کے ذریعہ مخالفت کرنے والوں کو نابود کراتا تھا ۔چنانچہ اس کے ان ہی حامی صحابیوں کے ہاتھوں ،دسیوں ہزار بے گناہ شیعیان علیؑ اوردیگر مسلمانوں حتی کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابیوں کی ایک جماعت کو بھی قتل کیا گیا ۔معاویہ تمام کاموں میں ایک حق بجانب روپ اختیارکرتا تھا اور ایک خاص صبرو تحمّل سے قدم بڑھاتا تھا اورایک خاص مہربانی سے لوگوں کواپنا محب اور مطیع بنا لیتا تھا یہاں تک کہ کبھی اپنے خلاف گالیاں سنتا تھا اور جھگڑوں سے رو برو ہوتا تھا،لیکن خنداں پیشا نی اور عفوو بخشش کے ساتھ جواب دیتا تھا ،وہ اس طرح اپنی سیاست کو نافذ کرتا تھا ۔ حضرت امام حسن اورامام حسین علیہما السلام کا بظاہراحترام کرتا تھا اوردوسری طرف سے اعلان کرتا اتھا جوبھی شخص اہل بیت علیہم السلام کے فضائل میں کوئی حدیث بیان کرے گا اس کی جان ومال اور عزت و آبرو کسی صورت میں محفوظ نہیں ہے اور جو شخص

اصحاب کی منقبت میں کوئی حدیث بیان کرے گا تو اسے انعام واکرام سے نوازا جائیگا ۔ اسی طرح یہ بھی حکم دیتا تھا کہ خطباء مسلمانوں کے منبروں سے علیؑ کو (لازمی طورپر) گالیاں دیں اور اس کے حکم سے حضرت علیؑ کے حامیوں کو جہاں بھی پاتے تھے موقع پر ہی قتل کرڈالتے تھے اوراس کام میں اس قدر زیادتی کی کہ حضرت علی علیہ السلام کے دشمنوں کی ایک بڑی تعداد کوبھی آپؑ کی دوستی کے الزام میں قتل کیا گیا ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امام حسن علیہ السلام کے انقلاب سے اسلام کونقصان پہنچتا ۔ اور آپؑ اور آپؑ کے ساتھیوں کا خون رایگان ہوتا ۔

ان حالات میں بعید نہیں تھا معاویہ امام حسینؑ کو اپنی ہی افراد میں سے کسی کے ذریعہ قتل کرواتااور اس کے بعد عام لوگوں کے جذبات کو ٹھنڈا کرنے اور افکار کو بدلنے کے لئے آپؑ کے ماتم میں اپنا گریبان چاک کرتا اورآپؑ کے خون کا بدلہ لینے کے بہانے سے آپؑ کے شیعوں کا قتل عام کرتا،کیونکہ اس نے یہی رویہ عثمان کے بارے میں اختیار کیا تھا[1] ۔ لیکن یزید کی سیاسی روش کسی صورت میں اس کے باپ کی روش سے مشابہ نہیں تھی ۔ وہ ایک خود خواہ اور لا ابا لی و بے دین جوان تھا ،زور وزبردستی کے علاوہ کچھ نہیں جانتا تھا،لوگوں کے افکار و نظریات کو کوئی اہمیت نہیں دیتا تھا ۔

یزید نے اسلام کوپس پردہ پہنچائے جانے والے نقصانات کو اپنے مختصر دور حکومت میں اچانک آشکار کیا اور اس سے پردہ ہٹادیا ۔ اپنی حکومت کے پہلے سال میں،خاندان پیغمبرؐ کا قتل عام کیا ۔ دوسرے سال مدینہ منورہ کو منہدم کیا اور تین دن تک لوگوں کی عزت،ناموس اور جان ومال کواپنے سپاہیوں کے لئے مباح قرار دیا ۔ تیسرے سال کعبہ کو منہدم کردیا ۔ اسی وجہ سے ،امام حسین علیہ السلام کے انقلاب نے لوگوں کے ذہنوں اور افکار میں جگہ پائی اورروز بروز یہ اثر گہرا اورنمایاں ہوتاگیا اور ابتدائی مرحلہ میں خونین انقلابوں کی صورت میں ظاہر ہوا اورآخرکار مسلمانوں کی ایک عظیم تعداد کوحق و حقیقت کے حامیوں اور محبان اہل بیت علیہم السلام کے عنوان سے وجود میں لایا ۔ یہی وجہ تھی کہ معاویہ نے یزید کو اپنی وصیتوں کے ضمن میں تاکیدو نصیحت کی تھی کہ امام حسین علیہ السلام

[1] تاریخ گواہ ہے کہ عثمان نے معاویہ سے مسلسل مدد کی درخواست کی لیکن معاویہ نے اسکامثبت جواب نہیں دیا ،لیکن جب عثمان قتل کئے گئے تو ان کے خون کا بدلہ لینے کے بہانہ سے امیرالمؤ منین حضرت علی علیہ السلام سے جنگ کی ۔

سے کوئی سرو کار نہ رکھے اوران پراعتراض نہ کرے۔ لیکن کیا یزید کی مستی اور خود خواہی اسے اس بات کی اجازت دیتی کہ وہ اپنے فائدے اور نقصان میں تمیز دے سکے ؟!

حضرت امام زین العابدین علیہ السلام (چوتھے امام)

امام سجاد علیہ السلام نے اپنی امامت کی مدت میں جس روش کو اختیار کیا اسے دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے کہ جو مجموعی طور پر ائمہ اطہار علیہم السلام کی عام روش کے مطابق ہے۔ حضرت امام سجاد علیہ السلام کربلا کے جانکاہ واقعہ میں اپنے والد گرامی کے ہمراہ تھے اور حسینیؑ انقلاب میں شریک تھے اور آپؑ کے والد گرامی کی شہادت کے بعد آپؑ اسیر کئے گئے اور کربلا سے کوفہ اور کوفہ سے شام لے جائے گئے۔ امام سجاد علیہ السلام نے اپنی اسیری میں تقیہ سے کام نہیں لیا اور بلا جھجک حق و حقیقت کا اظہار کرتے تھے ،اور موقع و محل کے مطابق اپنی تقریروں اور بیانات کے ذریعہ خاندان رسالت کی حقانیت اوران کے فخر ومباہات کو عام وخاص تک پہنچاتے تھے اور اپنے والد بزگوار کی مظلومیت اور بنی امیہ کے دردناک ظلم وستم اور بے رحمی کو تشت ازبام کرکے لوگوں کے جذبات اور احساسات کو ایک پر تلاطم طوفان میں تبدیل کرتے تھے ۔

لیکن قید اور اسیری سے رہائی پانے کے بعد ،امام سجاد علیہ السلام مدینہ لوٹے اورجاں نثاری کا ماحول آرام وسکون کے ماحول میں تبدیل ہوا ،گھر میں گوشہ نشینی اختیار کی اور غیروں کے لئے دروازہ بند کردیا اور خدائے متعال کی عبادت میں مشغول ہوئے ۔اور خاموشی سے حق و حقیقت کے حامیوں کی تربیت کرتے رہے۔ حضرت امام سجاد علیہ السلام نے اپنی امامت کے ۳۵سال کے دوران بالواسطہ یا براہراست لوگوں کی ایک بڑی تعداد کی پرورش وتربیت کی اور ان کو اسلامی معارف کی تعلیم دی۔جو دعائیں حضرت امام سجاد علیہ السلام محراب عبادت میں آسمانی لہجہ میں پڑھتے اور ان کے ذریعہ اپنے پروردگار سے رازونیاز فرماتے تھے، وہ عظیم اسلامی معارف کے ایک مکمل دورہ پر مشتمل ہیں ۔ دعاؤں کے مجموعہ کو ''صحیفۂ سجادیہ ''کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام (پانچویں امام)

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کی امامت کے زمانہ میں دینی علوم کی نشر و اشاعت کے لئے کسی حد تک ماحول سازگار ہوا ۔بنی امیہ کے د باؤ کے نتیجہ میں اہل بیت علیہم السلام کی احادیث نابود ہو چکی تھیں . جبکہ احکام کے لئے ہزاروں احادیث کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن اصحاب کے ذریعہ پیغمبر اسلام کی نقل کی گئی احادیث کی تعداد پانچ سو سے زیادہ نہ تھی ۔ مختصر یہ کہ اس زمانے میں کربلا کے جانکاہ واقعہ اور حضرت امام سجاد علیہ السلام کی ۳۵سالہ کوششوں کے نتیجہ میں شیعوں کی ایک بڑی تعداد وجود میں آگئی تھی۔ لیکن وہ فقہ اسلامی سے خالی ہاتھ تھے ۔چونکہ بنی امیہ کی سلطنت،اندرونی اختلافات، راحت طلبی اور حکّام کی بے لیاقتی کے نتیجہ میں کمزور ہورہی تھی اور اس کے پیکر میں روز بروز سستی کے آثار نمایاں ہوتے جارہے تھے،لہذا امام محمد باقرعلیہ السلام نے اس فرصت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے علوم اہل بیت علیہم السلام اور فقہ اسلامی کے نشرواشاعت کا کام شروع کیا اور تعلیم وتربیت کے بعد اپنے مکتب سے بہت سے دانشوروں کومعاشرے کے حوالے کیا ۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام (چھٹے امام)

چھٹے امام حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے زمانہ میں اسلامی علوم کی نشرواشاعت کے لئے زمین زیادہ ہموار اور حالات زیادہ مناسب تھے ،کیونکہ حضرت امام محمد باقرؑ کے ذریعہ احادیث کی نشرواشاعت اورآپؑ کے مکتب کے شاگردوں کی تبلیغ سے لوگوں میں اسلامی معارف اورعلوم اہل بیت علیہم السلام کے بارے میں شوق پیدا ہو چکا تھا اور حدیث سننے کے تشنہ تھے۔اس کے علاوہ اموی سلطنت نیست ونابودہوچکی تھی اور عباسی سلطنت ابھی پوری طرح سے مستحکم نہیں ہو سکی تھی اوربنی عباس نے اپنے مقاصد کو حاصل کرنے اور بنی امیہ کی حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے اہل بیت علیہم السلام کی مظلومیت اور شہدائے کربلا کے خون کو دستاویز قرار دیا تھا ،لہذا وہ اہل بیت علیہم السلام سے خوش اخلاقی سے پیش آتے تھے ۔اس فرصت کو غنیمت سمجھتے ہوئے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے مختلف علوم کی تعلیم و تربیت کا کام شروع کیا ۔تمام اطراف واکناف سے علماء ودانشور گروہ در گروہ

آپؑ کے گھر پر آتے تھے اورآپؑ کی شاگردی کا شرف حاصل کر کے معارف اسلامی کے مختلف ہنر،اخلاق،تاریخ انبیاء وامم اور حکمت و موعظہ کے بارے میں سوالات کرتے تھے اور جواب حاصل کرتے تھے ۔امام جعفر صادق علیہ السلام نے مختلف طبقات کے لوگوں سے بحثیں کیں اور گونا گوں ملل و نحل سے مناظرے کئے اور علوم کے مختلف شعبوں میں کافی شاگردوں کی تربیت کی، آپؑ کی احادیث اور علمی بیانات سے سیکڑوں کتابیں تالیف ہوئی ہیں،جو ''اصول'' کے نام سے مشہور ہیں ۔

شیعوں نے،جو اسلام میں اہل بیت علیہم السلام کی روش پر چلتے ہیں،اپنے دینی مقاصداور مسائل سے آپؑ کی برکتوں سے مکمل طور پر ابہام کو دور کیا ہے اور اپنے مذہبی مجہولات کو آپؑ کے واضح اور روشن بیانات سے حل کردیا ۔اسی لئے شیعہ مذہب (کہ وہی مذہب اہل بیتؑ ہے)لوگوں میں ''مذہب جعفری'' کے نام سے معروف ہوگیا ۔

امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہما السلام کی تحریک

اگر چہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے بعد اہل بیت علیہم السلام کے پیروؤں میں رفتہ رفتہ اضافہ ہوتا جارہا تھا ،لیکن بنی امیہ کے حکاّم کی طرف سے اہل بیت علیہم السلام کے پیروؤں پر زبردست دباؤ کی وجہ سے امام سجاد علیہ السلام کے لئے ممکن نہیں تھا ،کہ معارف اسلامی کی تعلیم کا کام عملی اور اعلانیہ طورپر انجام دیں،یہاں تک کہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کے زمانہ میں اموی سلطنت اندرونی اختلافات اور بنی عباس سے کشمکش کے نتیجہ میں کمزور ہونے کے بعد ختم ہوئی گئی۔اس لئے شیعہ اوراہل بیت علیہم السلام کے پیرو اور حضرت امام سجاد علیہ السلام کی ۳۵ سالہ امامت کے دوران تربیت یافتہ شاگردوں کو موقع ملا اور وہ دوردراز علاقوں سے سیلاب کی طرح امام محمد باقر علیہ السلام کے گھر پرآ کر دینی علوم اور اسلامی معارف کی تعلیم حاصل کرتے تھے ۔امام محمد باقر علیہ السلام کے بعد امام جعفر صادق علیہ السلام نے بھی اسلامی معارف کی نشر واشاعت کا کام شروع کیا ،دنیا کے کونے کونے سے آنے والے دانشوروں کو قبول کر کے آپؑ ان کی تعلیم وتربیت فرماتے تھے اورآپؑ کی کوششوں کے نتیجہ میں ہزاروں دانشور مختلف علوم و فنون کو آپ سے سیکھ کر دنیا بھر میں ان علوم کی نشر واشاعت میں مشغول ہوئے ۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام

کے شاگردوں کی تالیف کی ہوئی کتابوں کی تعداد چار سو ہے جو ''اصول اربعمائۃ'' کے نام سے شیعوں میں معروف ہیں ۔ان کے بعد آنے والے باقی ائمہ علیہم السلام نے بھی ان دو اماموں کی روش پر عمل کرتے ہوئے معارف اسلامی کی نشرواشاعت کی بنی عباس کے سخت اور شدید دباؤ کے باوجود ،انہوں نے بھی بہت سے دانشوروں کی پرورش و تربیت کی اوراسلام کے علمی خزانوں کو ان کے حوالے کیا ۔ان ہی ائمہ ھدیٰ علیہم السلام کی کوششوں کے نتیجہ میں آج،دنیا کے کونے کونے میں کروڑوں اہل حق موجود ہیں ۔

حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام (ساتویں امام)

بنی عباس نے،بنی امیہ کی حکومت کا تختہ الٹنے کے بعد خلافت پر قبضہ جمایا ۔پھر اس کے بعد،بنی فاطمہؑ کی طرف رخ کیا اور پوری طاقت کے ساتھ خاندان نبوت کو نابود کرنے پر اترآئے ،کچھ لوگوں کے سر قلم کئے ،کچھ کو زندہ دفنادیا اورکچھ کو عمارتوں کی بنیادوں میں یادیواروں میں چن دیا ۔چھٹے امام حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے گھر کو جلادیا اور خود حضرتؑ کو چند بارعراق بلایا ۔اس طرح چھٹے امام کی زندگی کے آخری دنوں میں تقیہ اور سخت ہو گیا تھااور چونکہ حضرتؑ پرشدید پابندی تھی ،لہذا خاص شیعوں کے علاوہ آپؑ کسی سے ملاقات نہیں کرتے تھے اورآخر کارعباسی خلیفہ منصور کے ذریعہ زہرسے شہید کئے گئے ۔اس طرح ساتویں امام حضرت موسیٰ کاظمؑ کی امامت کے زمانہ میں دشمنوں کا دباؤ بہت سخت تھا اور روزبروز بڑھتا جارہا تھا ۔

حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے شدید تقیہ کے باوجود علوم اسلامی کی نشرواشاعت کو جاری رکھا اور بہت سی احادیث کو شیعوں کے حوالہ کردیا ۔چنانچہ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ آپؑ سے منقول فقہی احادیث پانچویں اور چھٹے امام کے بعد دوسرے ائمہ کی نسبت سب سے زیادہ ہیں ۔تقیہ کی شدت کی وجہ سے آپؑ سے منقول احادیث میں ''عالم وعبدصالح''،جیسی تعبیریں استعمال کی گئی ہیں اور حضرتؑ کا نام صریحاً ذکر نہیں کیا گیا ہے ۔حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام عباسی خلفاء کے چار افراد:منصور،ہادی ،مھدی،اور ہارون کے معاصر تھے ۔آخر کار ہارون کے حکم سے آپؑ کو گرفتارکر کے قید خانہ میں ڈال دیا گیا اور برسوں تک ایک زندان سے دوسرے زندان میں منتقل ہوتے رہے اور سرانجام زندان میں ہی زہردے کر آپؑ کو شہید کیا گیا ۔

حضرت امام رضا علیہ السلام (آٹھویں امام)

حالات پر غور وفکر کرنے سے ہر صاحب نظر کے لئے واضح تھا کہ خلفائے وقت اور دشمنان اہل بیت علیہم السلام جتنا ائمہ ھدیٰ کو جسمانی اذیتیں پہنچا کر نابود کرنے کی کوشش کرتے تھے اوران کے شیعوں سے سختی سے پیش آتے تھے ،اتنا ہی ان کے پیروؤں کی تعداد بڑھتی جارہی تھی اور ان کا ایمان مزید مستحکم ہوتا جارہا تھا اوردربار خلافت ان کی نظروں میں ایک نجس اور ناپاک دربار سمجھاجاتا تھا ۔یہ مطلب،ایک باطنی عقیدہ تھا جو ائمہ اطہار علیہم السلام کے معاصر خلفاء کو ہمیشہ رنج وعذاب میں مبتلا کر رہا تھا اور حقیقت میں انھیں بے بس اور بیچارہ کرکے رکھدیا تھا ۔مامون بنی عباس کا ساتواں خلیفہ تھا اور حضرت امام رضا علیہ السلام کا معاصر تھا ۔اس نے اپنے بھائی امین کو قتل کرنے کے بعد خلافت پر اپنی گرفت مضبوط کرلی اور اس فکر میں پڑا کہ اپنے آپ کو باطنی رنج وپریشانی سے ہمیشہ کے لئے نجات دے اور زور وزبردستی اوردباؤ کے علاوہ کسی اور راستہ سے شیعوں کو اپنے راستہ سے ہٹادے ۔ اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے جس سیاست کو مامون نے اختیار کیا ،وہ یہ تھی کہ اپنا ولی عہد ،حضرت امام رضا علیہ السلام کوبنایا تاکہ حضرتؑ کو ناجائز خلافت کے نظام میں داخل کر کے ،شیعوں کی نظروں میں آپؑ کو مشکوک کر کے ان کے ذہنوں سے امام کی عصمت وطہارت کو نکال دے ۔

اس صورت میں مقام امامت کے لئے کوئی امتیاز باقی نہ رہتا ،جو شیعوں کے مذہب کا اصول ہے ،اس طرح ان کے مذہب کی بنیاد خود بخود نابود ہو جاتی ۔اس سیاست کو عملی جامہ پہنانے میں ایک اور کامیابی بھی تھی وہ یہ کہ،بنی فاطمہ کی طرف سے خلافت،بنی عباس کو سرنگوں کرنے کے لئے جو پے درپے تحریکیں سراٹھارہی تھیں ،ان کو کچل دیا جاتا،کیونکہ جب،بنی فاطمی مشاہدہ کرتے کہ خلافت ان میں منتقل ہوچکی ہے ،تو فطری طورپراپنے خونین انقلابوں سے اجتناب کرتے ۔البتہ اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کے بعدامام رضا علیہ السلام کو راستے سے ہٹانے میں مامون کے لئے کوئی حرج نہیں تھا ۔مامون نے حضرت امام رضا علیہ السلام کو پہلے خلافت قبول کرنے اوراس کے بعدولی عہدی کاعہدہ قبول کرنے کی پیش کش کی ۔امامؑ نے مامون کی طرف سے تاکید ،اصرار اور دھمکی کے نتیجہ میں

آخر کار اس شرط پر ولی عہدی کو قبول کیا کہ حکومت کے کاموں میں جیسے عزل ونصب میں مداخلت نہیں کریں گے۔ حضرت امام رضا علیہ السلام نے ایسے ماحول میں لوگوں کے افکار کی ہدایت کرنے کا کام سنبھالا اور جہاں تک آپ کے لئے ممکن تھا مختلف مذاہب وادیان کے علماء سے بحثیں کیں اوراسلامی معارف اوردینی حقائق کے بارے میں گراں بہا بیانات فرمائے (مامون بھی مذہبی بحثوں کے بارے میں کافی دلچسپی رکھتا تھا) اسلامی معارف کے اصولوں کے بارے میں جس طرح امیرالمومنینؑ کے بیانات بہت ہیں اوردیگر ائمہ کی نسبت بیش تر ہیں۔

حضرت امام رضاعلیہ السلام کی برکتوں میں سے ایک برکت یہ تھی،کہ آپؑ کے آباء واجداد کی بہت سی احادیث جو شیعوں کے پاس تھیں،ان سب کوآپؑ کی خدمت میں پیش کیا گیا اور آپؑ کے اشارہ اور تشخیص سے ان میں سے،دشمنوں کے ناپاک ہاتھوں کی جعل اوروضع کی گئی احادیث کو مشخص کرکے مسترد کیا گیا ۔

حضرت امام رضاعلیہ السلام نے ولی عہدی کے طور پر جوسفر مدینہ منورہ سے ''مرو'' تک کیا،اس کے دوران،خاص کر ایران میں عجیب جوش وخروش پیداہوا اورلوگ ہرجگہ سے جوق در جوق زیارت کے لئے آپؑ کی خدمت میں آتے تھے اور شب وروزآپؑ کے شمع وجود کے گردپروانہ وار رہتے تھے اورآپؑ سے دینی معارف واحکام سیکھتے تھے ۔مامون نے جب دیکھا کہ لوگ بے مثال اورحیرت انگیز طور پر حضرت امام رضاعلیہ السلام کی طرف متوجہ ہیں تواس کو اپنی سیاست کے غلط ہونے کا احساس ہوا،اسلئے اس نے اپنی غلط سیاست میں اصلاح کرنے کی غرض سے امامؑ کوزہر دیکر شہید کیا اور اس کے بعد اہل بیت علیہم السلام اور ان کے شیعوں کے بارے میں خلفاء کی اسی پرانی سیاست پر گامزن رہا ۔

حضرت امام محمد تقی علیہ السلام (نویں امام)

حضرت امام علی نقی علیہ السلام (دسویں امام)

حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام (گیارہویں امام)

ان تین ہستیوں کی زندگی کے حالات مشابہ تھے ۔امام رضا علیہ السلام کی شہادت کے بعد مامون نے آپؑ کے اکلوتے بیٹے حضرت امام محمد تقی علیہ السلام کو بغداد بلایا اور پیار و محبت سے پیش آیا ،اپنی بیٹی سے آپؑ کی شادی کی اور پورے احترام کے ساتھ اپنے پاس رکھا ۔یہ طرز عمل ،اگرچہ دوستانہ دکھائی دیتا تھا ،لیکن مامون نے حقیقت میں اس سیاست کے ذریعہ امام علیہ السلام پر ہر لحاظ سے شدید پابندی لگائی تھی ۔ حضرت امام علی نقی و حضرت امام حسن عسکری علیہما السلام کا اپنی امامت کے دوران سامرا میں۔جو ان دنوں دارالخلافہ تھا ۔سکونت کرنا بذات خود ایک قسم کی نظر بندی تھی۔

ان تین اماموں کی امامت کی مدت مجموعی طور پر ۵۷ سال ہے ،ان دنوں ایران ،عراق اور شام میں رہنے والے شیعوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی تھی اور ان میں ہزاروں رجال حدیث بھی موجود تھے۔ اسکے باوجود ان تین ائمہ علیہم السلام سے منقول احادیث بہت کم ہیں اور ان کی عمریں بھی کم تھیں ۔نویں امام ۲۵ سال کی عمر میں دسویں امام ۴۰ سال کی عمر میں اور گیارہویں امام ۲۷ سال کی عمر میں شہید کئے گئے ۔یہ سب نکات اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ ان کے زمانے میں دشمنوں کی طرف سے ان پر شدید پابندی تھی اور ان کے کام میں روڑے اٹکائے جاتے تھے ،لہذا یہ ائمہ اپنی ذمہ داریوں کو آزادانہ طور پر انجام نہیں دے سکتے تھے ،پھر بھی دین کے اصول اور فروع کے بارے میں ان تین ائمہ سے بعض گراں بہا احادیث نقل ہوئی ہیں ۔

حضرت امام مہدی موعود عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف (بارہویں امام)

حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام کے زمانہ میں خلافت کی انتظامیہ نے فیصلہ کیا تھا کہ ہر ممکن وسیلہ اور ذریعہ سے حضرتؑ کے جانشین کو نابود کریں تا کہ اس کے ذریعہ مسئلہ امامت اور اس کے نتیجہ میں مذہب تشیع کو ختم کردیں ۔ حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام پر

دوسری پابندیوں کے علاوہ یہ بھی ایک پابندی تھی ۔اس لحاظ سے امام عصر عجل اللہ تعالی فرجہ الشریف کی پیدائش مخفی رکھی گئی اورآپ(عج) کی چھ سال کی عمر تک آپ (عج) کے پدربزرگوارزندہ تھے ۔آپ(عج) کولوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھا جاتا تھا اورشیعوں کے چند خاص افراد کے علاوہ آپ(عج) کو کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا ۔والد گرامی کی شہادت کے بعد حضرت (عج) نے،خدا کے حکم سے غیبت صغری اختیار کی،اوراپنے چار خاص نائبوں کے ذریعہ جو یکے بعد دیگرے آپ(عج) کے نائب مقرر ہوئے تھے ،شیعوں کے سوالات کا جواب دیتے تھےاوران کی مشکلات کو حل فرماتے تھے ۔

اس کے بعد سے حضرت(عج)آج تک غیبت کبری میں ہیں،جب آپ(عج)کوخدا کا حکم ہوگاتو اس وقت ظہور فرماکرزمین کوعدل وانصاف سے بھردیں گے جوظلم وستم سے پھر چکی ہوگی ۔پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حضرت مہدی موعود(عج) اورآپ(عج)کی غیبت وظہور کے بارے میں شیعہ وسنی راویوں نے بے شما احادیث نقل کی ہیں اوراسی طرح شیعوں کی بزرگ شخصیتوں کی ایک بڑی تعدادآپ(عج)کے والد گرامی،کی زندگی میں آپ(عج)کی خدمت میں پہنچ کرآپ(عج) کے نورانی جمال کادیدار کرچکی ہے اورآپ(عج)کے والدگرامی سے امامت کی خوش خبری سن چکی ہے۔اسکے علاوہ نبوت اورامامت کی بحث میں ہم اس نتیجہ پرپہنچے ہیں کہ دنیاہرگز خدااوراس دین کی حفاظت کرنے والے امام سے خالی نہیں رہے گی۔

ائمہ دین کی روش کااخلاقی نتیجہ

خدا کے انبیاء اورائمہ دین کے بارے میں جو کچھ تاریخ سے خلاصہ کے طور پر حاصل ہوتا ہے،وہ یہ ہے کہ وہ حقیقت پسنداورحق کے پیروتھے اورعالم بشریت کوحقیقت پسندی اورحق کی پیروی کرنے کی دعوت دیتے تھے اوراس سلسلے میں ہر قسم کی جاں نثاری اورقربانی دینے سے گریز نہیں کرتے تھے۔دوسرے الفاظ میںیہ کہا جائے کہ وہ کوشش کرتے تھے کہ انسان اورانسانی معاشرہ کی کما حقہ تربیت کریں ۔وہ چاہتے تھے کہ لوگوں پر جاہلانہ یاخرافاتی افکارکی حکمرانی کے بجائے صحیح افکاروعقائد حکم فرما ہوں،اور انسانیت کے پاک دامن کوحیوانی خصلتوں سے داغدار اورآلودہ نہ ہونے دیں درندوں کی طرح ایک دوسرے کو پھاڑنے اوراپنا اپیٹ بھرنے

کے بجائے انسانی عادات کو اپنا کر زندگی کے بازارمیں انسانیت کا سرمایہ لگاکرانسانیت کے نقد فائدے سے سعادت حاصل کریں۔یعنی وہ ایسے تھے جو اپنی سعادت نہیں چاہتے تھے مگر معاشرے کی سعادت اور عالم انسانیت کے لئے اس کے علاوہ کسی فریضہ کو تشخیص نہیں دیتے تھے ۔انہوں نے اپنی بھلائی اور سعادت (کہ انسان اس کے علاوہ کوئی چیز نہیں چاہتا ہے) اس میں دیکھی تھی کہ سب کے خیر خواہ ہوں اور چاہتے تھے کہ دوسرے بھی ایسے ہی ہوں ،یعنی جو شخص جس چیز کو اپنے لئے پسند کرتا ہے ،اسے دوسرے کیلئے پسند کرے اور جس چیز کواپنے لئے پسند نہیں کرتاہے اسے دوسروں کے لئے بھی پسند نہ کرے ۔

اسی حقیقت بینی اور حق کی پیروی کے نتیجہ میں ان حضرات نے اس عام انسانی فریضہ کی اہمیت ''خیر خواہی ''اور دیگر جزئی فرائض ،جو اس کے فروع ہیں،کاپتہ چلایا ہے اور جاں نثاری وفداکاری جیسے صفات کے مالک بن گئے ہیں اورانہوں نے راہ حق میں جان ومال کی قربانی دینے سے گریز نہیں کیا اور بد خواہی پر مشتمل ہر صفت کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا ۔وہ اپنے مال وجان کے بارے میں بخل سے کام نہیں لیتے تھے ۔خودپرستی اور کنجوسی سے متنفر تھے ،جھوٹ نہیں بولتے تھے ،کسی پر تہمت نہیں لگاتے تھے ،دوسروں کی عزت اورجان ومال پر تجاوز نہیں کرتے تھے ۔ان صفات کی تفصیلی وضاحت اورآثار کو اخلاق کے حصہ میں ہونا چاہئے۔

ائمہ معصومین علیہم السلام کے اجمالی حالات

پہلے امام نام :امیرالمومنین حضرت علی بن ابیطالب علیہ السلام

پیدائش :۲۳سال قبل ہجرت

خلافت: ۳۵ھ ہجری

شہادت: ۴۰ھ ہجری

مدت خلافت :تقریباً پانچ سال

مدت عمر :۶۳سال

دوسرے امام

نام : حسن علیہ السلام

مشہور لقب : مجتبی

کنیت :ابو محمد

والد گرامی : حضرت امیر المومنین علی بن ابیطالب علیہ السلام

پیدائش: سنہ ۳ ہجری

شہادت: سنہ ۵۰ ہجری،معاویہ کے ایماء پر اپنی زوجہ کے ذریعہ
زہر سے شہید کئے گئے۔

مدت عمر :۴۸سال

مدت امامت: دس سال

تیسرے امام

نام : حسین علیہ السلام

لقب: سید الشہداء

کنیت: ابو عبد اللہ

والد گرامی: حضرت امیر المومنین علی بن ابیطالب علیہ السلام

پیدائش: سنہ ۴ ہجری

شہادت: سنہ ۶۱ ہجری یزید بن معاویہ کے حکم سے شہید کئے گئے۔

مدت عمر: ۵۷ سال

مدت امامت: دس سال

چوتھے امام نام: علی علیہ السلام

لقب: سجاد اور زین العابدین

کنیت: ابو محمد

والد گرامی: حضرت امام حسین علیہ السلام

پیدائش: سنہ ۳۸ ہجری

شہادت: سنہ ۹۴ ہجری میں ہشام بن عبد الملک کے حکم سے زہر دیا گیا۔

مدت عمر: ۶۶ سال

مدت امامت :۳۵سال

پانچویں امام نام : محمد علیہ السلام لقب :باقر

کنیت :ابوجعفر والد گرامی :حضرت امام سجاد علیہ السلام

پیدائش:۵۸ھ ہجری

شہادت:۱۱۷ھ ہجری میں ابراہیم بن ولید کے حکم سے زہر دیا گیا۔

مدت عمر :۵۹سال

مدت امامت :۲۳سال

چھٹے امام نام :جعفر علیہ السلام

لقب :صادق

کنیت :ابوعبد اللہ والد گرامی :

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام

پیدائش:۸۰ھ ہجری

شہادت:۱۴۸ھ ہجری میں منصور عباسی کے حکم سے زہر دیا گیا

مدت عمر :۶۸سال

مدت امامت: ۳۱سال

ساتویں امام نام :موسی علیہ السلام

لقب :کاظم

کنیت :ابوالحسن والد گرامی :

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام

پیدائش: ۱۲۸ھ ہجری

شہادت: ۱۸۲ھ ہجری

مدت عمر :۵۴سال

مدت امامت :۳۵سال

آٹھویں امام نام :علی علیہ السلام

لقب :رضا

کنیت :ابوالحسن والد گرامی :

حضرت امام موسی کاظم علیہ السلام

پیدائش: ۱۴۸ھ ہجری

شہادت: ۲۰۳ھ ہجری میں مامون عباسی کے ہاتھوں زہر سے شہید کئے گئے

مدت عمر: ۵۵سال

مدت امامت: ۲۱سال

نویں امام نام: محمد علیہ السلام

لقب: تقی اور جواد

کنیت: ابو جعفر والد گرامی: حضرت امام رضا علیہ السلام

پیدائش: ۱۹۵ھ ہجری

شہادت: ۲۲۰ھ ہجری میں معتصم عباسی کے ایما پر اپنی زوجہ کے ہاتھوں زہر سے شہید کئے گئے

مدت عمر: ۲۵سال

مدت امامت: ۱۷سال

دسویں امام نام: علی علیہ السلام

لقب: ہادی و نقی

کنیت: ابو الحسن والد گرامی: حضرت امام محمد تقی علیہ السلام

پیدائش: ۲۱۴ھ ہجری

شہادت: ۲۵۴ھ ہجری

مدت عمر: ۴۰سال

مدت امامت: ۳۴سال

گیارہویں امام نام: حسن علیہ السلام

لقب: عسکری

کنیت: ابو محمد والد گرامی: حضرت امام علی نقی علیہ السلام

پیدائش: ۲۳۲ھ ہجری

شہادت: ۲۶۰ھ ہجری

مدت عمر: ۲۸سال

مدت امامت: ۷سال

بارہویں امام نام: م ح م د علیہ السلام

لقب: ہادی اور مہدی

کنیت: ابوالقاسم والد گرامی: حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام

پیدائش: ۲۵۶ھ ہجری

آپ خدا کے حکم سے نظروں سے غائب ہیں، جس دن خدا چاہے گا ظہور فرما کر دنیا کو عدل و انصاف سے بھر دیں گے۔

اخلاق واحکام کے چند سبق

اخلاق کے چند سبق

جیسا کہ معلوم ہوا،دین مقدس اسلام ایک ایسا عام اور لافانی نظام ہے،جسے خدائے متعال نے انسان کی دنیوی واخروی زندگی کے لئے خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل فرمایا ہے تاکہ انسانی معاشرے میں نافذ ہوجائے،اورانسانیت کی کشتی کو جہالت وبدبختی کے بھنور سے نکال کر نجات کے ساحل پر لگا دے ۔چونکہ دین،زندگی کا نظام ہے،لہذا ضروری ہے کہ زندگی سے مربوط چیزوں کے بارے میں انسان کے لئے ایک فریضہ کو معین کرے اور اس کے انجام کو انسان سے طلب کرے ۔کلی طورپر ہماری زندگی تین امور سے مربوط ہے: ۱۔خدائے متعال سے ،کہ ہم اسکی مخلوق ہیں ،اسکی نعمت کا حق ہر حق سے زیادہ ہے اوراس کی ذات اقدس کے بارے میں فرض شناسی ہر واجب سے زیادہ واجب ہے۔

۲۔زندگی کا رابطہ خود ہمارے ساتھ۔

۳۔اپنے ہم جنسوں سے رابطہ،ہم اپنے ہم جنسوں کے ساتھ زندگی گزارنے پر مجبور ہیں تاکہ اپنے کاروکوشش کوان کے تعاون اورمدد سے انجام دیں۔اس بناپر، ہم قاعدے کے مطابق کلی طور پر تین فرائض رکھتے ہیں: الف:خداکے بارے میں فریضہ۔

ب:اپنے بارے میں فریضہ۔

ج:دوسروں کے بارے میں فریضہ۔

خدا کے بارے میں انسان کا فریضہ

خدا کے بارے میں ہمارا فریضہ،اہم ترین فریضہ ہے۔اس کو انجام دینے میں ہمیں پاک دل اور خالص نیت سے کوشش کرنی

چاہئے۔سب سے پہلے انسانی فریضہ یہ ہے کہ اپنے پروردگار کو پہچانے،کیونکہ خدائے متعال کا وجود ،ہر مخلوق کے وجود کا سر چشمہ ہے اور ہر وجود و حقیقت کا خالق ہے۔اس کے مقدس وجودکی معرفت اوراس کا علم ہر حقیقت ہیں نگاہ کے لئے روشنی ہے ۔اس حقیقت سے بے اعتنائی اوردوری ،ہر قسم کی جہالت ،بے بصیرتی اور فریضہ کے نہ جاننے کا سر چشمہ ہے۔جو شخص حق کی معرفت سے بے اعتنائی کرے اور نتیجہ میں اپنے ضمیر کے روشن چراغ کو بجھادے،تواس کے لئے حقیقی انسانی سعادت کوحاصل کرنے کا کوئی راستہ نہیں ہے ۔

چنانچہ ہم مشاہدہ کرتے ہیں ،جولوگ خداشناسی سے روگردانی کرتے ہیں اوراپنی زندگی میں اس حقیقت کو کوئی اہمیت نہیں دیتے ،وہ انسانی معنویات سے کلی طورپر دور ہیں اوران کی منطق چوپایوں اوردرندوں کی منطق ہے خدائے متعال اپنے کلام پاک میں فرماتا ہے:(فأعرض عن مّن تولّی عن ذکرنا ولم یرد الاّ الحیوۃ الدنیا*ذلک مبلغھم من العلم۔[۱]) ''لہذاجو شخص بھی ہمارے ذکرسے منہ پھیرے اورزندگانی دنیا کے علاوہ کچھ نہ چاہے،آپ بھی اس سے کنارہ کش ہو جائیں،یہی ان کے علم کی انتہا ہے ۔''البتہ یہ یاددہانی ضروری ہے کہ،خداشناسی ،انسان کے لئے ۔جوایک حقیقت بین اوراستدلالی فطرت والی مخلوق ہے۔

اضطراری اورقہری ہے،کیونکہ وہ اپنے خداداد شعور سے خلقت کے جس شئے پر بھی نگاہ کرتا ہے ،خالق کائنات کے وجوداور اس کے علم وقدرت کےآثار کا مشاہدہ کرتا ہے ۔اس بناپر خداشناسی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ انسان نے خداشناسی کو اپنے لئے ایجادکیا ہے،بلکہ مقصد یہ ہے کہ انسان اس واضح حقیقت کو،کہ جس پر پردہ نہیں ڈالا جاسکتا ،بے اعتنائی کی نگاہ سے نہ دیکھے اوراپنے ضمیر کو،جواسے ہروقت خدا کی طرف دعوت دیتا ہے ، مثبت جواب دے اوراس معرفت کی تحقیق کر کے ہر قسم کے شک وشبہہ کواپنے دل سے نکال دے۔

[۱] نجم،۲۹،۳۰

خدا پرستی

خدا شناسی کے بعد ہمارا دوسرا فریضہ خدا پرستی ہے،کیونکہ حق کی معرفت کے ضمن میں یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ سعادت وخوشبختی۔ جوہمارا انتہا مقصد ہے۔ایک ایسے پروگرام پر عمل کرنے اوراسے نافذ کرنے میں پوشیدہ ہے،جسے خدائے متعال نے ہماری زندگی کے لئے معین فرمایا ہے اور اسے اپنے انبیاء کے ذریعہ ہم تک پہنچایا ہے پس خدائے متعال کے حکم کی اطاعت اور اسکی بندگی ایسا فریضہ ہے کہ جس کے مقابلہ میں ہر فریضہ ناچیز اور حقیر ہے ۔خدائے متعال فرماتا ہے: (وقضی ربّک الاّ تعبدوا الاّ ایّاہ[1]۔۔) ''اور آپ کے پروردگار کا فیصلہ ہے کہ تم اس کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرنا''...(اَلم اعہد الیکم یابنی آدم ان لاّ تعبدوا الشّیطن انّہ لکم عدوّ مبین *وان اعبدونی ہذا صراط مستقیم[2])''اولاد آدم !کیا ہم نے تم سے اس بات کا عہد نہیں لیا تھا کہ خبردار شیطان کی عبادت نہ کرنا کہ وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے ۔اور میری عبادت کرنا کہ یہی صراط مستقیم اور سیدھا راستہ ہے''

اس بناپر، ہمارا فریضہ ہے کہ مقام بندگی اور اپنی ضرورت کو پہچانیں اور خدائے متعال کی لا محدود عظمت وکبریائی کو مد نظر رکھیں اور اس کو ہر جہت سے اپنے اوپر مسلط جان کر اس کے فرمان کی اطاعت کریں ۔ہم پر واجب ہے کہ خدائے متعال کے سوا کسی اورکی پرستش نہ کریں اور پیغمبر گرامیؐاور ائمہ ہدیٰ۔کہ خدائے متعال نے ہمیں ان کی اطاعت کا حکم دیا ہے ۔کے علاوہ کسی اور کی اطاعت نہ کریں۔خدائے متعال فرماتا ہے: (...اطیعوا اللّٰہ واطیعوا الرّسول واولی الامر منکم[3]۔۔)...''اللّٰہ کی اطاعت کرو ،رسول اور صاحبان امر (ائمہ)کی اطاعت کرو''البتہ،خدائے متعال اوراولیائے دین کی اطاعت کے اثر میں،عملاً خدا سے منسوب ہر چیز کا مکمل احترام کرنا چاہئے ۔خدااوراولیائے دین کے نام کو ادب کے ساتھ لینا چاہئے۔ خداکی کتاب (قرآن مجید)،کعبہ شریف،مساجد

---

[1] اسراء،۲۳
[2] نساء،۵۹
[3] نساء،۵۹

اوراولیائے دین کی قبور کا احترام کرنا چاہئے چنانچہ خدائے متعال فرماتا ہے:(...ومن یعظّم شعائر اللہ فانہا من تقوی[1]) ''جو بھی اللہ کی نشانیوں کی تعظیم کرے گا یہ تعظیم اس کے دل کے تقوی کا نتیجہ ہوگی''.

اپنے بارے میں انسان کا فریضہ

انسان ،اپنی زندگی میں جو بھی روش اختیار کرے اور جس راستہ پر چلے،حقیقت میں وہ اپنے لئے سعادت و کامیابی کے علاوہ کوئی چیز نہیں چاہتا ۔چونکہ سعادت کو پہچاننا،کسی اورچیز کی پہچاننے کے ضمن میں ہے ،یعنی جب تک ہم خود کو نہ پہچانیں گے اس وقت تک اپنی حقیقی ضرورتوں ۔کہ ان کو پورا کرنے میں ہماری سعادت ہے۔کو بھی نہیں پہچان سکیں گے ۔اس بناپر انسان کا سب سے اہم فریضہ یہ ہے کہ خود کو پہچان لے تاکہ اس کے سبب اپنی سعادت وخوشبختی کو سمجھے اور اپنے پاس موجود وسائل کے ذریعہ اپنی ضرورتوں کودور کرنے کی کوشش کرے اوراپنی گراں بہا عمر،جو اسکا تنہا سرمایہ ہے،کومفت میں ضائع نہ ہونے دے ۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں'' : جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے خدا کو پہچان لیاہے[2]''امیر المؤ منین حضرت علیؑ فرماتے ہیں'': جس نے اپنے آپ کوپہچان لیا،وہ معرفت کے بلند ترین مقام پر پہنچ گیا[3]''انسان،اپنے آپ کوپہچاننے کے بعد متوجہ ہوتا ہے کہ اس کا سب سے بڑا فریضہ یہ ہے کہ وہ گوہر انسانیت کی قدر کرے ۔

اس گوہرتابناک کو ہواوہوس کے ذریعہ پامال نہ کرے ،اپنی ظاہری وباطنی صفائی کے لئے کوشش کرے تاکہ ایک شیرین ،لذت بخش اورابدی زندگی کو حاصل کرسکے ۔امیرالمؤ منین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں'': جو شخص اپنا احترام کرے گا ،اسکے سامنے نفسانی خواہشات حقیر اورناچیز ہوں گی[4]۔''انسانی وجود دوچیزوں کا مرکّب ہے :''روح اوربدن''انسان کا فریضہ ہے کہ ان دونوں

---

[1] حج،۳۲)
[2] بحارالانوار،ج۶۱،ص۹۹۔
[3] غررالحکم،ج۲ص۱۲۸۷ص۶۹۸۔
[4] غررالحکم ،ج۲،ص۶۸۱،ح۱۱۰۹۔

ارکان کی صحت واستحکام کے لئے کوشش کرے اوراسلام کے مقدس دین میں دونوں حصوں کے بارے میں بیان کئے گئے مفصل اور کافی احکام کے مطابق بدن اور روح کی صفائی کی کوشش کرے ۔

بدن کی صفائی

دین مقدس اسلام نے کچھ قوانین و ضوابط کے ضمن میں ،جسمانی صفائی کی کافی تاکید کی ہے، جیسے :خون ،مردار ،بعض حیوانوں کا گوشت اورزہریلی غذاؤں کو کھانے سے منع کیاہے ۔ شراب نوشی، نجس پانی پینے پرُخوری،اور بدن کو ضرر پہنچانے کی نہی کی ہے اس کے علاوہ دوسرے احکامات ہیں کہ اس فصل میں ان سب کی تفصیل بیان کرنے کی گنجائش نہیں ہے ،خلاصہ کے طور پر کہا جاسکتا ہے کہ اسلام نے انسان کو تمام نقصان دہ چیزوں سے پرہیز کرنے کا حکم دیا ہے ۔

صفائی کا خیال

صفائی،حفظان صحت کے اہم اصولوں میں سے ایک اصول ہے،اسی لئے دین اسلام میں اس اصول کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔جواہمیت اسلام میں صفائی کو دی گئی ہے ،کسی اور دین میں نہیں پائی جاتی ہے۔پیغمبراسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے"،:النظافۃ من الایمان"[1]

"صفائی ایمان کا حصہ ہے"

اسکے علاوہ اسلام عام طورپر صفائی اور پاکیزگی کا حکم دیتا ہے ،بالخصوص ہرایک کے لئے صفائی کی نصیحت کرتا ہے ،جیسے :ہاتھ پاؤں کے ناخن کاٹنا ،سراوربدن کے زائد بالوں کو صاف کرنا ،کھانا کھانے سے پہلے اوربعد میں ہاتھوں کو دھونا ،بالوں کو کنگی کرنا،کلی کرنا اور ناک میں پانی ڈالنا ،دن میں کئی بارمسواک کرنا ،گھر کو جھاڑو کرنا،راستوں، گھر کے دروازوں اور درختوں وغیرہ کے نیچے کوصاف

---

[1] نہج الفصاحہ،ح۳۱۶۱،ص۶۳۶۔

ستھرا رکھنا۔ اسکے علاوہ اسلام نے بعض عبادتوں کا حکم دیا ہے کہ جن کا تعلق صفائی وپاکیزگی وغیرہ سے ہے، جیسے: لباس اور بدن کو نجاستوں سے پاک کرنا، دن میں کئی مرتبہ نماز کے لئے وضو کرنا اور نماز و روزہ کے لئے مختلف غسل کرنا۔

کلّی اور مسواک

انسان منہ سے کھانا کھاتا ہے اور کھانا کھانے کی وجہ سے منہ آلودہ ہوتا ہے، دانتوں کے درمیان، زبان پر اور منہ کی دوسری جگہوں پر کھانے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے رہ جاتے ہیں، اس لئے منہ کے اندر بدبو پیدا ہوجاتی ہے اور بعض اوقات کھانے کے ٹکڑوں میں کیمیائی عمل ورد عمل اور خمیر ہونے کی وجہ سے زہریلے مواد وجود میں آتے ہیں اور کھانے کے ساتھ مل کر معدے میں جاتے ہیں۔ اسکے علاوہ ایسا شخص لوگوں کے مجمع میں سانس لیکر بدبو پھیلاتا ہے اور دوسروں کو اذیت پہنچاتا ہے۔

اس لئے شرع مقدس اسلام نے مسلمانوں کو حکم دیاہے کہ ہر دن (خاص کر ہر وضو سے پہلے) اپنے دانتوں کو مسواک کریں اور صاف پانی سے کلّی کریں اور اپنے منہ کو آلودگی سے پاک کریں۔ استشاق (ناک میں پانی ڈالنا) سانس لینا، انسان کی ضروریات زندگی میں سے ہے اور غالباً جو ہوا انسان کے رہنے کی جگہ پر ہوتی ہے، گرد و غبار اور کثافت سے خالی نہیں ہوتی، البتہ ایسی ہوا میں سانس لینا نظام تنفس کے لئے مضر ہے۔

اس ضرر کو روکنے کے لئے خدائے مہربان نے ناک کے اندر کچھ ایسے بال اگائے ہیں جو گرد و غبار کو پھیپھڑوں تک پہنچنے نہیں دیتے، اس کے باوجود کبھی گرد و غبار ناک کے اندر جمع ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے ناک کے بال اپنی ذمہ داری نبھانے سے قاصر رہتے ہیں۔ اسلئے دین اسلام میں حکم دیاگیاہے کہ مسلمان دن میں کئی بار وضو سے پہلے ناک میں پانی ڈالیں اور اپنی ناک میں صاف پانی ڈال کر اپنے تنفس سے مربوط حفظان صحت کی رعایت کریں۔

تہذیب اخلاق

انسان،اپنے خداداد ضمیر سے پسندیدہ اخلاق کی قدرو قیمت کو سمجھتا ہے اور اسکی انفرادی واجتماعی اہمیت کو جان لیتاہے ۔لہذا انسانی معاشرے میں کوئی ایسا شخص نہیں ہے کہ جوپسندیدہ اخلاق کی تعریف اور پسندیدہ اخلاق رکھنے والے شخص کااحترام نہ کرے ۔جواہمیت انسان پسندیدہ اخلاق کو دیتاہے وہ محتاج تعارف وبیان نہیں ہےاوراسلام میں اخلاق کے بارے میں جووسیع احکام بیان ہوئے ہیں وہ سب واضح ہیں ۔خدائے متعال فرماتا ہے: (ونفس وماسوّٰ ہا *فألہمَہا فجورَہاوتقوٰہا *قد افلح من زکّٰہا *وقد خاب من دسّٰہا[۱])

''اورنفس کی قسم اور اس خداکی قسم جس نے اسے درست کیاہے ٭پھر بدی اور تقویٰ کی ہدایت دی ہے ٭بیشک وہ کامیاب ہوگیاجس نے نفس کوپاکیزہ بنالیا ٭اوروہ نامراد ہوگیا جس نے اسے آلودہ کردیاہے'' حصول علم پسندیدہ معنوی صفات میں سے ایک علم ہےاورعالم کی جاہل پر فضیلت وبرتری اظہر من الشمس ہے ۔

جو چیز انسان کودوسرے حیوانات سے جدا کرتی ہے بیشک وہ عقل کی طاقت اور علم کا زیور ہے ۔دوسرے حیوانات میں سے ہر ایک اپنی خاص بناوٹ کے مطابق ناقابل تغییر فطرت رکھتاہے اوریکساں صورت میں اپنی زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے اور اس کی زندگی میں ہرگزکسی قسم کی ترقی اور بلندی کی کوئی امید نہیں پائی جاتی.وہ اپنے اور دوسروں کے لئے کوئی نیا باب نہیں کھول سکتے ہیں یہ صرف انسان ہے جوعقل کی طاقت سے،ہرروز اپنے گزشتہ معلومات میں جدید معلومات کااضافہ کرتاہے اور طبیعت اورمادرای طبیعت کے قوانین کوکشف کرکے ہرزمانہ میں اپنی مادی اور معنوی زندگی کو تازگی اوررونق بخشتا ہے،اپنے ماضی کے ادوار پرنظرڈال کراپنے اوردوسروں کے مستقبل کی بنیاد ڈالتا ہے ۔اسلام نے علم حاصل کرنے کے سلسلہ میں اس قدرتاکید کی ہے کہ پیغمبراسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں'': علم حاصل کرناہر مسلمان پر واجب ہے ''[۲]''علم حاصل کرو،اگرچہ چین میں بھی

---

[۱] شمس،۷۔۱۰

[۲] اصول کافی ،ج۱،ص۳۰۔

ہو[1]"، "گہوارہ سے قبر تک علم حاصل کرنیکی کوشش کرو[2]"،اسلام،خلقت کے اسرار کوجاننے اورآسمانوں،زمین ،انسان کی فطرت،تاریخ وملل اور اپنے اسلاف کے آثار (فلسفہ،علوم ریاضی وطبیعی وغیرہ)کے بارے میں غور وخوض کرنے کی بہت تاکید کرتا ہے اور اسی طرح اخلاقی اورشرعی مسائل (اسلامی اخلاق و قوانین)اور صنائع کے اقسام ۔جو انسان کی زندگی کو منظّم کرتے ہیں۔کو سیکھنے کی اسلام بہت ترغیب دیتااور تاکید کرتا ہے ۔پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نظر میں علم کی اہمیت اس قدر ہے کہ جنگ بدر میں جب کفار کی ایک جماعت مسلمانوں کے ہاتھوں اسیر ہوگئی،توآنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ اسیروں میں سے ہر فرد زیادہ رقومات ادا کرکے آزاد ہوسکتاہے،لیکن اسیروں میں جو افراد تعلیم یافتہ تھے وہ یہ رقومات ادا کرنے سے اس شرط پر مستثنیٰ قرار دیئے گئے کہ ان میں سے ہر ایک دس جوان مسلمانوں کو لکھناپڑھنا سکھائے ۔

اسلام کی نظرمیں طالب علم کی اہمیت

ہر مقصد تک پہنچنے کے لئے سعی وکوشش کی اہمیت خوداس مقصدکی اہمیت کے برابر ہوتی ہے اور چونکہ ہرانسان اپنی خداداد فطرت سے عالم بشریت میں علم ودانش کو ہر چیز سے بالا تر جانتا ہے،لہذا طالب علم کی قدرو قیمت بالا ترین قدرو قیمت ہوگی اس چیز کے پیش نظر کہ اسلام ایسادین ہے کہ جو فطرت کی بنیادوں پر مستحکم واستوار ہے لہذا ا بلاشبہہ طالب علم کی سب سے زیادہ قدروقیمت کا قائل ہے ۔پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں "؛جو علم حاصل کرنے کی راہ میں ہو،وہ خدا کا محبوب ہے[3]"اس کے باوجود کہ جہاد،دین کی بنیادوں میں سے ایک بنیاد ہے اور اگر پیغمبریا امامؑ حکم جہاد دیدیں توعام مسلمانوں کا جنگ میں شریک ہونا ضروری ہوجاتا ہے ،لیکن جو لوگ دینی تعلیم حاصل کر رہے ہیں وہ اس حکم سے مستثنیٰ اور معاف ہیں ۔ زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو ہمیشہ علمی مراکزمیں تعلیم حاصل کرنے میں مشغول رہنا چاہئے ۔خدائے متعال فرماتا ہے: (وما کان المؤمنون لینفروا کآفّة فلولا نفر من

---

[1] نہج الفصاحہ،ح۳۲۴،ص۶۳۔
[2] نہج الفصاحہ،ح۳۲۷،ص۶۴۔
[3] بحارالانوار،(ج۱ ص۱۷۸،ح۶۰)

کلّ فرقۃ منہم طائفۃ لیتفقّھوا فی الدین ولینذروا قومہم اذا رجعوا الیہم لعلّہم یحذرون[1]) ''صاحبان ایمان کا یہ فرض نہیں ہے کہ وہ سب کے سب جہاد کے لئے نکل پڑیں تو ہر گروہ میں سے ایک جماعت اس کام کے لئے کیوں نہیں نکلتی ہے کہ دین کا علم حاصل کرے اور پھر جب اپنی قوم کی طرف پلٹ کر آئے تو اسے عذاب الٰہی سے ڈرائے کہ شاید وہ اسطرح ڈرنے لگیں ۔''

معلم اور مربی کی اہمیت

علم اور طالب علم کے بارے میں مذکورہ بیان سے اسلام میں معلم کی بھی اہمیت واضح ہوجاتی ہے ۔پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''؛من تعلّمت منہ حرفا صرت لہ عبدا[2]'' ''جو مجھے ایک کلمہ تعلیم دیدے میں خود کو اس کا بندہ قرار دوں گا''حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں '': لوگوں کے تین گروہ ہیں ؛پہلا :عالم ربانی دوسرا :جواپنی اوردوسروں کی نجات کے لئے علم حاصل کرتا ہے ۔تیسرا :وہ لوگ جو عقل ودانش سے عاری ہوتے ہیں ان لوگوں کی مثال اس مکھی کی سی ہے جو جانوروں کے سروصورت پر بیٹھتی ہے اورہوا کے چلنے پر ادھر ادھر اڑتی ہے یاجہاں سے بھی بدبو آتی ہے اسکی طرف دوڑتی ہے'' ۔

معلم اور شاگرد کا فریضہ

قرآن مجید،علم ودانش کو انسان کی حقیقی زندگی جانتا ہے ،کیونکہ اگر علم نہ ہوتاتوانسان اورجمادات اورمردوں میں کوئی فرق نہ ہوتا ۔اس بنا پر،طالب علم کو چاہئے کہ اپنے معلم کو زندگی کا مرکز تصور کرے تاکہ تدریجاًاپنی حقیقی زندگی کواس سے حاصل کر سکے ،اس لحاظ سے اسے یہ تصور کرنا چاہئے کہ اس کے توسط سے اسے زندگی ملی ہے اس لئے اس کی عزت وتعظیم میں کوتاہی نہ کرے اوراگر تعلیم وتربیت کے سلسلہ میں اس کی طرف سے اگر سختی بھی دکھائی دے تو اس کی زندگی اور موت کے بعد اس کے احترام میں کوتاہی نہ کرے ۔اسی طرح معلّم کوبھی اپنے آپ کواپنے شاگرد کی زندگی کا ذمہ دار سمجھنا چاہئے اورجب تک اسے ایک زندہ انسان اور فخرومباہات کے درجہ تک نہ پہنچا دے اس وقت تھکن محسوس نہ کرے اورآرام سے نہ بیٹھے۔اگر کبھی اس کا شاگرد تعلیم وتربیت

---

[1] توبہ،۱۲۲

[2] عوالی اللئالی ،ج۱،ص۲۹۲،ح۱۹۳۔

حاصل کرنے میں کوتاہی کرے تواستاد کا حوصلہ پست نہیں ہونا چاہئے ،اگر وہ تعلیم وتربیت میں ترقی کا مظاہرہ کرے تواس کی ہمت افزائی کرنی چاہئے،اگرلاپروائی کرے تواس کی حوصلہ افزائی کر کے اس میں شوق پیدا کرنا چاہئےاور شاگرد کے جذبات کوہرگز اپنے طرزعمل سے مجروح نہ کرے ۔

ماں باپ کے بارے میں انسان کا فریضہ

ماں باپ اپنے فرزندکی پیدائش کا ذریعہ اوراس کے ابتدائی مربی ہیں اس سبب سے دین مقدس اسلام میں سب سے اہم نصیحت وتاکید ماں باپ کی اطاعت اوراحترام کے بارے میں کی گئی ہے ،یہاں تک کہ خدائے متعال توحید کے ذکر کے بعد والدین کے ساتھ نیکی کی نصیحت کرتے ہوئے فرماتا ہے: (وقضی ربّک الّا تعبدواالّا ایاہ وبالوالدین احسٰناً.![1]) ''اور آپ کے پروردگار کا فیصلہ ہے کہ تم سب اس کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرنااورماں باپ کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا ''...جن روایتوں میں گناہان کبیرہ کو گنوایا گیا ہے ان میں شرک کے بعدوالدین کے ساتھ برے برتاؤکو گناہ کبیرہ شمار کیاگیا ہے .خدائے متعال مذکورہ آیہ شریفہ کے ضمن میں بھی فرماتا ہے: (...اِمّا یبلغنّ عندکَ الکبر احدہما اوکلاہمافلا تقل لّہمااُف ولا تنہرہما و قل لہما قولاً کریماً *واخفض لہما جناح الذّل من الرّحمۃ...[2] '')اور اگرتمہارے سامنے ان دونوں میں سے کوئی ایک یا دونوں بوڑھے ہوجائیں توخبرداران سے اف بھی نہ کہنا اور جھڑکنا بھی نہیں اوران سے ہمیشہ شریفانہ گفتگو کرتے رہنا ،اور ان کے لئے خاکساری کے ساتھ اپنے کندھوں کو جھکادینا ۔ ''

چہ خوش گفت زالی بہ فرزند خویش چو دیدش پلنگ افکن وپیل تن

گر از عہد خردیت یاد آمدی کہ بیچارہ بودی درآغوش من

نہ کردی در این روز بر من جفا کہ تو شیر مردی و من پیر زن

---

[1] اسراء،۲۳
[2] اسراء،۲۳،۲۴)

''کیا خوب کہا ہے ایک بوڑھیا نے اپنے بیٹے سے جب اس کو ایک طاقتور شیر اورہاتھی کے مانند دیکھا اگر تجھے وہ اپنا بچپن یاد آتا جب کہ تم میری آغوش میں ایک بیچارہ طفل تھے؟توآج تم مجھ پریہ ظلم نہ کرتے کہ تم ایک شیر مرد بن چکے ہو اورمیں ایک بوڑھی عورت ہوں۔''دین مقدس اسلام میں،ماں باپ کی اطاعت ،واجب کے ترک ہونے یا حرام میں مرتکب ہونے کے علاوہ، واجب ہے،اور تجربہ سے ثابت ہواہے کہ جن لوگوں نے اپنے ماں باپ کو رنج وتکلیف پہنچائی ہے،وہ اپنی زندگی میں خوشبخت اورکامیاب وکامران نہیں ہوئے ہیں۔

بزرگوں کا احترام

بوڑھوں کا احترام بھی لازم ہے ۔چنانچہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے'': بوڑھوں کا احترام اور تعظیم کرنا خدا کی تعظیم اوراحترام کرنا ہے[۱]''

اپنے رشتہ داروں کے بارے میں انسان کا فریضہ

انسان کے ماں باپ کے ذریعہ جورشتہ دارنسبی رابطہ رکھتے ہیں ،وہ طبیعی خاندان کو تشکیل دینے کا سبب بنتے ہیں اورخونی رشتہ اورانسانی خلیوں کے اشتراک کی وجہ سے انسان کو خاندان کا جزوقرار دیتے ہیں ۔اس طبیعی اتحاد اورارتباط کی وجہ سے اسلام نے اپنے پیروؤں کوصلہء رحم کا حکم دیا ہے اورقرآن مجید اور ائمہ دین کی روایتوں میں اس سلسلہ میں بہت ہی تاکید کی گئی ہے ۔خدائے متعال فرماتا ہے: (...وَاتقوا اللہ الذّی تسا ئلون بہ وَالارحام ان اللہ کان علیکم رقیباً[۲]) ''اور اس خدا سے بھی ڈرو جس کے ذریعہ ایک دوسرے سے سوال کرتے ہواور قرابت داروں کی بے تعلقی سے بھی ۔اللہ سب کے اعمال کا نگراں ہے ۔'' پیغمبر اکرم صلی

---

[۱] بحارالانوار،ج۷۵،ص۱۳۶ح۲۔

[۲] نساء،۱

اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں'' : میں اپنی امت کو صلہء رحم کی نصیحت کرتا ہوں اوراگر رشتہ داروں کے درمیان ایک سال کی دوری کا فاصلہ ہو تو بھی اپنے رشتہ کے پیوند کو نہ توڑیں[1] ۔''

ہمسایوں کے بارے میں انسان کا فریضہ

چونکہ ہمسایہ زندگی بسر کرنے کی جگہ پر ایک دوسرے سے نزدیک ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے سے زیادہ رابطہ رکھتے ہیں اور گویا ایک بڑے خاندان کے حکم میں ہوتے ہیں لہذا ان میں سے کسی ایک کا اچھا اور برا طرز عمل ہمسایوں پر دوسروں کی نسبت زیادہ اثر انداز ہوتا ہے ۔جورات کو اپنے گھر میں صبح ہونے تک شور و غل مچاتا ہے ،وہ شہر کے آخر میں رہنے والوں کو تکلیف نہیں پہنچاتا ہے ،لیکن اپنے ہمسایہ کے آرام وآسائش میں خلل ڈالتا ہے ۔

جو مالدار اپنے خوب صورت محل میں عیش و عشرت میں زندگی گزار رہا ہے،دور رہنے والے مفلسوں کی نگاہوں سے دور ہے ،لیکن ہر لمحہ اپنے ایک تنگ دست اور غریب ہمسایہ کی جھونپڑی میں اُگے ہوئے ایک پھول کے پودے کو آگ لگا تا ہے ،تو یقیناً ایک دن ایسا آئے گا جب وہ اپنے کیفر کردار تک پہنچ جائے گا ۔اس لحاظ سے دین مقدس اسلام میں ہمسایہ کے حالات کی رعایت کرنے کی بہت تاکید کی گئی ہے ۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں'' :جبرئیل امین نے ہمسایہ کے بارے میں اس قدر مجھے نصیحت کی کہ مجھے گمان ہونے لگا کہ خدائے متعال ہمسایہ کو وارثوں میں قرار دے گا [2]''نیز فرمایا'' :جو شخص اپنے ہمسایہ کو تکلیف پہنچائے گا ،اس تک بہشت کی خوشبو نہیں پہنچے گی ۔جو اپنے ہمسایوں کے حق کی رعایت نہیں کرے گا ،وہ ہم میں سے نہیں ہے،اور جو سیر ہوگا اور وہ جانتا ہو اس کا ہمسایہ بھوکا ہے اور اسے کچھ نہ دے تو وہ مسلمان نہیں ہے[3] ۔''

---

[1] اصول کافی ،ج۲،ص۱۵۱۔

[2] مستدرک الوسائل ،ج۸،ص۴۲۷۔

[3] سفینتہ البحار،ج۱،ص۱۹۰۔

ماتحتوں اور بیچاروں کے بارے میں انسان کا فریضہ

بیشک معاشرے کی تشکیل لوگوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے ہوتی ہے اور ایک معاشرے کے افراد کا سب سے اہم فریضہ یہ ہے کہ محتاجوں اور بے چاروں کی دستگیری کریں اور جو لوگ اپنی زندگی کی ضروریات کو پورا کرنے کی طاقت نہیں رکھتے ہیں ،کسی نہ کسی طرح ان کی مدد کر کے ان کی مشکلات کو حل کرے ۔آج تو یہ مسئلہ واضح ہو چکا ہے کہ مالداروں کے مفلس و نادار افراد کی طرف توجہ نہ کرنے کی وجہ سے ایسا بڑا خطرہ لاحق ہے کہ ،جو معاشرے کو نابود کر سکتا ہے اور سب سے پہلے مالدار ہی اس خطرے کے شکار ہوں گے۔ اسلام نے اس خطرہ کے پیش نظر چودہ سو سال پہلے ہی حکم دیا ہے ،کہ مالداروں کو اپنی آمدنی کے ایک حصہ کو ہر سال کمزوروں اور حاجتمندوں میں تقسیم کرنا چاہئے اور اگر اس سے ان کی ضرورت پوری نہ ہو سکے تو مستحب ہے کہ غریبوں کی زندگی کو بہتر بنانے کے لئے جتنا ممکن ہو سکے راہ خدا میں انفاق کریں ۔

خدائے متعال فرماتا ہے: (لن تنالوا البرّ حتّٰی تنفقوا مِا تُحِبّون"[1])تم نیکی کی منزل تک نہیں پہنچ سکتے جب تک اپنی محبوب چیزوں سے راہ خدا میں انفاق نہ کرو"،لوگوں کی خدمت و مدد کے بارے میں نقل کی گئی حدیثیں بے شمار ہیں۔پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں": خیر النّاس انفعہم للنّاس[2]""لوگوں میں سب سے بہتر وہ ہے جو سب سے زیادہ لوگوں کے لئے فائدہ مند ہو۔"،نیز فرماتے ہیں"": قیامت کے دن خدا کے نزدیک اس شخص کا مقام سب سے بلند ہو گا جو خدا کے بندوں کی حاجت روائی کی راہ میں سب سے زیادہ اقدام کرے[3]۔"

در بلا یار باش یاران را   تا کند فضل ایزدت یاری

بہ ہمہ حال بدروی روزی   تخم نیکی کہ این زمان کاری

---

[1] آل عمران ,۹۲
[2] نہج الفصاحہ،ح۱۵۰۰،ص۳۱۵۔
[3] کنز العمال ،ج۶ ،ص۵۹۵۔

معاشرے کے بارے میں انسان کا فریضہ

چنانچہ ہم جانتے ہیں کہ لوگ ایک دوسرے کی مدد سے کام کرتے ہیں اور اس کے نتیجہ میں ایک دوسرے کے کام وکوشش سے استفادہ کرتے ہیں اوراپنی زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں ۔ان افراد سے تشکیل پانے والا معاشرہ ایک بڑے انسان کے مانند ہے اور تمام افراد اس بڑے انسان کے اعضاء کے مانند ہیں ۔انسان کے بدن کا ہر عضو،اپنے مخصوص کام کو انجام دیتا ہے اور اپنے کام کے نفع کے علاوہ دوسرے اعضاء کے منافع سے بھی فائدہ اٹھاتا ہے یعنی اپنی سر گرمی کی حالت میں اپنے نفع کو دوسرے اعضاء کے منافع کے ضمن میں حاصل کرتا ہے اوردوسروں کی زندگی کے سائے میں اپنی زندگی کو جاری رکھتا ہے ۔اگر سارے اعضاء خود غرض ہوتے اور دوسروں کے کام نہ آتے،مثلا جہاں پر ہاتھ پاؤں اپنے کام میں مشغول ہیں،آنکھ اپنی نگاہ سے ان کا تعاون نہ کرتی یامنہ غذا کو چبانے اوراس سے لذت حاصل کرنے پر اکتفا کرتا اور معدہ کی ضرورت کوپورا نہ کرتا یعنی کھانے کو نہ نگلتا توانسان بلا فاصلہ مر جاتا اورنتیجہ کے طور پر خود غرض وانحصار طلب اعضاء بھی مر جاتے۔

معاشرہ کے بارے میں معاشرے کے افراد کا فریضہ بھی ایک انسان کے بدن کے اعضاء کے مانند ہے ۔یعنی انسان کواپنا منافع معاشرے کے منافع کے ضمن میں حاصل کرنا چاہئے اور اپنے کام وکوشش سے معاشرے کو فائدہ پہنچانے کا خیال ہونا چاہئے تاکہ اپنی محنتوں سے بہرہ مند ہو سکے اور سبھی کو فائدہ پہنچائے تاکہ خود بھی بہرہ مند ہو سکے ۔

تمام لوگوں کے حقوق سے دفاع کرے تاکہ خود اسکے حقوق نابودنہ ہوں ۔یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے ہم اپنی خداداد فطرت سے سمجھتے ہیں اوردین مقدس اسلام بھی ۔جوفطرت وخلقت پر استوارہے۔اس کے علاوہ کوئی اور حکم نہیں رکھتا۔پیغمبراکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں'' : مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں اوراجنبیوں کے مقابلہ میں ایک دست،ایک دل اوریک جہت ہیں''[1]مزید فرماتے ہیں'' : المسلم من سلم المسلمون من یدہ ولسانہ''[2] ''مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اورزبان سے دوسرے مسلمان امان

---

[1] نہج الفصاحہ ، ص ۶۲۵، ح ۳۰۸۱ و ۳۰۸۲۔
[2] بحارالانوار ج۷۷ص۵۳۔

میں رہیں''، مزید فرماتے ہیں'' :من اصبح ولم یہتم باموار المسلمین فلیس بمسلم''[1] ''جو مسلمانوں کے مسائل کو اہمیت نہ دے وہ مسلمان نہیں ہے۔''

اسی وجہ سے، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جنگ تبوک میں لشکر اسلام کو لے کر روم کی سرحد کی طرف روانہ ہوئے تو اس وقت تین افراد نے اس جنگ میں شرکت نہیں کی تھی۔

اسلامی لشکر کے جنگ سے واپس آنے پر جب یہ تینوں آدمی ان کے استقبال کے لئے گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سلام کیا، تو آنحضرتؑ نے اپنے رخ کو موڑ لیا اور ان کے سلام کا جواب نہیں دیا اور اسی طرح مسلمانوں نے بھی ان سے اپنا منہ موڑ لیا، نتیجہ میں مدینہ منورہ میں کسی نے حتی ان کی عورتوں نے بھی ان سے بات نہیں کی انہوں نے بے بس ہو کر مدینہ کے پہاڑوں میں پناہ لی اور توبہ واستغفار کیا۔ چند دنوں کے بعد خدائے متعال نے ان کی توبہ قبول کی پھر وہ شہر کے اندر آ گئے۔

عدالت

قرآن مجید اور ائمہ دین کی روایتوں کے مطابق عدالت کی دو قسمیں ہیں: انفرادی عدالت اور اجتماعی عدالت۔ عدالت کی یہ دونوں قسمیں دین مبین اسلام کی نظر میں نہایت اہمیت کی حامل ہیں۔

انفرادی عدالت

انفرادی عدالت سے مراد وہ عدالت ہے کہ انسان جھوٹ، غیبت اور دوسرے گناہان کبیرہ سے پرہیز کرے اور دوسرے گناہوں کو بار بار انجام نہ دے۔ جس میں یہ صفت ہو، اسے عادل کہتے ہیں اور اسلام کے قوانین کے مطابق ایسا شخص جج، حاکم، تقلید

[1] اصول کافی، ج ۲، ص ۱۶۳۔

،اوردیگر اجتماعی ذمہ داریوں کوسنبھال سکتا ہے ۔لیکن جس میں یہ دینی صفات موجودنہ ہوں وہ ان اختیارات سے بہرہ مند نہیں ہوسکتاہے۔

اجتماعی عدالت

''اجتماعی عدالت'' سے مرادوہ عدالت ہے کہ انسان دوسروں کے حقوق کے بارے میں افراط وتفریط نہ کرے اورسب کو قانون الٰہی کے مقابلہ میں مساوی قراردے اور اجتماعی عدالت کو نافذ کرنے میں دینی مقررات کے حق سے تجاوزنہ کرے،جذبات میں نہ آئے اورسیدھے راستہ سے منحرف نہ ہو ۔خدائے متعال فرماتاہے:(ان اللہ یامربالعدل [1])بیشک اللہ عدل کا حکم یتا ہے ''.بیشمارآیتوں اور روایتوں میں گفتاروکردارمیں عدالت کے بارے میں حکم ہواہے اورخدائے متعال نے اپنے کلام پاک میں چند مواقع پر ظالموں پر صراحتاً لعنت بھیجی ہے ۔

علم اخلاق میں ''عدالت'' سے مرادملکات وصفات نفسانی میں میانہ روی ہے اور یہ صفت اس میں پائی جاتی ہے جوانفرادی واجتماعی عدالت کی رعایت کرتا ہو۔سچائی لوگوں کے درمیان آپس میں رابطہ،جوانسان کی اجتماعی بنیاد ہے، ''گفتگو'' سے برقرارہوتی ہے ۔اس بنا پرسچ بات جو انسان کیلئے پوشیدہ حقیقت کو ظاہر کرتی ہے ،اجتماع کے ضروری ارکان میں سے ایک ہے ،اوراہم فائدے۔جن سے اجتماع ہرگز بے نیاز نہیں ہے ۔سچ بات سے حاصل ہوتے ہیں ۔سچائی کے فوائد کومندرجہ ذیل چند جملوں میں بیان کیاجاسکتا ہے: ا۔سچ بولنے والا،اپنے ہم جنسوں کے لئے قابل اعتماد ہوتا ہے اور ان کواس کی ہربات کے بارے میں تحقیق کی ضرورت نہں ہوتی۔

۲۔سچ بولنے والا،اپنے ضمیر کے مقابلہ میں سربلنداور جھوٹ کے رنج سے آسودہ ہوتا ہے ۔

---

[1] نحل،۹۰)

۳۔سچ بولنے والا،اپنے عہدوپیمان کی وفا کرتا ہے اور جوامانت اسکے حوالہ کی جاتی ہے، اس میں خیانت نہیں کرتا ہے،کیونکہ رفتار میں سچائی،گفتار کی سچائی سے جدا نہیں ہے ۔

۴۔سچ بولنے سے،اکثر اختلافات اور لڑائی جھگڑے ختم ہوجاتے ہیں،کیونکہ اکثر اختلافات اور جھگڑے اس لئے وجود میں آتے ہیں کہ ایک طرف یا دونوں طرف کے لوگ حق و حقیقت سے منکر ہوتے ہیں ۔

۵۔سچ بولنے سے ،اخلاقی عیوب اور قانون کی خلاف ورزی کا ایک بڑا حصہ خود بخود ختم ہوجا تا ہے ،کیونکہ اکثر لوگ اسی قسم کے کردار کو چھپانے کیلئے جھوٹ بولتے ہیں امیرالمؤمنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: حقیقی مسلمان وہ ہے جو سچ بولنے کو۔ خواہ اس کے نقصان میں ہو ۔ جھوٹ بولنے پر ترجیح دیتا ہے چاہے وہ اس کے لئے مفید ہی کیوں نہ ہواوراس طرح وہ اندرونی سکون حاصل کرتا ہے[1]۔

جھوٹ

''جھوٹ''اسلام میں گناہ کبیرہ ہے،جس کے لئے خدائے متعال کے کلام میں یقینی عذاب کا وعدہ دیا گیا ہے۔ جھوٹ، صرف شرع میں ہی گناہ اور برا عمل نہیں ہے بلکہ عقل کی رو سے بھی اس کی برائی واضح ہے ۔یہ ناپسندیدہ عمل ،معاشرے میں پھیلنے سے، تھوڑی ہی مدت میں لوگوں کے اجتماعی رابطہ یعنی اعتماد کو ختم کر دیتا ہے ،اوراس قسم کے رابطہ کے ختم ہونے سے ،لوگوں کا ایک دوسرے پر اعتماد نہیں ہوتا لہذا ،انفرادی طورپر زندگی گزارتے ہیں،اگر چہ بظاہر اجتماعی صورت دکھائی دیتی ہے ۔

جھوٹ کے نقصانات

سچ بولنے کے بارے میں مذکورہ بیان سے جھوٹ بولنے کے نقصانات بھی واضح ہو جاتے ہیں۔ جھوٹ بولنے والا انسانی معاشرے

[1] نہج البلاغہ صالح ، کلمات قصار نمبر ۴۵۸ دتھوڑے سے اختلاف کے ساتھ۔

کا نابکار دشمن ہوتا ہے اوراپنے جھوٹ سے،جو ایک بڑا جرم ہے،معاشرے کو خراب کرڈالتا ہے،کیونکہ جھوٹ،نشہ آور چیز کے مانند ہے جومعاشرے کی عقل وشعور کی طاقت کونابود کرکے حقائق پر پردہ پوشی کرتا ہے یا شراب کے مانند ہے جولوگوں کو مست کرکے عقل کی طاقت کو برے اور بھلے میں تمیز کرنے سے بیکار بنادیتا ہے ۔اسی لئے اسلام نے جھوٹ کوگناہان کبیرہ میں شمار کیا ہے اور جھوٹ بولنے والے کے لئے کسی قسم کی دینی شخصیت کا قائل نہیں ہے۔پیغمبراکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''تین طائفے منافق ہیں،اگرچہ وہ نماز بھی پڑھیں اورروزہ بھی رکھیں: جھوٹ بولنے والا،اپنے وعدہ پر وفانہ کرنے والااورامانت میں خیانت کرنے والا ہے[1]''۔امیرالمؤمنین حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا '':انسان جب ایمان کی لذت کوچکھ لیتا ہے، تو جھوٹ کو ترک کر دیتا ہے اگرچہ مذاق میں بھی ہو[2]۔''

غیبت وتہمت

دوسروں کی ''بدگوئی''کرنا اوران کی سرزنش کرنا،اگرسچ ہوتو ''غیبت''ہے اور اگر جھوٹ ہوتو ''تہمت''ہے کبھی سے ''بہتان'' بھی کہا جاتا ہے ۔البتہ پروردگار عالم نے انسان کو(پیغمبروں اورائمہ اطہارؑ کے علاوہ)معصوم خلق نہیں کیاہے اورہر شخص خود میں موجود نقائص کی وجہ سے خطاو لغزش سے محفوظ نہیں ہے اور عام لوگ اس پردہ کے پیچھے زندگی کرتے ہیں جسے اللہ نے اپنی حکمت سے ان کے اعمال پر کھینچا ہے ۔

چنانچہ اگر ایک لمحہ کے لئے اس الہیٰ پردے کوان کے نقائص اور عیوب سے ہٹا دیا جائے تو سب ایک دوسرے سے متنفرہو کربھاگ جائیں گے ،اور ان کے معاشرے کی عمارت زمین بوس ہوکرویران ہو جائیگی ۔اس لئے خدائے متعال نے غیبت کوحرام قراردیا ہے تاکہ لوگ ایک دوسرے کے پیچھے امان میں رہیں ۔اور ان کی زندگی کاظاہری ماحول آراستہ ہوجائے تاکہ یہی ظاہری زیبائی

---

[1] میزان الحکمہ،ج۱۰،ص۱۵۴۔
[2] اصول کافی ،ج۲،ص۳۴۰ ،ح۱۱۔

تدریجاً باطنی برائی کی اصلاح کرے۔ خدائے متعال فرماتا ہے: (...ولایغتب بعضکم بعضاً ایحب احدکم ان یاکل لحم اخیہ میتاً[1])... ''ایک دوسرے کی غیبت بھی نہ کرو کہ کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرے گا کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے؟'''' تہمت'' کا گناہ اور اس کی برائی غیبت سے زیادہ شدید ہے اور اس کی برائی عقل کی رو سے واضح ہے ۔ خدائے متعال نے اپنے کلام پاک میں اس کی برائی اور ناجائز ہونے کو مسلم جانا ہے اور بلا چون وچرا ذکر فرماتا ہے: (انّمایفتری الکذب الّذین لایؤمنون ...[2]) ''بیشک جوایمان نہیں رکھتے ہیں وہ افترا کہتے ہیں''...

لوگوں کی عزت پر تجاوز

اسلام میں عصمت دری ،گناہان کبیرہ میں سے ہے اور مواقع کے فرق کے مطابق اس جرم کے لئے سخت سزائیں ،جیسے کوڑے،سنگسار اور قتل وضع ہوئی ہیں۔اس برے عمل کی راہ کا کھلاہونا ،اگرچہ طرفین کی رضامندی سے ہی ہو نسلوں کو۔جسے اسلام نے زیادہ اہمیت دی ہے ،متزلزل کرکے رکھدیتا ہے اور وراثت وغیرہ کے احکام کو معطل کردیتاہے اورآخر کارماں باپ اور فرزند کے پیار کو بے اثر کرکے رکھدیتا ہے اور معاشرے کے حقیقی ضامن زادو ولد کی فطری دلچسپی کونابود کردیتاہے۔

رشوت: کسی ایسے حکم یا کام کے انجام دینے کے لئے پیسے یا کوئی تحفہ لینا ،جبکہ وہ کام پیسے یا تحفہ لینے والے کا فریضہ ہو، تو اس کو ''رشوت'' کہتے ہیں ۔اسلام میں'' رشوت''گناہ کبیرہ ہے اوراس کا مرتکب ہونے والا،اجتماعی اوردینی فوائد (عدالت) سے محروم اورعذاب الہیٰ کا مستحق ہوتاہے ۔کتاب وسنت اسکے گواہ ہیں ۔پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رشوت دینے اور لینے والے اوران کے درمیان واسطہ بننے والے، پر لعنت کی ہے[3]۔چھٹے امام حضرت امام جعفرصادق علیہ السلام فرماتے ہیں '': کسی کی حاجت پورا کرکے رشوت لینا خدا سے کفرکے برابر ہے[4]''البتہ یہ سب سرزنش اورمذمت اس رشوت کے بارے میں

---

[1] حجرات،۱۲
[2] نحل،۱۰۵
[3] سفینۃالبحاء،ج۱،ص۵۲۳۔
[4] سفینۃالبحاء،ج۱،ص۵۲۳۔

ہے جو حق بجانب حکم اور عادلانہ عمل کے بارے میں لی جائے اور جو رشوت غیر حق بجانب حکم اورظالمانہ عمل کے لئے لی جائے ،اس کا گناہ بہت بڑا اوراس کی سزا شدید تر ہے ۔

حسن معاشرت:انسان جو سماج میں زندگی بسر کرتا ہے ،اس کے لئے لوگوں کے ساتھ مل جل کر زندگی بسر کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے ۔بیشک یہ مل جل کر رہنا اس لئے ہے تاکہ انسان اپنی انسان اپنی اجتماعی زندگی کا تحفظ کر سکے اور روزبروزاپنی مادی ومعنوی ترقی میں اضافہ کرے اورزندگی کی مشکلات کوبہتروآسان ترصورت میں حل کرے ۔

لہذا،لوگوں سے ایسا برتاؤ کرنا چاہئے جومحبوبیت کا سبب بنے اور دن بدن انسان کے اجتماعی وزن کو بڑھاوادے اوراس کے دوستوں میں اضافہ ہو،کیونکہ اگرلوگ کسی سے مل کر سنگینی یاتلخی کا احساس کریں گے توان کے دلوں میں نفرت اورتنگی پیدا ہوجائے گی اورآخر کارایک ایسادن آئے گا جب سب لوگ اس سے دوری اختیار کریں گے اورایسا شخص معاشرے میں منفورومبغوض ہو جائے گا اور اس کو سماج میں ہونے کے باوجود تنہائی کی حالت میں اوراپنے وطن میں ہوتے ہوئے بھی غریب الوطنی کی زندگی بسر کرنا پڑے گی اوریہ حالت انسان کی بدبختی کا تلخ وتاریک ترین نمونہ ہے ۔اس لئے دین مقدس اسلام نے اپنےپیروؤں کے لئے حسن معاشرت کی نصیحت وتاکید کی ہےاور اس کے بارے میں بہترین آداب ورسوم بیان فرمائے ہیں۔

منجملہ حکم دیاہے کہ مسلمانوں کوملاقات کے وقت ایک دوسرے کوسلام کرنا چاہئے اور فضیلت اس کے لئے ہے جو سلام کرنے میں سبقت حاصل کرے ۔پیغمبراسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ،سلام کرنے میں پہل کرتے تھے حتی عورتوں اور بچوں کو بھی سلام کرتے تھے ۔اگرکوئی شخص آپؐ کوسلام کرتاتوآپؐ اسکا بہترین جواب دیتے تھے۔خدائے متعال فرماتا ہے:(واذا حییتم بتحیۃ فحیوا باحسن منہااوردُوہا[1]) ''جب تم لوگوں کوسلام کیاجائے،تو تم اس سے بہتر یاویساہی جواب دو''مزید حکم دیاہے کہ انسان لوگوں سے ملتے وقت تواضع اورانکساری سے پیش آئے اور ہرایک کا اسکی اجتماعی حیثیت کے مطابق احترام کرے ۔خدائے متعال فرماتا ہے

---

[1] نساء،۸۶

:(وعباد الرّحمن الّذین یمشون علی الارض ھوناً[1]...) '' اور اللہ کے بندے وہی ہیں جوزمین پرآہستہ فروتنی اورانکساری سے چلتے ہیں ۔''قابل ذکرنکتہ یہ ہے کہ تواضع اورانکساری کے معنی یہ نہیں ہیں کہ انسان خود کو لوگوں کے سامنے ذلیل وخوار کرے اوراپنی انسانیت کو نقصان پہنچائے بلکہ مقصدیہ ہے کہ اپنی قدرومنزلت اورفخرومباہات کو لوگوں کے سامنے ظاہرنہ کرے اوردوسرے عظیم فخرومباہات کو خود سے مخصوص نہ کرے اورلوگوں کو حقیروناچیزنہ سمجھے ۔

اسی طرح لوگوں کے احترام کا معنی یہ ہیں کہ لوگوں کا اس حدتک احترام کرے کہ چاپلوسی نہ ہوبلکہ ہرایک کا اس کی دینی واجتماعی قدرومنزلت کی حد میں احترام کرے،بزرگوں کاان کی بزرگی کے مطابق احترام کرے اوردوسروں کا بھی ان کی انسانیت کے مطابق احترام کرے ۔نیزاحترام واکرام کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اگرکسی سے کوئی ناشائستہ کام سرزدہوتے دیکھے توآنکھیں بند کرکے گزرجائے یاایک ایسی محفل میں جہاں پراہل محفل انسانی شرافت کے خلاف کام انجام دیتے ہوں یاکوئی خلاف شرع عمل انجام دیتے ہوں تو رسوائی سے ڈرکران کے ساتھ ہم رنگ و جماعت ہوجائے ۔لوگوں کا احترام حقیقت میں انسانی شرافت اوران کی دینی قدروں کا احترام ہے نہ کہ ان کے جسم اوراعضاء کا احترام ۔اگرکوئی شخص اپنی انسانی شرافت اوردینی ترجیحات کونابودکردے تو کوئی دلیل نہیں بنتی کہ اس کااحترام کیا جائے ۔پیغمبراسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: دوسروں کی اطاعت کے ذریعہ خدا کی معصیت انجام نہیں دیناچاہئے[2]۔

نیکوں کی مصاحبت

اس کے باوجود کہ انسان بہت سے لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہتا ہے، مگر وہ زندگی کے تقاضے کے مطابق مجبورہے کہ کچھ لوگوں کے ساتھ دوسروں کی نسبت زیادہ مل جل کر رہے ،یہ وہ لوگ ہیں جو''دوست'' کے نام مشہور ہیں ۔البتہ اس دوستی کاسبب اخلاق،روش، اورپیشہ وغیرہ میں ایک قسم کی یکسانیت ہے جودویاچند افراد کے درمیان پائی جاتی ہے اور چونکہ وابستگی اورمصاحبت

---

[1] فرقان،۶۳
[2] وسائل الشیعہ ،ج۱۱،ص۴۲۲۔

کے نتیجہ میں رفتہ رفتہ دو ہم نشین افراد کے عادات واخلاق ایک دوسرے میں منتقل ہوتے ہیں،لہذا انسان کونیک انسانوں کی دوستی اختیار کرنی چاہئے،کیونکہ اس صورت میں ان کے نیک اخلاق اس میں سرایت کریں گے اس کی بے لوث اور خیر خواہانہ دوستی سے استفادہ کرے گا اوراس کی دوستی کی پائداری سے مطمئن رہے گا۔اس کے علاوہ لوگوں کی نظروں میں اس کی اجتماعی حیثیت بھی بڑھ جائے گی۔

امیرالمؤمنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں'': خیر الاصحاب من یدلّک علی الخیر[1]''،''بہترین دوست وہ ہے جو تجھے نیک کام کی طرف راہنمائی کرے۔''مزید فرماتا ہے'': المرء یوزن بخلیلہ[2]''،''مرد اپنے دوست کے ذریعہ تولا جاتا ہے''۔تو اول بگوبا چہ کس زیستی کہ تا من بگویم کہ تو کیستی ہمان قیمت آشنایان تو بود قیمت و ارزش جان تو تم پہلے یہ بتاوکہ تم کس کے ہم نشیں ہوتاکہ میں بتاسکوں کہ تم کون ہوتیری قدر وقیمت بھی وہی ہوگی جو تیرے دوست کی ہے۔

بروں کی مصاحبت:بروں اور گنہگاروں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا بد بختی اور برے انجام کا سبب بنتاہے۔اس مطلب کی وضاحت کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ اگر ہم مجرموں اور بدکرداروں جیسے چوروں اورڈاکوؤں سے ان کے انحراف وگمراہی کے سبب کے بارے میں پوچھیں تو وہ کسی شک وشبہہ کے بغیر جواب دیں گے کہ برے لوگوں کی مصاحبت اورمعاشرت نے ہمیں اس مصیبت میں گرفتارکیا ہے ۔ہزاروں بدکرداروں میں ایک آدمی بھی ایسا نہیں ملے گا کی جس نے خود بخودناشائستہ راستہ کوانتخاب کیاہو۔امیرالمؤمنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں'': بروں کی ہم نشنی سے پرہیز کرو،کیونکہ برادوست تم کو اپنے جیسا بنادے گا،اور وہ تمہارے جیسانہیں بنے گا''مزید فرماتے ہیں'': ایاک ومصادقۃ الفاجر فانہ یبیع مصادقہ بالتا فۃ[3]''،''بدکردارکی دوستی سے

[1] میزان الحکمۃ،ج۲،ص۳۲۷۔
[2] شرح غررالحکم ،ج۲،ص۲۸۹۔
[3] غررالحکم ،ح۱۰۷،ص۱۵۹۔

پرہیز کرو کیونکہ وہ تم کو معمولی چیز کے مقابلہ میں بیچ دے گا''، بابدان کم نشین کہ درمانی خوپذیراست نفس انسانی'' بروں کی ہم نشی کم اختیار کرو، کیونکہ انسان دوسروں کی عادت کو قبول کرنے والا ہوتا ہے''

ماں باپ پر اولاد کے حقوق

انسان کو جو کام انجام دینا چاہئے جس کے بارے میں انجام دیتا ہو او راس کو اس کا نفع ملتا ہو تو اسے ''حق'' کہتے ہیں اور جس کے لئے اسے انجام دینا چاہئے اسے ''فریضہ، حکم اور تکلیف'' کہتے ہیں۔ مثلا کوئی شخص کسی کے لئے اجرت پر کوئی کام انجام دیتا ہے، تو اجرت ادا کرنا صاحب کا رکا فرض ہے اور مزدور کا حق ہے۔ اگر صاحب کار نے اجرت ادا نہ کی تومزدور اس سے مطالبہ کر سکتا ہے اور اپنے حق کا دفاع کر سکتا ہے، کیونکہ انسان اس طرح خلق کیا گیا ہے کہ اس دنیا میں اس کی زندگی ابدی نہیں ہے اور خواہ نخواہ کچھ مدت کے بعد، رخت سفر باندھتا ہے، خدائے تعالے نے انسان کی نسل کو نابودی سے بچانے کے لئے تناسل وتوالد کی روش کو قرار دیا ہے اور انسان کو تناسل کے وسائل مہیا کئے ہیں اور اس کے باطنی جذبات کو اس کام کی طرف متوجہ کیا ہے۔ اسی مکمل آمادگی کا نتیجہ ہے کہ انسان فطری طور پر اپنی اولاد کو اپنے بدن کا ٹکڑا سمجھتا ہے اور اس کی بقا کو اپنی بقا جانتا ہے او راس کی آسائش و کامیابی کی راہ میں ہر قسم کی تلاش و کوشش کرتا ہے اور گوناگوں رنج و الم برداشت کرتا ہے، کیونکہ وہ اس کی ذات یا شخصیت کی نابودی کو اپنی ذات یا شخصیت کی نابودی جانتا ہے۔

حقیقت میں وہ خالق کائنات کے حکم کی تعمیل کر تا ہے جو بشر کی بقا چاہتا ہے۔ لہذا ماں باپ کا فرض ہے کہ جس حکم میں ضمیر و شرع متفق ہیں اس کو اپنے فرزند کے بارے میں نافذ کریں اور اس کی اچھی پرورش کریں تا کہ وہ ایک شائستہ انسان بن جائے، اس کے لئے اسی چیز کا انتخاب کریں جس کو انسانیت کی نگاہ میں اپنے لئے انتخاب کرتے ہیں۔ یہاں پر ہم ان میں سے بعض حقوق کو بیان کرتے ہیں: ا۔ پہلے ہی دن سے جب بچہ بات یا اشارہ کو سمجھنے لگے، اس کے ضمیر میں پسندیدہ اخلاق او رشائستہ صفات کی بنیاد ڈال کر انھیں مستحکم کریں اور حتی الامکان اسے بیہودہ باتوں کے ذریعہ نہ ڈرائیں اور اسے بُرے اور عفت کے خلاف کاموں سے

روکیں اور خود بھی اس کے سامنے جھوٹ بولنے ،گالیاں دینے اور برے الفاظ استعمال کرنے سے پرہیز کریں اور اس کے سامنے پسندیدہ کام انجام دیں تا کہ شریف او رعالی مزاج بن جائے اور اپنی طرف سے سنجیدگی،ہمت او رعدالت کامظاہرہ کریں تا کہ ان کی عدالت دوستی اورانسان پروری ''انتقال اخلاق'' کے قانون کے تحت اس میں منتقل ہوجائے اور زیادتی ، حوصلہ شکنی اور خود پرستی سے محفوظ رہے ۔

۲ ۔ جب تک ممیزنہ ہوجائے کھانے پینے، سونے اور اس کی دوسری ضرورتوں میں اس کا خیال رکھیں اور اس کے جسمی حفظان صحت کی رعایت کریں تا کہ وہ ایک سالم بدن اور قوی دماغ اور اچھا مزاج والابن کر تعلیم و تربیت کے لئے آمادہ ہوجائے ۔

۳ ۔ جب بچہ میں تعلیم و تربیت کی استعداد پیدا ہو جائے(عام طو رپر یہ مرحلہ سات سال کی عمر میں آتا ہے) اسے معلم کے حوالہ کریں اور کوشش کریں کہ ایک شائستہ معلم کی تربیت میں رہے تاکہ جو کچھ اس سے سنے اس کا اس پر اچھا اثر پڑے اور وہ اس کے روح کی شرافت،تزکیہ نفس او رتہذیب اخلاق کا سبب بنے ۔

۴ ۔ جب بچے کی عمر اتنی ہوجائے کہ وہ عام پروگراموں یا خاندانی نشست و برخاست میں شرکت کر سکتا ہو،تو اسے اجتماعی رسومات سے آشنا کرنے کے لئے اپنے ساتھ پروگراموں میں لے جانا چاہئے اور پسندیدہ معاشرتوں کے طرز عمل سے اسے آگاہ کرنا چاہئے ۔

اولاد پر ماں باپ کے حقوق

وہ آواز جو ضمیر او رشرع کے منادی کی طرف سے ماں باپ کے کانوں میں پہنچی ا ور انھیں اولاد کے بارے میں ذمہ دار بنادیا، اسی طرح ضمیر اور شرع کی آوازنے اولاد کو بھی متوجہ کیا اور اس پر فرض کردیا کہ اپنے ماں باپ کی نیکیوں کا ۔ ہاتھ،زبان یا ہر وسیلہ سے ۔ شکریہ بجالائے ۔ماں باپ وہ ہیں جو خدا کے ارادہ سے اپنے فرزند کو وجود میں لائے ہیں اور اپنے آرام و سکون اس کے معنوی اور جسمانی آرام و سکون پر قربان کرکے ایک عمر راتوں کو جاگ کر اور دن میں رنج و غم برداشت کرکے اسے ایک قوی انسان

بناتے ہیں۔ کتنی نامردی، پستی اور نمک حرامی ہے کہ انسان اپنے ماں باپ کو اذیت پہنچائے یا ان کے بوڑھاپے اور ناتوانی کے دنوں میں ان کی مدد نہ کرے!!خدا کی توحید ، جو انسان کا پہلا فریضہ ہے،کے بعد دوسرا فریضہ جو اسلام نے انسان کے لئے معین کیا ہے، وہ ماں باپ کے ساتھ اچھا برتاؤ ہے: (وقضی ربّک الاّ تعبدوا اَلّاا ایاہ و بالوالدین احساناً...) [1] ''اور آپ کے پروردگار کا فیصلہ ہے کہ تم سب اس کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا ''...اسلام میں مقرر شدہ فریضے کے مطابق، فرزند کو کسی صورت میں یہ حق نہیں ہے کہ اپنے ماں باپ کو ذلیل و خوار سمجھے اور ایک ایسا کام انجام دے جو ان کی رنجیدگی کا سبب بنے ،اسے ہمیشہ اپنے ماں باپ کا احترام کرنا چاہئے اوران کی نسبت فروتنی اور انکساری او راحسان و نیکی کے ساتھ پیش آنا چاہئے، خاص کر ان کی ضرورت کے وقت ان کی مدد کرنے میں کوتاہی نہ کرے ۔ لیکن جاننا چاہئے کہ ماں باپ کی مرضی کی رعایت کرنا صرف مستحب اور مباح کاموں میں ہے، واجبات میں ان کی مرضی کے مطابق انجام دینا لازم نہیں ہے۔

بھائیوں اور بہنوں کے باہمی حقوق

قرآن مجید میں، رشتہ داروں کے بارے میں بارہا تاکید کی گئی ہے اور قطع رابطہ سے منع کیا گیا ہے ۔ ماں باپ اور اولاد کے بعد انسان کے قریبی ترین رشتہ دار بھائی اور بہن ہیں اور ان کے درمیان اجتماعی رابطہ فطری ہے اور یہ رابطہ تمام رابطوں سے مستحکم اور بنیادی تر ہے ۔ بھائی بہنوں کا فریضہ ہے،کہ ضرورت پر رشتہ کے ناطوں کو نہ توڑیں اور آپس میں تعاون کرکے حتی الامکان ایک دوسرے کی مدد کریں اور ضرورت پر ایک دوسرے کی دستگیری کریں ۔ بڑے ، چھوٹوں کے ساتھ مہربانی اور ہمدردی سے پیش آئیں او رچھوٹے بھی بڑوں کا احترام کریں۔

عاق والدین:خاندانی اجتماع میں اولاد کی ماں باپ سے وہی نسبت ہے جو ایک درخت میں شاخوں کی جڑ سے ہوئی ہے، چونکہ جس طرح درخت کی شاخوں کا وجود جڑ پر منحصر ہوتاہے، اسی طرح فرزند کی زندگی بنیاد ڈالنے والے اس کے ماں باپ ہوتے ہیں۔چنانچہ

---

[1] اسراء/ ۲۳

انسانی معاشرہ والدین اوراولاد کے دوگروہ سے تشکیل پاتا ہے،اسلئے معاشرے کی اصلی بنیاد والدین ہی ہیں ۔ماں باپ کے ساتھ برا سلوک کرنا اورانھیں اذیت وآزارپہنچانا ، نمک حرامی اورنامردی کے علاوہ انسانیت کے انحطاط اور معاشرے کی نابودی کا سبب بنتا ہے ۔ کیوں کہ اولاد کی طرف سے ماں باپ کی بے احترامی،ماں باپ کی طرف سے بھی عدم محبت اوربے توجہی کی صورت میں ظاہر ہوگی اوردوسرے یہ کہ جو اولاد اپنے ماں باپ کو ذلیل وخوار اور پست نگاہ سے دیکھتے ہیں وہ اپنی اولاد سے اپنے سے زیادہ توقع نہیں رکھیں گے اوراپنے بوڑھا پے اورناتوانی کے دنوں میں ان کی طرف سے دستگیری اور مدد کی کوئی امید نہیں رکھیں گے اوراسطرح لا محالہ خاندان کی تشکیل سرد مہری کا شکار ہوگی،جیسا کہ آج کل بہت سے نوجوانوں میں ایسی حالت کا مشاہدہ ہوتا ہے۔اس طرز فکر کا عام ہونا قطعی طورپر تناسل اور توالد کی راہ کو مسدود کرتا ہے،کیونکہ کوئی عقل مند اپنی گراں بہا عمر کوایک ایسے پودے کی پرورش میں صرف نہیں کرتا جس کا نہ وہ پھل کھا سکے گا اورنہ اس کے سایہ میں بیٹھ سکے گا اور نہ اس کو دیکھنے میں غم واندوہ کے علاوہ اسے کوئی فائدہ ہو گا ۔ ممکن ہے ہم تصور کریں کہ حکومت مختلف انعامات سے لوگوں کو خاندان کی تشکیل میں تشویق کرے اور اسطرح ہتناسل وتوالد کا مسئلہ حل ہو جائے ،لیکن یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ اجتماعی رسومات میں سے اگر کوئی بھی طریقہ اور رسم فطری پشت پنا ہی (جیسے ماں باپ اور اولاد کے جذبات)نہ رکھتی ہو تو وہ پائدار نہیں ہے۔اس کے علاوہ فطری جبلتوں میں سے کسی ایک جبلت کو چھوڑنا انسان کومعنوی لذتوں سے محروم کرتا ہے۔

عزت نفس اور کامیابی

یہ بات مسلم اوریقینی ہے کہ ہر معاشرے میں بے چارے اورنادار،مدداوردستگیری کے مستحق ہوتے ہیں ۔ سرمایہ داروں کا فرض ہے کہ ان کی مدد کریں اوران کے اس مسلم حق کو پامال نہ کریں اور شرع مقدس میں اسلام نے بھی اس حق کی رعایت کے سلسلہ میں تاکید و نصیحت کی ہے ،اور دولتمندوں پر ذمہ داری عائد کرتا ہے کہ ناداروں اور بیچاروں کی مدد کریں ۔ خدائے متعال نے قرآن مجید میں خود کو نیکی کرنے والا،بخشش وعطا کرنے والا اور معاف کرنے والاکہاہے .اوراپنے بندوں کو یہ پسندیدہ صفتیں پیدا کرنے کی

ترغیب وتشویق فرماتا ہے ۔ ''خدائے متعال نیک کام انجام دینے والوں کے ساتھ ہے [۱]۔ ''نیز فرماتا ہے'': جس چیز کو انفاق کرتے ہووہ خود تمہارے فائدے میں ہے [۲]۔ ''دوسری جگہ پر فرماتا ہے'': جو کچھ انفاق کرتے ہو،وہ تمھیں پلٹادیا جاتا ہے اور تم نے کسی قسم کا نقصان نہیں اٹھایا ہے[۳]''

احسان اور محتاجوں کی مدد

اجتماعی حالات اوراحسان کے فوائد کے بارے میں غور و فکر اور مطالعہ ان آیات کے مضمون کوواضح کردیتا ہے،کیونکہ حقیقت میں تمام اجتماعی توانائیاں سارے افراد کے لئےکام کرتی ہیں اور جس معاشرے میں کچھ غریب و نادار فقر وتنگ دستی کی وجہ سے کام اور کوشش سے ہاتھ کھینچ لیتے ہیں تو ان کی تعداد کے اعتبار سے مال وثروت کی پیداوار میں کمی واقع ہوتی ہے اور اس کے نامطلوب نتائج تمام لوگوں کواپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں اورنوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ دولت مند دوسروں سے زیادہ بچارے ہوجاتے ہیں، لیکن اگر مالدار اپنی نیکی اور بخشش سے ناداروں کی دستگیری کریں توان کے حق میں بہت اچھے نتائج نکلتے ہیں کہ من جملہ ان کے:

١۔اس کام سے دوسروں کے دلوں میں اپنے بارے میں محبت پیدا کرتے ہیں اورایک گروہ کو اپنا عاشق بناتے ہیں ۔

٢۔ایک ناچیز مال سے اپنے لئے زیادہ احترام حاصل کرتے ہیں ۔

٣۔تمام لوگوں کی پشت پناہی کو اپنے لئے حاصل کرتے ہیں،کیونکہ لوگ نیکی کرنے والے کی طرف داری کرتے ہیں ۔

۴۔اس دن کے خطرے سے محفوظ رہتے ہیں کہ جس دن تمام ناداروں کی ناراضگی جمع ہوکر ہر خشک وتر کو بہادے گی۔

[۱] (عنکبوت،۶۹)۔
[۲] (بقرہ،٢٧٢)۔
[۳] (انفال ،۶۰)۔

۵۔وہی ناچیز مال جوانفاق کیا ہے،اقصاد کا پہیہ حرکت میں آنے کا سبب بنتا ہے اور معاشرے کے مال میں اضافہ ہو کر خود ان کی طرف پلٹتا ہے ۔خدا کی راہ میں انفاق کرنے کی فضیلت اور اسکی طرف ترغیب اور تشویق کرنے کے بارے میں بہت سی آیات وروایات موجود ہیں ۔

تعاون:احسان ونیکی کا مسئلہ جو بیان ہوچکا ،تعاون کے مختلف شعبوں میں سے ایک ہے جوانسانی معاشرے کی بنیاد ہے،کیونکہ سماج کی حقیقت، افراد کاایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دینا ہے تاکہ ایک دوسرے کی مدد سے سبھی کا کام ٹھیک ہو جائے اور سبھی کی زندگی مستحکم اور سبھی کی ضرورتیں پوری ہوجائیں ۔ لیکن یہ تصور نہیں کرنا چاہئے کہ دین مقدس اسلام نے نیکی کوصرف مال کی صورت میں چاہا ہے ،بلکہ ہربیچارے کی دستگیری ،اگرمال کی ضرورت بھی نہ ہو،دین مقدس اسلام کا مقصدہے اورانسانی ضمیر کا مطلوب بھی ہے ۔ایک جاہل کو علم سکھانا،ایک اندھے کاہاتھ پکڑنا،ایک گمراہ کی راہنمائی کرنااورگرے ہوئے کی مدد کرناوغیرہ سب احسان اورنیکی کے مصادیق اور اس تعاون میں سے ہیں کہ ہم نے اجتماع کو تشکیل دینے کے پہلے دن اس کے اعتبارکی تصدیق اورتائید کی ہےاور واضح ہے کہ اگرانسان ،بعض جزئی کام انجام نہ دے تو وہ بنیادی کام بھی انجام نہیں دے گا ،اگر غیراہم اور جزئی فرائض کی رعایت نہ کرے،تو وہ کلی اور اہم فرائض کوبھی انجام نہیں دے گا ۔

خیرات اور نیکیوں کی طرف سبقت کرنا

نیک کام کا پسندیدہ ہونا ان نتائج کی بنا پر ہے جواس سے حاصل ہوتے ہیں البتہ جس قدر یہ نتائج وآثار عوامی تراورپائندہ تر ہوں،اسی قدر نیکی بھی پسندیدہ تر وعالی تر ہوگی،ایک بیمار کا علاج کرنا نیک کام اوراحسان ہے،لیکن ایک ہسپتال کو تعمیر کرنااور اسے چالو کرنا جس میں روزانہ سیکڑوں بیماروں کاعلاج کیا جائے،اس کے ساتھ قابل موازنہ نہیں ہے ۔ایک طالب علم کی تعلیم پسندیدہ ہے ،لیکن ایک ادارہ کی تاسیس کے ساتھ قابل موازنہ نہیں ہے جس میں سالانہ سیکڑوں دانشور علم حاصل کرکے فارغ ہو جائیں۔یہی وجہ ہے کہ عام اوقاف اور عوامی سطح کے خیرات ونیکیاں احسان ونیکیوں کے عالی مراتب شمار ہوتے ہیں ۔ شرع کی زبان میں ان عمومی خیرات

کو ''صدقہ جاریہ'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں'': مرد کی سربلندی کا سبب دو چیزیں ہیں ،ایک فرزند صالح اوردوسرے صدقہ جاریہ'' چنانچہ کتاب وسنت سے معلوم ہوتاہے کہ جب تک ''صدقہ جاریہ'' باقی رہتاہے خدائے متعال ،صدقہ دینے والے کے نام ثواب لکھتا ہے ۔

یتیم کا مال کھانا

جس طرح لوگوں کے ساتھ نیکی کرنا عقلاً و شرعاًپسندیدہ ہے اسی طرح خدا کے بندوں کے ساتھ بُرائی کرنا ناروا اورقابل مذمت کام ہے ،لیکن شرع مقدس اسلام میں ظلم کے چند مواقع کی شدت کے ساتھ نہی کی گئی ہے، کہ ان میں سے ایک ''مال یتیم میں تفریط'' ہے۔ اسلام نے یتیم کا مال کھانے کو گناہان کبیر میں شمار کیا ہے اور قرآن مجید میں صراحت سے بیان کیا گیا ہے، کہ جو یتیم کا مال کھاتا ہے، حقیقت میں وہ آگ کھاتا ہے اور اسے جلتی ہوئی آگ میں ڈال دیا جائے گا ۔

چنانچہ ائمہ اطہار علیہم السلام کے بیانات سے معلوم ہوتاہے کہ اس قدر تاکید کا سبب یہ ہے کہ اگر کسی بوڑھے انسان سے ظلم کیا جائے تو ممکن ہے وہ مقابلہ کرنے کے لئے اٹھ کر اپنے حق کا دفاع کرے گا، لیکن کم عمر یتیم اپنے حق کا دفاع کرنے سے عاجز ہے۔ کسی کو قتل کرنا ظلم کا ایک اور مقام جسے شرع مقدس اسلام میں بہت ناپسند و قابل مذمت سمجھا گیاہے وہ ''قتل نفس اور بے گناہ کو قتل کرنا'' ہے ۔ قتل نفس گناہان کبیرہ میں سے ہے، اور خدائے متعال نے اپنے کلام میں ،ایک انسان کو قتل کرنا پوری انسانیت کو قتل کرنے کے برابر جاناہے، یہ اس لئے ہے کہ انسان کو قتل کرنے والا انسانیت کے ساتھ سروکار رکھتا ہے اور انسانیت ایک آدمی اور ہزار آدمی میں یکساں ہے۔

رحمتِ خدا سے مایوسی:اسلام میں ایک خطرناک ترین گناہ ''خدا کی رحمت سے مایوسی ہے خدا ئے تعالے فرماتاہے:(قل یٰعبادی الّذین اَسرفُوا علی انفسہم لاتقنطوا من رحمۃ اللہ ان اللہ یغفر الذُّنوب جمیعا انّہ ہو الغفور الرّحیم[۱]) '' پیغمبر! آپ پیغام پہنچا دیجئے کہ اے

---

[۱] زمر،۵۳

میرے بندو اجنھوں نے اپنے نفس پرزیادتی کی ہے رحمت خدا سے مایوس نہ ہونا اللہ تمام گناہوں کا معاف کرنے والاہے اور وہ یقیناًزیادہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔ ''ایک دوسری جگہ پر رحمت خداسے مایوس شخص کو قرآن کافر جانتا ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص خدا کی رحمت اور بخشش سے مایوس ہوا، تو پھراس کے پاس باطنی طور پر تحریک کرنے والا محرک نہیں ہے کہ اچھے اور پسندیدہ کام انجام دے یا گناہا ن کبیرہ و صغیرہ اور بُرے کردار سے اجتناب کرے، کیونکہ ان دونوں چیزوں میں اصلی محرک عذاب خدا سے بچنے کے لئے ''رحمت و نجات کی امید'' ہے۔ اورچونکہ یہ امید اس شخص میں نہیں پائی جاتی ہے لہذا یہ شخص اس کافر سے کسی قسم کا فرق نہیں رکھتا ہے جو کسی دین کا پابند نہیں ہے۔

جہاد اور دفاع سے فرار کی سزا

میدان جنگ سے بھاگنے اور دشمن کو پیٹھ دکھانے کے معنی یہ ہیں کہ، بھاگنے والا، اپنی جان کو معاشرے کی زندگی سے زیادہ قیمتی جانتا ہے اور حقیقت میں یہ دشمن کے سامنے دینی مقدسات اور معاشرے کی جان و مال کو پیش کرنے کے مترادف ہے جو اس کی زندگی کی حیثیتیوں کو دھمکاتا ہے۔ اسی لئے جہاداور دفاع سے بھاگنے کوگناہان کبیرہ میں شمار کیاگیا ہے اور خدائے متعال اپنے کلام پاک میں فرماتا ہے: (ومَن یولّھم یومئذ دبرہ الامتحرفا لقتال او متحیّزاالی فء ۃفقد باء بغضب من اللہ وماوٰہ جہنم...[1]) ''اورجوآج کے دن پیٹھ دکھائیگا وہ غضب الہیٰ کا حقدار ہوگا اور اس کا ٹھکانا جہنم ہوگا علاوہ ان لوگوں کے جو جنگی حکمت عملی کی بناپرپیچھے ہٹ جائیں یاکسی دوسرے گروہ کی پناہ لینے کے لئے اپنی جگہ چھوڑدیں۔''

وطن کادفاع:مذکورہ بیانات کے پیش نظر اسلامی معاشرہ اور مسلمانوں کے گھربار کادفاع اہم ترین واجبات میں سے ہے۔ خدائے متعال فرماتا ہے: (ولاتقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات بل احیاء ولکن لاتشعرون[2]) ''اورجولوگ راہ خدا میں قتل ہوجاتے ہیں انھیں مردہ نہ کہوبلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تمھیں ان کی زندگی کاشعور نہیں ہے'' اسلام کی ابتداء میں جان ہتھیلی پر لے کر خونین جنگوں میں

---

[1] انفال،۱۶
[2] بقرہ،۱۵۴

شرکت کرنے والے مجاہدوں اوراپنے پاک خون میں غلطاں ہونے والے شہیدوں کے بارے میں انتہائی حیرت انگیزاورعبرتناک داستانیں موجود ہیں یہ وہی لوگ تھے جنھوں نے اپنے پاک خون اورٹکرے ٹکڑے ہوئے بدن سے اس دین مقدس اسلام کو مستحکم بنایا ہے۔

حق کا دفاع:ایک دوسرادفاع جوآب وخاک کے دفاع سے عمیق تراوروسیع ترہوتا ہے ،وہ حق کادفاع ہے ۔یہ دین اسلام کا تنہامقصدہے۔اس خدائی روش کابنیادی مقصد حق وحقیقت کوزندہ کرنا ہے،اسی لئے اس دین پاک کو''دین حق''کہاگیا ہے ۔یعنی وہ دین جوحق کی طرف سے ہے، حق کے سواکچھ نہیں ہے اور حق کے علاوہ کسی چیز کو اپنا مقصد قرار نہیں دیتاہے ۔خدائے متعال اپنی کتاب کی توصیف میں،جوتمام حقائق کی جامع کتاب ہے فرماتاہے:(...یہدی الی الحق والی طریق مستقیم[1])...''قرآن مجید راہنمائی کرتاہے حق کی طرف اورسیدھے راستہ کی طرف جس میں کسی قسم کاتناقض اورتضاد نہیں پایاجاسکتاہے''اسلئے ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ حق کی پیروی کرے اورحق بات کہے حق سنے اوراپنی تمام توانائیوں اور ہرممکن راہ سے حق کادفاع کرے۔

غیظ وغضب:غیظ وغضب ایک ایسی حالت ہے کہ اگر انسان میں پیدا ہوجائے تواسے انتقام کی فکر میں ڈالتی ہےاور اس کے باطنی آرام کو انتقام لینے کی صورت میں ظاہر کرتی ہے۔ اگر انسان اس حالت میں اپنے نفس کو قابو میں رکھنے کے سلسلہ میں تھوڑی سی سستی اور کوتا ہی کرے تو بلافاصلہ اس کی عقل سلیم غیظ وغضب کے سامنے ہتھیا ر ڈال دیتی ہے اور ہر برا ئی اور ناروااو ناشائستہ چیزاسے صحیح نظرآتی ہےاور وہ اس حد تک پہنچتا ہے کہ انتقامی جذبہ کی وجہ سے ہر درندہ سے بڑا درندہ و اور ہرآگ سے زیادہ شعلہ ور ہوتا ہے ۔اسلام میں انتقام لینے کے سیلاب کو روکنے کے لئے بہت ہی تاکید ہوئی ہے اور اس کی پیروی کرنے کی زبر دست مذمت کی گئی ہے۔ خدائے متعال ان لوگوں پر بہت عنایتکرتا ہے اور انھیں عفو کرتاہے جو اپنے غیظ و غضب پر قابو پاتے ہیں اورغصہ کی حالت میں بردباری سے کام لیتے ہیں۔ فرماتاہے:(...والکاظمین الغیظ و العافین عن النّاس[2])...''اور غصہ کوپی جاتے

---

[1] احقاف،۳۰

[2] آل عمران/۱۳۴

ہیں اور لوگوں کو معاف کرنے والے ہیں۔''(...و اذاما غضبوا ہم یغفرون ...''[1]) اور جب غصہ آتا ہے تو معاف کرتے ہیں۔''کام کا واجب ہونا اور صنعت و حرفت کی اہمیت کام اور سرگرمی ،وہ بنیادیں ہیں،جن پر نظام خلقت استوار ہے اور یہ ہر مخلوق کی بقاء کے ضامن ہیں۔ خدائے متعال نے اپنی مخلوقات میں سے ہر ایک کو اس کے حالات کے مطابق کچھ وسائل سے مسلح کیا ہے کہ ان سے استفادہ کرنے پر وہ منافع کو حاصل کرتا ہے اور نقصانات سے بچتا ہے۔انسان خدا کی مخلوقات میں حیرت انگیز ترین اور پیچیدہ ترین مخلوق ہے، دوسری مخلوقات کی نسبت اس کی حاجتیں زیادہ ہیں اور لہذا زیادہ سرگرمی کی ضرورت ہے تاکہ اس کے ذریعہ، اپنی بے شمار ضرورتوں کو پورا کر سکے اور اپنے خاندانی نظام جسے فطرتاً تشکیل دینا چاہئے کو بھی برقرار کر سکے۔اسلام چونکہ ایک فطری اور اجتماعی دین ہے، لہذا اس نے کاروکسب کوواجب قرار دیا ہے اور بیکار انسانوں کی اہمیت کا قائل نہیں ہے۔

اسلام میں،ہر فرد کواپنے سلیقہ اور شوق کے مطابق صنعت و حرفت جس کی طرف خدائے متعال نے انسانی فکر کی ہدایت کی ہے ان میں سے کسی ایک کوانتخاب کرنا چاہئے اوراس طریقہ سے اپنی روزی کمائے اور معاشرے کی ذمہ داریوں میں سے کسی ایک کواپنے ذمہ لے لے اور لوگوں کی آسودگی کے بارے میں کوشش کرے ۔خدائے متعال فرماتا ہے: (واَن لیس للانسان اِلّا ما سعی[2]) ''اور یہ کہ انسان کے لئے کوئی فائدہ نہیں ہے،مگر یہ کہ سعی وکوشش کرے۔''

بیکاری کے نقصانات

مذکورہ بیانات سے واضح ہوا کہ کاروکوشش ایک راستہ ہے جسے خالق کائنات نے انسان کے اختیارمیں قرار دیا ہے تاکہ اسے طے کر کے اپنی زندگی کی سعادت کو پا سکے ،البتہ خلقت و فطرت کی راہ سے انحراف چاہے کم ہی کیوں نہ ہوانسان کے لئے نقصان کے علاوہ کوئی فائدہ نہیں دیتا ۔اس صورت میں جس چیز پرنظام زندگی استوار ہے ،اس سے انحراف کرنے میں دنیاوآخرت کی بد بختی کے

[1] شوری/۳۷
[2] نجم،۳۹

علاوہ کچھ نہیں ہے ۔اسی لئے ساتویں امام حضرت موسی بن جعفر علیہ السلام فرماتے ہیں'' : کام میں سستی اور تھکاوٹ کااظہار نہ کرناورنہ دنیاوآخرت تیرے ہاتھ سے چلی جائیگی[۱] ۔''

خود اعتمادی:عقائد کے باب میں بار ہایاد دہانی کرائی گئی کہ اسلام کا عام پروگرام یہ ہے کہ انسان خدائے یکتا کے علاوہ کسی کی پرستش نہ کرے اور خالق کائنات کے علاوہ کسی کے سامنے سر تعظیم خم نہ کرے ۔سب خدا کی مخلوق اور اس کی پرورش یافتہ ہیں اوراس کا رزق کھاتے ہیں اور کسی کو کسی پر فضیلت کا حق نہیں ہے،سوائے اس چیز کے جوخدا کی طرف پلٹے ۔

ہر مسلمان کو اپنے نفس پر اعتماد کرنا چاہئے اورجوآزادی خدانے اسے دی ہے اس سے استفادہ کرے ،اورجو وسائل اسے فراہم کئے ہیں ان سے بھرپورا فائدہ اٹھائے اور زندگی کی راہ کوطے کرے ،نہ یہ کہ دوسروں پرامید باندھ کرہر روز خدا کے لئے ایک شریک ٹھہرائے اور ایک تازہ بت بنائے ۔نوکر کو جاننا چاہئے کہ وہ اپنی روٹی کھاتا ہے نہ مالک کی ۔مزدورکو جاننا چاہئے کہ وہ اپنی کمائی کی اجرت حاصل کرتا ہے نہ صاحب کار کی مفت میں دی گئی بخشش ،ہرملازم کو ایمان رکھنا چاہئے کہ وہ اپنے کام کی مزدوری حاصل کرتا ہے نہ رئیس یا حکومت مربوطہ ادارہ یامعاشرے کا تحفہ ۔

آخر کار آزاد انسان کو خدا کے علاوہ کسی سے امید نہیں باندھنی چاہئے اور کسی کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرنا چاہئے ورنہ اس کے باطن میں وہی پستی اور شرک کی غلامی پیدا ہوجائے گی جس کے آشکارا طور پر بت پرست شکار ہیں ۔پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے،بیکاری کی عادت کرنے والوں اوراپنا بوجھ دوسروں پر ڈالنے والوں پر لعنت بھیجی ہے ۔دور حاضر میں اجتماعی اور نفسیاتی تحقیقات سے واضح طورپر معلوم ہوتاہے کہ اجتماعی برائیوں کاایک بڑا حصہ بیکاری کی وجہ سے ہے ۔یہی بیکاری ہے جومعاشرے کے اقتصاد اورثقافت کے پہیے کو چلنے سے روکتی ہے اور ہر قسم کے اخلاقی زوال اور خرافات پرستی کو رواج بخشتی ہے ۔

---

[۱] تحف العقول ،ص۴۰۹۔

کھیتی باڑی اور اس کے فائدے

کھیتی باڑی جس کے ذریعہ معاشرے کے لئے اناج مہیا کئے جاتے ہیں اپنی اہمیت کے پیش نظر انسان کے پسندیدہ ترین مشغلوں میں شمار ہوتی ہے ،اسی لئے اسلام میں اس شغل کو اختیار کرنے کی بہت تاکید کی گئی ہے ۔چھٹے امام،حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں '': قیامت کے دن کا شت کاروں کا مقام ہر مقام سے بلند تر ہوگا [1]۔ ''پانچویں امام حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں '': کوئی بھی کام کھیتی باڑ ی سے بہتر اور اس کا فائدہ اس سے زیادہ عمومی نہں ہے .کیونکہ نیک وبد،چرند وپرند سب اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور زبان حال سے کسان کے لئے دعا کرتے ہیں [2]۔

دوسروں کے سہارے زندگی گزارنے کے نقصانات

''طفیلی زندگی''یعنی دوسروں کی امید اور پشت پناہی میں زندگی گزارنا ۔ حقیقت میں ایسی زندگی،انسانی فخر،شرافت اورآزادی کو کھودینے اور تمام اجتماعی برائیوں اور جرم وگناہ کا باعث ہے کہ جس کا سر چشمہ ذلت وخواری ہے ۔

جودوسرو ں کے سہارے ہوتا ہے اس کی نگاہ لوگوں کی دست کرم پر ہوتی ہے، وہ حقیقت میں اپنے ارادہ و ضمیر کو اس راہ میں بیچ دیتا ہے ،اسے کرم فرما کی چاپلوسی کرنی پڑتی ہے وہ اس سے جو کچھ چاہتا ہے خواہ ''حق ہو یا باطل اچھا ہویابرا ''وہ اسے انجام دینے پر مجبور ہوتا ہے ۔

اور ہر ننگ وعار کو قبول کرنے ،اجنبی پرستی ،ہر ظلم وبے انصافی پر راضی ہو جانے اورآخر کار،تمام انسانی قواعد وضوابط کو پامال کرنے پر بھی مجبور ہوتا ہے ۔اسلام میں ضرورت کے بغیر سوال کرنا حرام ہے ،فقراء کی مالی امداد،جو اسلامی ضوابط میں ہے ،صرف ان فقیروں سے مربوط ہے کہ جن کی آمدنی ان کے اخراجات کے لئے کافی نہ ہو یا کوئی کار وبار نہ ہو ۔

---

[1] میزان الحکمۃ،ج۴ص۲۱۳۔
[2] میزان الحکمۃج۴ص۲۱۳۔

ناپ تول میں کمی کی سزا

اسلام کی نظر میں ناپ تول میں کمی کرنا گناہ کبیرہ ہے ۔خدائے متعال اس گناہ کے مرتکب افراد کی سرزنش اور مذمت کرتے ہوئے فرماتا ہے: (ویل للمطففین* اَلاَ یظن اولئک أنھم مبعوثون* لیوم عظیم[۱]) ''ویل ہے ان کے لئے جو ناپ تول میں کمی کرنے والے ہیں...کیا انھیں یہ خیال نہیں ہے کہ یہ ایک روز دوبارہ اٹھا ئے جانے والے ہیں؟۔ ''ناپ تول میں کمی کرنے والا، لوگوں پر ظلم کرنے کے علاوہ، ان کے مال کو چوری کے راستہ سے لوٹتا ہے، لوگوں میں اپنے اعتماد کو کھودیتا ہے اور رفتہ رفتہ اپنے گاہکوں او راس کے بعد اپنے مال سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔

ظلم وستم کی برائی

خدائے متعال نے اپنے کلام پاک میں سیکڑوں بار ''ظلم'' کا ذکر کیا ہے اور اس بری صفت جو درندوں کی خصلت ہے کی مذمت کی ہے (قرآن مجید کے دو تہائی سوروں میں، جو مجموعاً ۱۱۴ سورے ہیں، ظلم کا ذکر کیا گیا ہے) ایسا کوئی انسان پایا نہیں جاسکتا کہ جس نے اپنی فطرت سے ظلم کی برائی کو درک نہ کیا ہو، یا کم ازکم یہ نہ جانتا ہوکہ ظلم و ستم نے انسانی معاشرے کے پیکر پر کتنی دردناک مصیبتیں ڈھائی ہیں اور کتنا خون بہایاہے اور کتنے گھروں کو ویران کیا ہے۔

تجربے سے یقینی طور پر ثابت ہوا ہے کہ ظلم و ستم کے محل کتنے ہی مضبوط کیوں نہ ہوں پائدار نہیں ہوتے اور کسی نہ کسی وقت ظالموں کے سروں پر گر کرڈھیر ہوجاتے ہیں۔ خدائے متعال فرماتاہے:(...ان اللّٰہ لا یہدی القوم الظّٰلمی[۲]...'') خدائے متعال ہرگز ظالموں کی ہدایت نہیں کرتا ہے''.اولیائے دین فرماتے ہیں'': سلطنت اور ملک، کفر سے باقی رہ سکتا ہے، لیکن ظلم و ستم سے باقی نہیں رہ سکتا[۳]''

---

[۱] مطففین ۱۔۵
[۲] انعام/۱۴۴
[۳] امالی شیخ مفید، ص ۳۱۰(حواشی میں آیا ہے)۔

مردم آزاری اور شرارت حرام ہے

یہ دو صفتیں ایک دوسرے کے نزدیک ہیں، کیونکہ ''اذیت'' پہنچانا، دوسروں کو زبان سے رنج و تکلیف پہنچاناہے، جیسے گالی دینا اور ایسی بات کہنا جس سے مخاطب رنجیدہ ہوجائے یا ہاتھ سے کوئی ایسا کام انجام دینا جس سے لوگ ناراض ہوجائیں۔ ''شرارت'' ایسا کام انجام دینا جو لوگوں کے لئے ''شر'' کا باعث ہو۔بہر حال یہ دو صفتیں انسان کی ان آرزؤں کے مقابلہ میں قرار پائی ہیں، کہ انسان جن تک پہنچنے کے لئے اجتماع کو وجود میں لایا ہے، کہ وہ زندگی کی آرام و آسائش ہے۔

یہاں پر اسلام کا شرع مقدس، معاشرے کی مصلحت کو پہلے درجہ میں قرار دیتا ہے اور مردم آزاری و شرارت کو حرام قرار دیتا ہے، چنانچہ خدائے متعال فرماتاہے:(وَالّذین یُوذون المؤمنین و المومنات بغیر ما اکتسبوا فقد احتملوا بهتٰنا و اثمٰاً مبیناً ''[1]) اور جو لوگ صاحبان ایمان مرد یا عورت کو بغیر کچھ کئے دھرے اذیت دیتے ہیں، انہوں نے بڑے بہتا ن اورکھلے گناہ کا بوجھ اپنے سرپر اٹھا رکھا ہے۔'' پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں '':جس شخص نے کسی مسلمان کو اذیت پہنچائی، اس نے مجھے اذیت پہنچائی اور میری اذیت خدا کی اذیت ہے، ایسے شخص پر توریت، انجیل اور قرآن مجید میں لعنت کی گئی ہے[2]۔''

چوری:چوری ایک برا اور نامناسب مشغلہ ہے جو معاشرے کی اقتصادی حیثیت کو خطرہ میں ڈالتا ہے۔ بدیہی ہے کہ انسان کی زندگی کے ابتدائی ضروریات میں سے مال و ثروت ہے جسے انسان اپنی عمر کی قیمت پر حاصل کرتا ہے او راس کی حفاظت کے لئے اس کے گرد ایک حفاظتی دیوار بنادیتا ہے تا کہ ہر قسم کے تجاوز سے محفوظ رہے اور اس طرح اس کا مال معاشرے کی زندگی کی ضمانت او ر اس کا پشت و پناہ بن جائے۔ البتہ اس دیوار کو توڑنا اور اس نظم کو ختم کرنا ایک ایسی عمر کے سرمایہ کو تباہ کرنے کے مترادف ہے کہ جس کو حاصل کرنے میں اس کی پوری عمر خرچ ہوئی ہے اور لوگوں کی سرگرمیوں کے ایک بڑے حصہ کو معطل کرنا لوگوں کے ہاتھ کاٹنے کے برابر ہے۔اسی لئے اسلام نے اس نفرت انگیز عمل کے لئے کہ خود چور کا ضمیر بھی اس کے جرم ہونے

---

[1] احزاب،۵۸)
[2] الغدیر،ج ۱۰، ص ۳۶۸۔

کی گواہی دیتا ہے، یہ سزا مقرر کی ہے کہ اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔ (یعنی دائیں ہاتھ کی چار انگلیاں کاٹ دی جائیں) خدائے متعال فرماتا ہے:

(والسارق والسارقۃ فاقطعوا ایدیھما جزاء بما کسبا[1]...) ''چور مرد اور چور عورت دونوں کے ہاتھ کاٹ دو کہ یہ ان کے لئے بدلہ اور خدا کی طرف سے ایک سزا ہے''...

فرض شناسی:زندگی کے یہ بے شمار وسائل جو آج کل ہم انسانوں کے اختیار میں ہیں اورہم ان کو حاصل کرنے اور ان سے استفادہ کرنے کے لئے دن رات کوشش کرتے ہیں، ابتداء میں انسان کے اختیار میں نہیں تھے،بلکہ انسان کی سرگرمیوں کے نتیجہ میں تدریجاً وجود میں آئے ہیں اور ان سے استفادہ کیا جارہاہے۔ لیکن بہر صورت ابتدائی بشر سے لیکر آج کے متمدن انسان تک ہرگز کار و کوشش کا سلسلہ نہیں رکاہے،بلکہ انسان نے اپنی خدا داد فطرت کے ذریعہ اپنی زندگی کے وسائل فراہم کرنے کی کوشش کی ہے، کیونکہ جس انسان کی وجودی توانائی کی سرگرمی ٹھپ ہو جاتی ہے تواس کو مسلح کرنے کے داخلی و خارجی وسائل، آنکھ، کان، منہ، ہاتھ، پاؤں، دماغ،دل، پھیپھڑے اور جگر وغیرہ بے کار ہوجائیں گے،اور وہ مردہ کے علاوہ کچھ نہیں ہوگا۔

اسی لئے انسان نہ صرف مجبورہوکر کام کرتا ہے ،بلکہ اس جہت سے بھی کہ وہ انسان ہے لہذا گوناگوں سرگرمیاں انجام دیتا ہے ،کیونکہ وہ اپنے انسانی شعور سے درک کرتا ہے کہ جس راہ سے بھی ممکن ہو ،وہ اپنی زندگی کی سعادت اورخوشبختی کو حاصل کرے ،اس لئے کاروکوشش میں لگ جاتا ہے اوراپنے مطالبات کی راہ میں قدم رکھتا ہے ،لہذا انسان جس ماحول اور جس روش پر زندگی گزارتا ہے خواہ :دینی ہویا غیر دینی ،قانونی ہویا استبدادی اور شہری ہویاخانہ بدوشی کی، اس میں اپنے لئے کچھ تکالیف وفرائض (وہ کام جن کا زندگی میں انجام دینا لازم جانتا ہے) کااحساس کرتا ہے کہ ان کوانجام دینے میں انسان کی حقیقی آرزوؤں کو پورا کرسکتا ہے اوراس کے لئے خوشحالی کی اور آسودہ و سعادتمندانہ زندگی فراہم کرسکتا ہے ۔البتہ ان تکا لیف اور فرائض ،جوسعادتمندی کی تنہا راہ ہے ،کی

---

[1] مائدہ ۳۸

قدر و قیمت خود انسانیت کی قدر و قیمت ہے کہ ہم اس سے زیادہ گراں بہا کسی چیز کا تصور نہیں کر سکتے اور اسے کسی دوسری چیز سے بدل نہیں سکتے ۔اس بنا پر ''فرض شناسی''اور اسکا انجام دینا عمل کے میدان میں اہم ترین مسئلہ ہے کہ اس کا سروکار انسان کی زندگی سے ہے،کیونکہ اس کی اہمیت خود انسان کی اہمیت ہے،جو شخص اپنے مسلمہ فرائض کو انجام دینے میں پہلو تہی کرتا ہے یا کبھی کوتاہی کرتا ہے،تو وہ اسی کے مطابق انسانیت کی بلندی سے گر جاتا ہے اور فطری طور پر اپنی پستی اور بے قیمتی کا اعتراف کرتا ہے یا جو بھی خلاف ورزی کرتا ہے،وہ اپنے معاشرے کے پیکر پر بلکہ حقیقت میں اپنے پیکر پر ایک کاری ضرب لگاتا ہے ۔

خدائے متعال فرماتا ہے: (والعصر *ان الانسٰن لفی خسر *الا الّذین آمنوا و عملوا الصّٰلحت وتواصوا بالحق وتواصوا بالصّبر[1]) '' قسم ہے عصر کی بیشک انسان خسارہ میں ہے ۔علاوہ ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال انجام دئے اور ایک دوسرے کو حق اور صبر کی وصیت و نصیحت کی ۔''نیز فرماتا ہے: (ظہر الفساد فی البرّ والبحر بما کسبت ایدی النّاس[2]...) ''لوگوں کے ہاتھوں کی کمائی کی بنا پر فساد خشکی اور تری ہر جگہ غالب آگیا ہے ۔''

فریضہ کی تعیین میں مختلف روشوں کا اختلاف

عالم انسانیت میں فریضہ کو پہچاننے اور اس پر عمل کرنے کی اہمیت بذات خود ایک پائدار و مسلم فریضہ ہے اور ہرگز کوئی ایسا انسان نہیں پایا جاسکتا جو اپنی انسانی فطرت سے اس حقیقت کا منکر ہو ۔جی ہاں،چونکہ انسانی فرائض انسان کی زندگی کی سعادت سے مکمل رابطہ رکھتے ہیں اور دین انسانی زندگی کے بارے میں غیر دینی طریقوں سے نظریاتی اختلاف رکھتا ہے لہذا دینی فرائض،دوسرے فرائض کی روشوں سے اختلاف رکھیں گے ۔دین کا عقیدہ ہے کہ انسان کی زندگی ایک لامحدود اور ابدی ہے،جو موت سے ختم نہیں ہوتی اور موت کے بعد اس ابدی زندگی کا سرمایہ وہی صحیح عقائد پسندیدہ اخلاق اور اعمال صالحہ ہیں جنھیں انسان نے دنیا میں حاصل کیا ہے۔ اس لحاظ سے دین نے جو فرائض اور تکالیف فرد اور معاشرہ کے لئے مرتب کئے ہیں،ان میں اس ابدی دنیا کی زندگی کو بھی مد نظر

---

[1] عصر،١،٣

[2] روم،٤١

رکھا ہے ۔ دین اپنے قوانین کو خدا شناسی اور خدا کی عبادت وبندگی کی روشنی میں مقرر کرتا ہے جس کا واضح اثر موت کے بعد قیامت کے دن ظاہر ہو گا ۔ غیر دینی طریقے (جو بھی ہوں) صرف اس دنیا کی چند روزہ زندگی کو مدنظر رکھتے ہیں اور انسان کے لئے کچھ فرائض وضع کرتے ہیں تا کہ ان کے ذریعہ مادی زندگی اور جسمانی قوای جو تمام حیوانوں میں مشترک ہیں سے بہتر استفادہ کریں ۔ حقیقت میں یہ طریقے ایک حیوانی زندگی کو انسان کے لئے مرتب کرتے ہیں کہ جس کی منطق کا سرچشمہ چرندوں اور درندوں کے جذبات ہوتے ہیں اور انسان کی حقیقت پسندی اور اس کی معنویات سے بھری ابدی زندگی کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتے ۔

یہی وجہ ہے کہ انسانیت کے بلند اخلاق (جیسا کہ قطعی تجربہ بات سے ثابت ہے) غیر دینی معاشروں سے رفتہ رفتہ ختم ہورہے ہیں اور روز بروز ان کا اخلاقی انحطاط و اضح وآشکار تر ہوتا جارہا ہے ۔ بعض لوگ کہتے ہیں: دین کی بنیاد، تقلید پر ہے، یعنی چون وچرا کے بغیر فرائض اور قوانین کے ایک سلسلہ کو قبول کرنا ، لیکن اجتماعی طریقے وقت کی منطق کے ساتھ قابل مطابقت ہیں ۔ جنہوں نے یہ بات کہی ہے، انہوں نے اس نکتہ سے غفلت کی ہے کہ جو قوانین و ضوابط معاشرے میں نافذ ہوتے ہیں، ان کو بلا چون و چرا نافذ ہونا چاہئے ۔ ہرگز یہ نہ دیکھا گیا ہے اور نہ ہی سنا گیا ہے کہ کسی ملک میں لوگ ملک میں لاگو قوانین پر مناظرہ اور بحث و گفتگو کے بعد ان پر عمل کرتے ہوں اور جو بھی ان قوانین کے فلسفہ کو نہ سمجھ سکا وہ اس پر عمل کرنے سے معاف ہو اور ان کو قبول کرنے میں مختار ہو، اس سلسلہ میں دینی اور غیر دینی روش میں کوئی فرق نہیں ہے ۔

لیکن کسی ملک کے فطری او راجتماعی حالات کا مطالعہ اور اس کی عام روش میں جستجو کرکے اس ملک کے قوانین کے کلیات کی حکمت کے کچھ جزئیات معلوم کئے جا سکتے ہیں ۔ دینی قوانین میں بھی یہی خاصیت پائی جاتی ہے ۔ حقیقت پسندانہ راہ سے اور خلقت اور انسان کی فطری ضرورتوں کے بارے میں جستجو کرکے دین کے قوانین کے کلیات جو فطری روش ہے کے بارے میں بعض جزئیات کو معلوم کیا جاسکتا ہے ۔ قرآن مجید او ربہت سی روایتیں انسان کو سوچنے ، غور و فکر او رتدبر کی دعوت دیتی ہیں اور بعض

احکام میں اجمالی مصلحت کے بارے میں حکم یا اشارہ کیا جاتاہے، چنانچہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم اوراہل بیت اطہار علیہم السلام سے احکام کے فلسفہ کے بارے میں بہت سی روایتیں نقل ہوئی ہیں اور در دست ہیں ۔

دفاع کی اہمیت: جس طرح ایک انسان اپنی زندگی میں خوشبختی اور سعادت کا شیدائی ہوتا ہے اور ان کو حاصل کرنے میں سرگرم عمل ہوتا ہے، اسی طرح وہ ہرطرف سے بے شمار خطرات سے بھی دوچار ہوتاہے ۔ ان میں سے بعض خطرے اس کے اصل وجود کو اور بعض اس کی زندگی کی سعادت و خوشبختی کو نشانہ بناتے ہیں، اس لئے انسان ان کو دور کرنے کے لئے مقابلہ اور دفاع کرنے پر مجبور ہے ۔انسان کی خلقت میں بھی ان ہی دو مرحلوں ''جذب و دفع'' کی پیشنگوئی کی گئی ہے، اور اس کے وجود کی عمارت میں مناسب وسائل استعمال ہوئے ہیں ۔اسی طرح معاشرہ کے کچھ فوائد ہیں کہ جنھیں حاصل کرنا چاہئے اوربعض خطرات سے بھی دوچار ہے کہ بہر حال ان کے مقابلہ میں کھڑے ہوکر اپنی زندگی کے مقدسات کا دفاع کرنا چاہئے ۔

جس نے لوگوں کی جانوں کو ختم کرنے ،آزادی کے پرچم کو سرنگوں کرنے یا ان کی آزادی کو ختم کرنے کو اپنا مقصد قرار دیا ہے، وہ معاشرے کا دشمن ہے ۔ انسان کا فقر و ایما ن کی کمزوری اور نادانی معاشرے کے دشمن ہیں ، جو اپنے معاشرے ،یعنی زندگی کی سعادت اور انسانی حقیقت کا پابند ہے، اسے اپنے ان خطرناک دشمنوں کے مقابلہ میں دفاع کرنا چاہئے ۔

بخش دینا :اس میں کوئی شک و شبہہ نہیں ہے کہ انسان کے ضمیر میں ، اصل زندگی اور شرافت مندانہ زندگی کی ایک ہی بنیاد ہے اور جو زندگی شرافت کے ساتھ ہولیکن انسان کی سعادت اس میں نہ ہو، تو وہ حقیقت میں زندگی نہیں ہے، بلکہ یہ ایک ایسی موت ہے جو طبیعی موت سے تلخ و ناگوار ہے، جو انسان اپنی شرافت و سعادت کی اہمیت کا قائل ہے، اسے اس پست زندگی سے موت کی طرح فرار کرنا چاہئے ۔انسان جس ماحول میں بھی رہ رہا ہو اور جس روش کی طرف بھی مائل ہو، وہ اپنی خدا داد فطرت سے سمجھتا ہے کہ محترم و مقدس میں موت، بذات خود ایک سعادت ہے، دین کی منطق میں یہ مسئلہ دوسری ہر منطق سے زیادہ واضح اوروہم و گمان کے خرافات

سے نہایت دور ہے، جو شخص دین کے حکم سے اپنے دینی معاشرے کا دفاع کرتے ہوئے اپنی جان نچھاور کردے ،وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ کسی چیز سے محروم نہیں ہوا ہے بلکہ اس نے اپنی چند روزہ زندگی کو خدا کی راہ میں پیش کرکے ایک نہایت شیرین، گراں بہااور ابدی زندگی کو حاصل کیا ہے اور یقیناًاس کی سعادت ناقابل زوال ہے چنانچہ خدائے متعال اپنے کلام میں فرماتا ہے:

(ولاتحسبن الذّین قتلوا فی سبیل اللّٰہ امواتاً بل احیاء عند ربّھم یرزقون[1]) ''اور خبردار راہ خدا میں قتل ہونے والوں کو مردہ خیال نہ کرناوہ زندہ ہیں اوراپنے پروردگار کے یہاں رزق پارہے ہیں''

لیکن غیر دینی طریقے،جوانسان کی زندگی کو اسی دنیا کی چند روزہ زندگی تک محدود جانتے ہیں،ہرگز نہیں کہہ سکتیں کہ انسان مرنے کے بعد بھی زندہ ہوتا ہے یا سعادت وخوشبختی حاصل کرتا ہے ،مگر یہ کہ وہم وگمان اور خرافات سے سمجھ لیا جائے کہ جو وطن یا قومی مقدسات کی راہ میں قتل ہو جاتا ہے ،اس کا نام جاں نثاروں اورقوم کے فداکاروں کی فہرست میں قرار پاسکتا ہے اور تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھا جاسکتا ہے اور ہمیشہ کے لئے زندہ وجاوید رہ سکتا ہے ۔لیکن جو تمجید اور تعظیم اسلام میں خدا کی راہ میں شہید ہونے اور قتل کئے جانے کے سلسلے میں کی گئی ہے ،وہ کسی اور صالح عمل کے لئے نہیں کی گئی ہے ۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں '': ہر نیکی سے بالاتر ایک نیکی ہے یہاں تک کہ راہ خدامیں شہید ہو جائے ،اس کے بعد کوئی نیکی نہیں ہے[2]۔'

صدراسلام کے مسلمان پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے استغفار کی درخواست کرتے تھے اورآنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعا کے نتیجہ میں شہادت کے اعلی درجہ پر فائز ہوتے تھے اور شہادت کے ذریعہ دنیاسے چلے جانیوالوں کے لئے گریہ نہیں کرتے تھے ،کیونکہ وہ زندہ ہیں اور نہیں مرے ہیں ۔

---

[1] آل عمران ,۱۶۹

[2] میزان الحکمۃ ج۱،ص۴۰۰۔

مال کی زکواۃ :مال سے انسان کی زندگی میں جو اعتدال پیدا ہوتا ہے ،وہ محتاج بیان نہیں ہے ۔اسکی اہمیت کا عالم یہ ہے کہ بہت سے لوگ زندگی مال کو ہی جانتے ہیں اور انسان کے لئے مال ودولت کے علاوہ کسی فضیلت و شرافت کے قائل نہیں ہیں ۔اوراپنی تمام سرگرمیوں کو پیسے جمع کرنے اورمال ذخیرہ کرنے میں صرف کرتے ہیں اور نتیجہ میں مال سے یہی دلبستگی اور حرص ان کو بخل کی صفت میں مبتلا کر دیتی ہے کہ جس کی بنا پر وہ دوسروں کو ان کے حق سے محروم کرتے ہیں اور کبھی اس سے بلند تر قدم اٹھا کر پستی اور بخل کے سامنے تسلیم ہو کر خود بھی اس مال سے بہرہ مند ہونے سے محروم ہوجاتے ہیں ،اس طرح نہ خودکھاتے ہیں اورنہ دوسروں کو کھلاتے ہیں اور صرف پیسے جمع کرنے میں لذت محسوس کرتے ہیں ۔

جوافراد بخل کی ناپسندیدہ صفت میں مبتلا ہیں (البتہ کنجوسی میں مبتلا ہونے والے ان لوگوں سے پست ہیں)وہ انسانی فطرت سے گرجاتے ہیں اورزندگی کے بازار میں دیوالیہ ہوتے ہیں ،کیونکہ: ا۔زندگی میں،صرف اپنی سعادت ،خوشبختی اور آسودگی کو چاہتے ہیں اورانفرادی زندگی کے قائل ہوتے ہیں ،جبکہ انسان کی فطرت نے اجتماعی زندگی کو ہمارے لئے زندگی کے عنوان سے پہنچوایا ہے اورانفرادی زندگی جس راہ سے بھی ہو،اس کا انجام ناکامی ہے ۔

۲۔اپنی قدرت کا دوسروں کے سامنے مظاہرہ کرکے محتاجوں اورناداروں کی خاطر و تواضع کو اپنی طرف جذب کرتے ہیں اور باوجودیکہ محتاجوں کی کوئی مدد نہیں کرتے لیکن پھر بھی ان سے ہمیشہ اپنی تعظیم کرانا چاہتے ہیں،ان کے ساتھ غلاموں کا سلوک کرتے ہیں اوربت پرستی کا جذبہ زندہ رکھتے ہیں جس کے نتیجہ میں معاشرے سے ہر قسم کی شہامت ،شجاعت ،فطرت کی بلندی اورانسانی فخرومباہات ختم ہوجاتے ہیں ۔

۳۔اس کے علاوہ کہ وہ خود پاک جذبات،محبت،مودت،انسان دوستی،خیر خواہی اور انسانی ہمدردی کو پامال کرتے ہیں ،معاشرے میں جرم وخیانت اور ہر قسم کی پستی ورذالت کو ترویج دیتے ہیں،کیونکہ جرم وجفا،جیسے:بدگوئی ،بے حیائی ،چوری ،ڈاکہ زنی اورآدم کشی کا قوی

ترین طبیعی عامل محتاجوں کے طبقہ میں موجودفقر وفاقہ غیظ و غضب اور کینہ وہ انتقامی جذبہ ہے جومالداروں کے بارے میں ناداروں اوربیچاروں کے دلوں میں پیدا ہوتا ہے ،کہ اس کے بخیل اور کنجوس مال دار اس کے باعث ہوتے ہیں ۔یہی وجہ ہے کہ معاشرے میں بخیل شخص در حقیقت معاشرہ کا سب سے بڑا دشمن ہوتا ہے، بہر حال وہ خدا کے غضب وسخت سزااور لوگوں کی نفرت میں گرفتار ہوگا ۔قرآن مجید میں بخل اور کنجوسی کی ناپسند صفتوں کی مذمت اور سرزنش میں اور اس کے برعکس جود وسخاوت،اور خدا کی راہ میں انفاق اور ناداروں وبے چاروں کی دستگیری کرنے والوں کی مدح وثناء میں بہت سی آیتیں نازل ہوئی ہیں ۔خدائے متعال اپنے کلام پاک میں وعدہ کیاہے کہ ،جومال انفاق کیا جاتا ہے ،اس کے عوض دس اور بعض مواقع میں ستر بلکہ سات سوسے بیش تر تک اضافہ کرکے انفاق کرنے والے کو واپس بھیجا جاتا ہے۔

تجربہ سے بھی ثابت ہو اہے کہ سخی لوگ جب جوانمردی کے ساتھ حاجتمندوں کی مدد کرتے ہیں اور انسانی معاشرے کی مشکلات کو دورکرتے ہیں توروز بہ روز ان کی دولت او رنعمتوں میں اضافہ ہوتاہے۔کار گرہ گشا نشود در زمانہ بند ہزگر کسی ندید در انگشت شانہ بند اگر لوگ کسی دن مشکلات سے دوچار ہوجائیں تو تمام دل ان کے ساتھ ہوں گے،انہوں نے جو دوسروں کے حق میں مدد کی ہے وہ اجتماعی صورت میں ان کے حق میں لوٹے گی ۔ اور اس کے علاوہ انہوں نے اپنے اچھے کردار سے ایک شریف انسان کے مانند اپنے ضمیر کو آرام بخشاہے، واجب اور مستحب حقوق کے بارے میں ندائے آسمانی کو لبیک کہا ہے اور انسانیت کے پاک جذبات سے مہربانی، شفقت،انسان دوستی اور خیر خواہی سے استفادہ کیا ہے،اس طرح عام محبوبیت اور خالص احترام کے مستحق ہوئے اور آخر کار خدا کی خوشنودی او رابدی سعادت کوکم ترین قیمت پر خرید لیا ۔

علم کی زکواۃ ‘‘: علم او رثقافت’’ بے نظیر دولت ہے، جن سے انسان اپنی زندگی میں ہرگز بے نیاز نہیں ہوتاہے اور ایسا انسان نہیں پایا جاسکتا ،جو اپنی انسانی فطرت سے جہل پر علم کی برتری کو درک نہ کرتا ہو یا علماء اور دانشوروں کے احترام میں ان کے حق میں فیصلہ نہ دیتا ہو۔خدائے متعال اپنے کلام پاک میں عالم و جاہل میں فرق کے بارے میں زندہ و مردہ اور بینا و او رنابینا کی مثال دیتاہے۔

اوراسلام میں علم و دانش کو جو اہمیت دی گئی ہے، وہ اہمیت کسی اور دین میں نہیں پائی جاتی، یہاں تک کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں "؛ علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر واجب ہے[۱]"نیز فرماتے ہیں "؛گھوارہ سے قبر تک علم حاصل کرو چاہے دنیا کے اس پار بھی ہو[۲]۔ "اسی کے پیش نظر اسلام نے بخل اور کنجوسی کی نہی کی ہے۔ علم کو چھپانے کی مذمت کی ہے، بلکہ دینی علوم کو چھپانا حرام قرار دیا ہے اور عالم کو جاہل کی تربیت کرنے کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔

معاشرے کے اندرونی دشمنوں سے مقابلہ

چنانچہ، فطرت کے حکم سے، معاشرے کے بیرونی دشمنوں سے جنگ کرنی چاہئے اور معاشرہ کو نقصان سے بچانا چائے اور، اسی طرح معاشرے کے اندرونی دشمنوں سے بھی جنگ او رمقابلہ کرنا چاہئے۔ معاشرے کا اندرونی دشمن وہ ہے جو عام روش او رجاری قوانین کی مخالفت کرتا ہے اور اس طرح معاشرے کی زندگی کے ناطے کو توڑدیتا ہے اور جاری نظام کو درہم و برہم کردیتا ہے، اس لئے نظم و نسق، امور کی حفاظت اور معاشرے میں امن و امان برقرار رکھنے کے لئے کچھ افراد پر مشتمل پلیس وغیرہ کا نظام تشکیل دیا جاتا ہے اور خلاف ورزی کرنے والوں کے لئے مختلف سزائیں مقرر کی جاتی ہیں۔

اسلام نے بھی قوائے نافذہ کے علاوہ، معاشرے کے افراد کے لئے مختلف سزائیں اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو واجب قرار دیا ہے اور اس طرح مقابلہ کو مزید عوامی اور موثر تر بنادیا ہے۔اسلام اور معاشرے کی دوسری روشوں کے درمیان بنیادی فرق یہ ہے کہ دوسری روشیں صرف لوگوں کے افعال و اعمال کی اصلاح کی طرف توجہ کرتی ہیں، لیکن اسلام لوگوں کے افعال کے علاوہ ان کے اخلاق کی طرف بھی توجہ کرکے دونوں مرحلوں میں فساد کے ساتھ مقابلہ کرتا ہے۔جن اعمال کو اسلام نے گناہ اور معصیت کے طور پر حرام قرار دیا ہے، وہ ایسے اعمال ہیں جن سے معاشرے میں بُرے اثرات اور منحوس نتائج بر آمد ہوتے ہیں،اس توصیف کے پیش نظر ان میں سے بعض اعمال براہ راست مرتکب ہونے والے ایک فرد یا تمام افراد کو برباد کردیتے ہیں کہ

---

[۱] اصول کافی،ج ۱، ص ۳۰، ح ۱۔
[۲] نہج الفصاحہ ، ص ۶۴، ج ۳۲۴، ۳۲۷۔

جس کی وجہ سے انسان کے کسی عضو میں زخم کے مانند معاشرے میں رخنہ ڈالتا ہے۔ اکثر گناہ جو انسان کی بندگی کی حالت میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں او رالہی حقوق کو ضرر پہنچاتے ہیں، ان کی بھی یہی حالت ہے، جیسے نماز نہ پڑھنا اور روزہ نہ رکھنا وغیرہ۔

ان میں سے بعض اعمال اجتماعی زندگی کے لئے بالواسطہ خطرہ بنتے ہیں، معاشرے کے پیکر کو تباہ وبرباد کرکے رکھدیتے ہیں۔ ان کی مثال ان بیماریوں کی سی ہے جو براہ راست انسان کی زندگی سے سروکار رکھتی ہیں اور زندگی کے رشتہ کو توڑ دیتی ہیں جیسے جھوٹ بولنا اور تہمت لگانا اسلام کی نظر میں ماں باپ کے حقوق، غیبت اور لوگوں پر تجاوز کا بھی یہی حکم ہے۔

اسلام میں گناہان کبیرہ کی عام سزا

مذکورہ بُرے اعمال، اسلام میں گناہان کبیرہ کہے جاتے ہیں اور خدائے متعال نے اپنے کلام پاک میں واضح طور پر ان گناہوں کے مرتکب لوگوں کے لئے عذاب کا وعدہ دیا ہے۔اس کے علاوہ ان میں سے بعض کے بارے میں سخت سزائیں مقرر کی ہیں۔ کلی طور پر ان گناہوں کے مرتکب لوگ (اگر ایک ہی بار بھی انجام دیں) عدل و انصاف کا خاتمہ کرتے ہیں، یعنی معاشرے کے ایک صالح عضو سے اس کی شرافت کو سلب کرتے ہیں۔ جو شخص گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوتا ہے وہ اپنی عدالت کو کھودیتا ہے اور وہ ان اختیارات سے بہرہ مند نہیں ہو سکتا، جن سے معاشرے کا ایک صالح عضو بہرہ مند ہوتا ہے۔ وہ اسلامی حکومت میں کوئی ذمہ داری نہیں سنبھال سکتا، خلافت کے عہدہ پر فائز نہیں ہوسکتا، امام جماعت نہیں بن سکتا، اور کسی کے حق میں یا مخالفت میں اس کی گواہی قابل قبول نہیں ہے اور وہ اسی حالت میں رہے گا جب تک کہ توبہ نہ کرلے او ر مسلسل تقوی و پرہیز گاری سے دوبارہ ''عدالت'' کی صفت کا مالک بن جائے۔

احکام کے بارے میں چند سبق

اجتہاد اور تقلید

انسان کی زندگی میں پائی جانے والی حاجتیں اوران کو پورا کرنے کے لئے ان کی سرگرمیاں،اتنی زیادہ ہیں کہ ایک معمولی انسان ان کو گننے اور شمار کرنے کی طاقت نہیں رکھتا،ان سب کے بارے میں اور مہارت حاصل کرکے کافی مقدار میں معلومات حاصل کرنے کی بات ہی نہیں!دوسرے یہ کہ انسان اپنے کام کو فکروارادہ سے انجام دیتا ہے اور جہاں پر اسے کوئی فیصلہ کرنا ہو،تو اس کے بارے میں اس کے پاس کافی معلومات ہونا چاہئے ورنہ وہ کوئی فیصلہ نہیں کرسکتااس کو اپنے انجام دینے والے کاموں میں خود ماہر ہونا چاہئے یاکسی ماہر سے پوچھے اوراس کے حکم کے مطابق اس کام کو انجام دے ۔چنانچہ فطری طورپر ہم مریضوں کاعلاج کرنے کے لئے طبیب سے،مکان کانقشہ بنانے کے سلسلہ میں انجینئرسے،معماری میں معمارسے رجوع کرتے ہیں اور دروازے اورکھڑکیاں بنانے میں نجارپر اعتماد کرتے ہیں ۔پس ہم ہمیشہ بہت کم کاموں کے علاوہ اپنے دوسرے تمام مسائل میں تقلید کرتے ہیں۔

جویہ کہتا ہے کہ :''میں اپنی زندگی میں تقلید کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالتا ہوں''وہ شخص یااپنی بات کے معنی کونہیں سمجھا ہے یاایک فکری آفت میں مبتلا ہوا ہے ۔چونکہ اسلام نے اپنی شریعت کی بنیاد انسانی فطرت پر ڈالی ہے ، لہذااسی روش کاانتخاب کیاہے۔اسلام نے اپنے پیروؤں کو حکم دیا ہے کہ دینی معارف اوراحکام کو سیکھیں ان معارف کا سرچشمہ کتاب خدااور پیغمبراکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وآئمہ ھدی علیہم السلام کی سنت کے علاوہ کوئی اورچیز نہیں ہے ۔بدیہی ہے کہ تمام دینی معارف کو کتاب وسنت سے حاصل کرنا،ہرایک کے بس کی بات نہیں ہے اوریہ کام مسلمانوں کے ایک خاص گروہ کے علاوہ تمام مسلمانوں کے لئے ممکن نہیں ہے ۔اس لئے خود بخود دین کا حکم اس صورت میں نکلتا ہے کہ مسلمانوں میں سے وہ لوگ جودینی معارف واحکام کواستدلال کی راہ سے حاصل نہیں کر سکتے،انھیں ان لوگوں کی طرف رجوع کرنا چاہئے جودینی احکام کودلیل سے حاصل کر چکے ہوں اوراسطرح

اپنے فریضہ پر عمل کریں ۔جو عالم دینی احکام کواستدلال کی راہ سے حاصل کرتا ہے،اس کو ''مجتہد'' اور اس کے کام کو ''اجتہاد''کہا جاتا ہے اور جو مجتہد کی طرف رجوع کرتا ہے اس کو ''مقلد'' اور اس کے اس کام کو ''تقلید''کہتے ہیں ۔البتہ اس نکتہ کو جاننا چاہئے کہ تقلید،عبادت،معاملات اور دین کے دوسرے عملی احکام میں جائز ہے ،لیکن اصول دین میں ،جواعتقادی مسئلہ ہے،کسی صورت میں کسی کی تقلید نہیں کی جاسکتی ہے۔کیونکہ اصول دین میں ایمان وعقیدہ ضروری ہے نہ عمل،اس لئے دوسروں کے ایمان کواپنا ایمان فرض نہیں کیا جاسکتاہے ،یعنی یہ نہیں کہا جاسکتاہے کہ خدا ایک ہے اس دلیل پر کہ ہمارے والدین یا عالم ایسا کہتے ہیں ۔یا مرنے کے بعد زندگی حق ہے،کیونکہ تمام مسلمان اس کا عقیدہ رکھتے ہیں ۔اس لئے ہر مسلمان پرواجب ہے کہ اپنے اصول دین کودلیل کی راہ سے جانے اگرچہ سادہ طریقہ سے ہی ہو۔

نجاسات

نجاسات(نجس چیزیں)چند چیزیں ہیں: ۱و۲:پیشاب اورپاخانہ[1]۔ اس حرام گوشت حیوان کاپیشاب اورپاخانہ نجس ہے جوخون جہندہ رکھتا ہویعنی وہ حیوان جس کی رگ کاٹنے پر خون اچھل کر نکلے ،جیسے:بلی ،لومڑی ،خرگوش وغیرہ ،بلکہ اگر مرغی یا کوئی دوسرا حیوان ،جونجاست کھانے کی وجہ سے حرام گوشت بن چکا ہو،تواس کا بھی پیشاب وپاخانہ نجس ہے ۔

۳۔خون جہندہ رکھنے والے حیوانوں کا مردار،خواہ حلال گوشت ہوں یا حرام گوشت،لیکن حرام گوشت حیوان کے بعض اجزاء جیسے اون،بال اورناخن جو جان نہیں رکھتے ہیں پاک ہیں ۔

۴۔خون جہندہ رکھنے والے حیوانوں کا خون،خواہ حلال گوشت ہوں یا حرام گوشت۔

۵و۶۔خشکی میں رہنے والے کتے اور سور،ان کے تمام اجزاء یہاں تک کہ ان کے بال بھی نجس ہیں ۔

---

[1] پیشاب نکلنے کی جگہ صرف پانی سے پاک ہوتی ہے اورپاخانہ نکلنے کی جگہ کوپانی سے دھویا جاسکتا ہے یاپتھریا اسکے مانندتین ٹکڑوں سے پاک کیا جاسکتا ہے .البتہ یہ اس صورت میں ہے کہ پاخانہ اپنی جگہ سے باہر نہ پھیلا ہو ورنہ پانی کے بغیرپاک نہیں ہوگا۔ضمناًیاد دہانی کی جاتی ہے کہ اگرپاخانہ تین پتھر سے صاف نہ ہواتو اس سے زیادہ پتّھر سے پاک کیا جائے ۔

۷۔ شراب اور مست کرنے والی ہر سیال چیز۔

۸۔ آب جو۔

مطہرات

(پاک کرنے والی چیزیں)ہروہ چیز جس سے نجاست پاک کی جاتی ہے،اسے (مطہر) کہتے ہیں اور مطہرات درج ذیل ہیں: ۱۔ پانی،یہ ہر نجس ہوئی چیز کو پاک کرتا ہے، لیکن یہ اس صورت میں ہے کہ پانی مطلق ہو۔ اسلئے مضاف پانی، جیسے ہندوانہ اور گلاب کے پانی سے نجاست پاک نہیں ہوتی اوران سے وضوو غسل بھی صحیح نہیں ہے[1]۔

۲۔ زمین،یہ جوتے کی تہ اور پاؤں کے تلوے کو پاک کرتی ہے۔

۳۔ آفتاب،یہ نجس زمین اور چٹائی وغیرہ کو اپنی گرمی سے خشک کرکے پاک کرتا ہے۔

۴۔ استحالہ،یعنی نجس چیز اپنی جنس بدل کرایک پاک چیزکی صورت میں ظاہر ہوجائے۔ جیسے کتا نمک کی کان میں گرکر نمک میں تبدیل ہو جائے۔

۵۔ انتقال،یعنی انسان کے بدن کا خون یا خون جہندہ رکھنے والے کسی حیوان کا خون ایک ایسے حیوان کے بدن میں منتقل ہوجائے جو خون جہندہ نہ رکھتا ہو۔ جیسے انسان کے بدن کا خون مچھر یا مکھی وغیرہ کے بدن میں منتقل ہوجائے۔

٦۔ عین نجاست کا زائل ہوجانا،یعنی حیوان کے ظاہراور انسان کے باطن،مثلاً اگر حیوان کی پشت یا انسان کی ناک کے اندر کا حصہ خون آلود ہوجائے،تو خون کے زائل ہونے کے بعد پاک ہوجاتا ہے اور اسے پانی سے دھونے کی ضرورت نہیں ہے۔

---

[1] پانی کی دوقسمیں ہیں :کرُاورقلیل۔کرُپانی: بیس مثقال کم ۱۲۸من تبریزی ہے ،جوتقریباً۳۸۴کلوگرام ہوتا ہے اوراگر کوئی نجاست اس سے مل جائے ،تونجس نہیں ہوتا ،قلیل پانی: وہ پانی جوکرُسے کم ہو،اگراس سے کوئی نجاست مل جائے تو وہ نجس ہوجاتا ہے اور اس کا پاک ہونا اس طرح ہے کہ جاری یابارش کے پانی سے متصل ہو جائے یااس پرایک کرُکااضافہ کیا جائے ۔

۷۔ تبعیّت، تبعیت سے مراد یہ ہے کہ ایک نجس چیز دوسری نجس چیز کے پاک ہونے سے پاک ہوجاتی ہے، جیسے کافر کے مسلمان ہونے سے اس کا فرزند باپ کی تبعیت میں پاک ہو جاتا ہے۔

۸۔ کم ہونا یعنی انگور کا پانی ابالنے سے نجس ہو جاتا ہے، لیکن اگر ابالنے کے ذریعہ دو تہائی پانی بھاپ میں تبدیل ہو کر کم ہو جائے تو باقی پانی پاک ہوجاتا ہے۔

غسل

غسل دو طریقہ سے انجام دیا جاسکتا ہے: (ترتیبی اور ارتماسی)

غسل ترتیبی سے مراد یہ ہے کہ سر و گردن اور دائیں و بائیں طرف کو ترتیب سے دھویا جائے۔ غسل ارتماسی یہ ہے کہ انسان یکبارگی پورے بدن کو پانی میں ڈبودے۔ غسل کی دو قسمیں ہیں: واجب اور مستحب۔ دین اسلام میں مستحب غسل بہت زیادہ ہیں اور واجب غسل سات ہیں: ۱۔ غسل جنابت

۲۔ غسل میت

۳۔ غسل مس میت یعنی اگر انسان مردہ کے بدن کو سرد ہونے کے بعد اور غسل میت دینے سے پہلے مس کرے یعنی اپنے بدن کا کوئی حصہ اس کے بدن سے ملائے، تو اسے غسل کرنا چاہئے۔

۴۔ نذر یا عہد کیا ہو یا قسم کھائی ہو کہ غسل کرے گا۔

۵۔ غسل حیض

۶۔ غسل نفاس

۷۔ غسل استحاضہ

پہلے چار غسل مردوں اور عورتوں میں مشترک ہیں اورآخری تین غسل صرف عورتوں سے مخصوص ہیں ۔ شخص مجنب پر جو چیزیں حرام ہیں ،وہ حسب ذیل ہیں:۱۔اپنے بدن کے کسی حصہ کوقرآن مجید کے الفاظ،خداکے نام اور پیغمبرؐوائمہ اطہار علیہم السلام کے ناموں سے مس کرنا ۔

۲۔ مسجد الحرام اور مسجدالنبی ؐمیں داخل ہونا ۔

۳۔ دوسری تمام مساجد میں رُکنااورکوئی چیزان میں رکھنا ۔

۴۔ قرآن مجید کے ان چار سوروں میں سے کسی ایک کی تلاوت کرنا کہ جن پر سجدہ واجب ہے۔یعنی سورہ نجم ،اقراء،الم تنزیل اور حم سجدہ ۔

جنابت،حیض،نفاس اوراستحاضہ کے تمام احکام کوتوضیح المسائل سے حاصل کرناچاہئے ۔نوٹ۔ غسل میں بھی وضو کی طرح نیت کرنالازم ہےاور غسل سے پہلے بدن پاک ہوناچاہئےاور بدن تک پانی پہنچنے میں کوئی رکاوٹ بھی نہیں ہونی چاہئے ۔

وضواوراس کےاحکام

انسان کے لئے وضوسے پہلے مسواک کرنااورکلّی کرنا مستحب ہے یعنی پاک پانی منہ میں ڈالے اور کلّی کرے ۔اس کے علاوہ استنشاق یعنی ناک میں پانی ڈالنا بھی مستحب ہے ۔

وضوکی کیفیت اوراس کے شرائط:وضومیں چہرے کوسر کے بال اگنے کی جگہ سے ٹھوڑی تک اور ہاتھوں کوکہنی سے انگلیوں کے سرے تک دھونا چاہئےاور سر کے اگلے حصہ پر اورپیروں کےاوپری حصہ پر مسح کرناچاہئے ۔

وضومیں مندرجہ ذیل چیزوں کا خیال رکھنا ضروری ہے: ا۔وضو کے اعضاء پاک ہوں۔

۲۔وضو کا پانی پاک، مطلق اور مباح ہو[1]۔

۳۔نیت:یعنی وضوکو رضا ئے الہی کے لئے انجام دینا چاہئے ،لہذا اگر ٹھنڈک حاصل کرنے یا کسی دوسرے مقصد سے وضو کرے،تو صحیح نہیں ہے ۔

۴۔ترتیب :یعنی پہلے چہرہ پھر دایاں ہاتھ اس کے بعد بایاں ہاتھ دھونا چاہئے،اس کے بعد سر پھر پاؤں کا مسح کرنا چاہئے۔

۵۔مولات:یعنی وضو کے افعال یکے بعد دیگرے انجام دے اوران کے درمیان اتنا فاصلہ نہ ہو کہ کسی عضوکو دھونے یا مسح کرنے کے وقت اس سے پہلا والا عضو خشک ہو جائے،لیکن اگر وضو کے افعال پے درپے انجام پانے کے باوجود ہوا گرم ہونے یا بدن کی گرمی وغیرہ کی وجہ سے وضوکی رطوبت خشک ہو جائے تو وضو صحیح ہے ۔نوٹ:یہ ضروری نہیں ہے کہ سر کا مسح سر کی کھال پر ہوبلکہ سر کے اگلے حصہ کے بالوں پر بھی صحیح ہے ،لیکن اگر سر کے دوسرے حصوں کے بال اگلے حصہ پر جمع ہوئے ہوں تو پہلے انھیں ہٹانا چاہئے اوراگر سر کے اگلے حصہ کے بال اس قدر لمبے ہوں کہ کنگھی کرنے سے چہرے پر آئیں تواس صورت میں بالوں کی جڑپر مسح کرنا چاہئے یا مانگ نکال کر کھال پر مسح کرنا چاہئے ۔

مبطلات وضو

جوچیزیں وضو کو باطل کرتی ہیں انھیں ''مبطلات'' کہتے ہیں اور وہ آٹھ ہیں:

ا۔پیشاب

۲۔پاخانہ

[1] یعنی پانی انسان کااپناہوناچاہئے یااس کامالک اس سے وضوکرنے پرراضی ہو۔

۳۔ریاح (یہ اس صورت میں ہے کہ جب ہوا پاخانہ کے مقام سے خارج ہو یا بیماری اور آپریشن کی وجہ سے، مخرج دوسری جگہ ہو گیا ہو)

۴۔بیہوشی

۵۔مستی

۶۔وہ نیند، جس میں آنکھیں نہ دیکھ سکیں اور کان نہ سن سکیں، اس بنا پر اگر آنکھیں نہ دیکھیں لیکن کان سنیں تو وضو باطل نہیں ہوتا ہے۔

۷۔دیوانگی

۸۔جنابت اور وہ اسباب جن کے لئے غسل کیا جاتا ہے نیز استحاضہ جسے عورتیں بعض اوقات دیکھتی ہیں، وضو کو باطل کرتا ہے۔

تیمم

اگر انسان وقت کی تنگی، بیماری یا پانی نہ ہونے یا اسی طرح کی کسی اور چیز کی وجہ سے نماز اور اس کے مانند دوسرے اعمال کے لئے وضو یا غسل نہ کر سکے تو اسے تیمم کرنا چاہئے۔

تیمم کا طریقہ

تیمم میں چار چیزیں واجب ہیں: ۱۔نیت

۲۔دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو مٹی یا اس چیز پر مارنا جس پر تیمم کرنا صحیح ہے۔

۳۔دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو سر کے بال اگنے کی جگہ سے بھوؤں اور ناک کے اوپر پوری پیشانی پر پھیرنا۔ بہتر ہے کہ ہاتھوں کو بھوؤں پر بھی پھیرا جائے۔

۴۔بائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو دائیں ہاتھ کی پوری پشت پراور اس کے بعد دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو بائیں ہاتھ کی پوری پشت پر کھینچنا ۔ وضو کے بدلے کئے جانے والے تیمم میں اتنی ہی مقدار کافی ہے لیکن اگر تیمم غسل کے بدلے ہو،توایک بار پھر ہاتھوں کو زمین پر مار کر صرف ہاتھوں کی پشت پر مسح کرے ۔

تیمم کے احکام

۱۔اگر مٹی نہ ملے تو ریت پر،اوراگر ریت نہ ملے تو ڈھیلے پر ،اوراگر وہ بھی نہ ملے توپتھر پر تیمم کرنا چاہئے اور جب ان میں سے کوئی بھی چیز نہ ملے تو کہیں پر جمع ہوئی گردو غبار پر تیمم کرنا چاہئے ۔

۲۔چونے اور دوسری معدنی چیزوں پر تیمم کرنا صحیح ہے ۔

۳۔اگر پانی کو مہنگا بیچا جارہا ہو،لیکن انسان اسے خرید سکتا ہوتو تیمم نہیں کرسکتا ہے،بلکہ اسے پانی خرید کر وضواور غسل کرنا چاہئے ۔

نماز

خدائے متعال فرماتا ہے: (ماسلکم فی سقر،قالوا لم نک من المصلّین[1])''جب اہل جہنم سے پوچھا جائے گاآخر تمھیں کس چیز نے جہنم میں پہنچادیا ہے ؟تووہ کہیں گے ہم نمازگزار نہیں تھے ۔'' پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''نماز دین کا ستون ہے،اگر بارگاہ الٰہی میں یہ قبول ہو جائے گی تودوسری عبادتیں بھی قبول ہوں گی اوراگر یہ قبول نہ ہوئی،تودوسری عبادتیں بھی قبول نہیں ہوں گی''،جس طرح ایک انسان،دن رات میں پانچ بارایک نہر میں نہائے تواس کے بدن میں کسی قسم کا میل کچیل باقی نہیں رہے گا ،اسی طرح پانچ وقت کی نمازیں بھی انسان کوگناہوں سے پاک کرتی ہیں ،جاننا چاہئے کہ جو نماز پڑھتا ہے لیکن اسے اہمیت نہیں دیتا،وہ اس شخص کے مانند ہے،جو اصلاًنماز نہیں پڑھتا ہے ۔خدائے متعال قرآن مجید میں فرماتا ہے: (فویل للمصلّین،الذّین ہم عن صلاتہم ساہون

---

[1] مدثر،۴۲،۴۳

۱) ''تو تباہی ہے ان نمازیوں کے لئے جواپنی نمازوں سے غافل رہتے ہیں۔ ''ایک دن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد میں داخل ہوئے ،اور دیکھاکہ ایک شخص نماز پڑھ رہا ہے ،لیکن رکوع و سجود کو مکل طورپر بجا نہیں لارہا ہے،آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا '' :یہ شخص جس طرح نماز پڑھ رہا ہے اگر اسی حالت میں اس دنیا سے گزر گیا تو مسلمان کی حیثیت سے دنیاسے نہیں گیا ہے ۔ ''اس بناپرنماز کو خضوع و خشوع کی حالت میں پڑھنا چاہئے اور نماز پڑھتے وقت اس بات کا خیال رکھے کہ کس ذات سے محو گفتگوہے اور رکوع و سجود اور دوسرے تمام اعمال کو صحیح طور پر انجام دے تاکہ نماز کے عالی نتائج سے بہرہ مند ہوجائے۔

خدائے متعال قرآن مجید میں نماز کے بارے میں فرماتاہے:(ان الصّلٰوۃ تنھیٰ عن الفحشاء و المنکر..۲)..نماز ہر برائی اور بدکاری سے روکتی ہے''..یقیناًایسا ہی ہے، کیونکہ نماز کے آداب اس طرح ہیں کہ اگر نماز گزاران کا لحاظ رکھے تو کبھی برائی کے پیچھے نہیں جائے گا ۔ مثلا آداب نماز میں سے ایک یہ ہے کہ نماز گزار کی جگہ اور لباس غصبی نہ ہوں، اگر اس کے لباس میں حتی ایک دھاگا بھی غصبی ہو تواس کی نماز صحیح نہیں ہے ۔ تو جو نماز گزار اس حد تک حرام سے پرہیز کرنے پر مجبور ہے تو ممکن نہیں ہے کہ وہ حرام مال کو استعمال کرے یا کسی کا حق ضائع کرے!نیز نماز اس صورت میں قبول ہوتی ہے کہ انسان، حرص، حسد اور دوسری بری صفتوں سے دور رہے اور مسلّم ہے کہ تمام برائیوں کا سرچشمہ یہی بری اور ناشائستہ صفتیں ہیں اورنمازی جب اپنے آپ کو ان صفتوں سے دور رکھے گا، تووہ یقیناًتمام برائیوں سے دور رہے گا ۔

اگر بعض لوگ نماز پڑھنے کے باوجود ناپسند کاموں کے مرتکب ہوتے ہیں، تو اس کا سبب یہ ہے کہ وہ نماز کے ضروری احکام کے مطابق عمل نہیں کرتے اور نتیجہ میں ان کی نماز قبول نہیں ہوتی ہے اور وہ اس کے عالی نتائج سے محروم رہتے ہیں۔ دین اسلام کے شارع مقدس نے نمازکواس قدر اہمیت دی ہے کہ، ہر حال میں حتی جان کنی کی حالت میں بھی انسان پر نماز کو واجب قرار دیا ہے، اگر وہ نماز کو زبان پر جاری نہیں کرسکتا ہے تو دل پر جاری کرنا چاہئےاور اگر جنگ، دشمن کے خوف یا اضطرار اور مجبوری کی وجہ

[1] ماعون ،۴،۵
[2] عنکبوت،۴۵

سے قبلہ کی طرف رخ کرکے نماز نہ پڑھ سکے تو اس کے لئے قبلہ کی طرف رخ کرکے نماز پڑھنا واجب نہیں ہے اور جس طرف بھی ممکن ہو نماز پڑھے۔

واجب نمازیں

واجب نمازیں چھ ہیں: ۱۔ پنجگانہ نمازیں[1]

۲۔ نماز آیات

۳۔ نماز میت

۴۔ واجب طواف کی نماز

۵۔ ماں باپ کی قضا نمازیں جو بڑے بیٹے پر واجب ہوتی ہیں۔

٦۔ وہ نمازیں جو اجارہ، نذر، قسم اور عہد کی وجہ سے واجب ہوتی ہیں۔

مقدمات نماز

نماز بجالانے، یعنی پروردگار عالم کی خدمت میں حاضر ہونے اور ذات مقدس الٰہی کی اظہار بندگی او رپرستش، کے لئے کچھ مقدمات ضروری ہیں ۔ جب تک یہ مقدمات فراہم نہ ہو جائیں نماز صحیح نہیں ہے اور یہ مقدمات حسب ذیل ہیں: ۱۔ طہارت

۲۔ وقت

۳۔ لباس

---

[1] یومیہ نمازوں سے مراد: صبح کی دو رکعتیں، ظہر و عصر کی چار چار رکعتیں، مغرب کی تین رکعتیں اور عشا کی چار رکعتیں ہیں۔

۴۔ مکان

۵۔ قبلہ

ان مقدمات کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ طہارت: نمازی کو نماز کی حالت میں با طہارت ہونا چاہئے، اپنے فریضہ کے مطابق نماز کو با وضو یا غسل یا تیمم کے ذریعہ بجالائے اور اس کا بدن اور لباس نجاست سے آلودہ نہ ہوں۔

۲۔ وقت: نماز ظہر و عصر میں سے ہر ایک کا ایک مخصوص وقت اور مشترک وقت ہے، نماز ظہر کا مخصوص وقت اول ظہر[1] سے نماز ظہر پڑھنے کا وقت گزرنے تک ہے۔ اگر کوئی شخص اس وقت میں سہواً بھی نماز عصر پڑھے، تو اس کی نماز باطل ہے۔ نماز عصر کا مخصوص وقت، اس وقت ہوتا ہے جب مغرب سے پہلے صرف نماز عصر پڑھنے کے برابر وقت بچا ہو۔ اگر کسی نے اس وقت تک ظہر کی نماز نہ پڑھی ہو تو اس کی نماز ظہر قضا ہو جائے گی۔

اسی طرح نماز ظہر کے مخصوص وقت اور نماز عصر کے مخصوص وقت کے درمیان کا وقت نماز ظہر و عصر کا مشترک وقت ہے۔ اگر کوئی شخص غلطی سے اس وقت کے اندر نماز عصر کو نماز ظہر سے پہلے پڑھے تو اس کی نماز صحیح ہے اور اسے ظہر کی نماز اس کے بعد پڑھنی چاہئے۔ نماز مغرب کا مخصوص وقت اول مغرب[2] سے تین رکعت نماز پڑھنے کے وقت کے برابر ہے۔ نماز عشا کا مخصوص وقت وہ وقت ہے جب نصف شب[3] سے پہلے نماز عشا پڑھنے کے برابر وقت بچا ہو۔ اگر کسی نے اس وقت تک نماز مغرب

---

[1] اگر ایک لکڑی یا اس کے مانند کوئی چیز سیدھی زمین میں نصب کی جائے تو، سورج چڑھنے پر اس کا سایہ مغرب کی طرف پڑے گا جس قدر سورج او پرچڑھے گا، یہ سایہ کم ہوتاجائے گا اور اول ظہر میں اس کی کمی آخری مرحلہ پر پہنچ جائے گی، جب ظہر کا وقت گزرے گا تو سایہ مشرق کی طرف پلٹ جاتا ہے او رسورج جس قدر مغرب کی طرف بڑھے گا سایہ زیادہ ہوتا جائے گا۔ اس بنا پر جب سایہ کم ہوتے ہوئے کمی کے آخری درجہ پر پہنچ جائے اور پھرسے بڑھنا شروع ہوجائے تو معلوم ہو تاہے کہ ظہر کا وقت ہے۔ لیکن یہ بات قابل ذکر ہے کہ بعض شہروں جیسے مکہ مکرمہ میں ظہر کے وقت سایہ بالکل غائب ہوتاہے، ایسے شہروں میں سایہ کے دوبارہ نمودار ہونے پر ظہر کا وقت ہوتاہے۔

[2] سورج ڈوبنے کے تقریباً پندرہ منٹ بعد مغرب ہوتی ہے۔ اس کی علامت یہ ہے کہ سورج ڈوبنے کے بعد مشرق کی طرف رونماہونے والی سرخی غائب ہو جائے۔

[3] نصف شب ،شرعی ظہر کے بعدگیارہ گھنٹے اور پندرہ منٹ گزرنے کے بعد ہو تی ہے۔

نہیں پڑھی ہے تو اسے پہلے نماز عشا پڑھنی چاہئے پھر اس کے بعد نماز مغرب پڑھے۔ نماز مغرب کے مخصوص وقت اور نماز عشاء کے مخصوص وقت کے درمیان نماز مغرب و عشا کا مشترک وقت ہے۔ اگر کوئی شخص اس وقت میں غلطی سے نماز مغرب سے پہلے نماز عشا کو پڑھے تو اس کی نماز صحیح ہے اور اسے نماز مغرب کو اس کے بعد بجالانا چاہئے۔ نماز صبح کا وقت اول فجر صادق[1] سے سورج نکلنے تک ہے۔

۳۔ لباس: نمازی کے لباس میں چند چیزیں شرط ہیں: ۱۔ لباس مباح ہو، یعنی نمازی کا اپنا لباس ہو یا اگر اپنا لباس نہ ہو تو اس لباس کا مالک اس میں نماز پڑھنے پر راضی ہو۔

۲۔ لباس نجس نہ ہو۔

۳۔ مردار کی کھال کا نہ ہو، خواہ حلال گوشت حیوان کی کھال ہو یا حرام گوشت کی۔

۴۔ حرام گوشت حیوان کے اون یا بالوں کا نہ ہو۔ لیکن سمور کے کھال سے بنے ہوئے لباس میں نماز پڑھ سکتے ہیں۔

۵۔ اگر نمازی مرد ہے تو ریشمی اور زرباف لباس نہیں ہونا چاہئے اور خود کو بھی سونے سے زینت نہ کرے۔ نماز کے علاوہ بھی مردوں کے لئے ریشمی لباس پہننا اور سونے سے زینت کرنا حرام ہے۔

۴۔ مکان: نمازی کے مکان۔ یعنی وہ جگہ جہاں پر وہ نماز پڑھتا ہے۔ کے کچھ شرائط ہیں: ۱۔ مباح ہو۔

۲۔ ساکن ہو۔ اگر ایک ایسی جگہ جو متحرک ہو، جیسے گاڑی میں اور متحرک کشتی میں نماز پڑھنے پر مجبور ہو تو کوئی حرج نہیں ہے، البتہ گاڑی وغیرہ قبلہ کے مخالف سمت میں چل رہی ہوں تو نمازی کو قبلہ کی طرف گھومنا چاہئے۔

---

[1] فجر کی اذان کے قریب مشرق کی طرف ایک سفیدی اوپر کی طرف بڑھتی ہے اسے فجر اول یا فجر کاذب کہتے ہیں۔ جب یہ سفیدی پھیل جاتی ہے، تو فجر دوم یعنی فجر صادق ہے اور صبح کی اذان کا وقت ہے ۔

۳۔ اگر مکان نجس ہو تو اس قدر تر نہ ہو کہ اس کی رطوبت نمازی کے بدن یا لباس تک پہنچ جائے۔ لیکن پیشانی رکھنے کی جگہ اگر نجس ہو تو خشک ہونے کی صورت میں بھی نماز باطل ہے۔

۴۔ پیشانی رکھنے کی جگہ گھٹنوں کی جگہ سے، ملی ہوئی چار انگلیوں سے زیادہ پست یا بلند نہیں ہونی چاہئے۔

۵۔ قبلہ: خانہ کعبہ، جو مکہ مکرمہ میں ہے، قبلہ ہے اور اسی کی طرف رخ کرکے نماز پڑھنی چاہئے۔ البتہ جو لوگ دور ہیں وہ اگر اس طرح کھڑے ہو جائیں یا بیٹھ جائیں کہ کہا جائے کہ قبلہ کی طرف رخ کئے ہوئے ہیں، تو کافی ہے، اسی طرح دوسری چیزیں جیسے حیوانات کا ذبح کرنا بھی قبلہ کی طرف رخ کرکے انجام دیا جانا چاہئے۔ جو شخص بیٹھ کر بھی نماز نہ پڑھ سکتا ہو تو اسے دائیں پہلو پر ایسے لیٹ کر نماز پڑھنا چاہئے کہ اس کے بدن کا اگلا حصہ قبلہ کی طرف ہو،اور اگر ممکن نہ ہو تو بائیں پہلو پر اس طرح لیٹے کہ اس کے بدن کا اگلا حصہ قبلہ کی طرف ہواور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو اسے پشت پر اس طرح لیٹنا چاہئے کہ اس کے پاؤں کے تلوے قبلہ کی طرف ہوں۔ اگر انسان تحقیق کے بعد نہ سمجھ سکے کہ قبلہ کس طرف ہے تو اسے مسلمانوں کے محرابوں، قبروں یا دوسرے راستوں سے پیدا ہوئے گمان کے مطابق عمل کرنا چاہئے۔

واجبات نماز

واجبات نماز یعنی وہ چیزیں جو نماز میں واجب ہیں، گیارہ ہیں: ۱۔ نیت

۲۔ تکبیرۃ الاحرام

۳۔ قیام

۴۔ قرات

۵۔ رکوع

٦۔ سجود

۷۔ تشہد

۸۔ سلام

۹۔ ترتیب، یعنی نماز کے اجزاء کو معین شدہ دستور کے مطابق پڑھے، آگے پیچھے نہ کرے۔

۱۰۔ طمانیت، یعنی نماز کو وقار اور آرام سے پڑھے۔

۱۱۔ موالات: یعنی نماز کے اجزاء کو پے در پے بجالائے اور ان کے درمیان فاصلہ نہ ڈالے۔مذکورہ گیارہ چیزوں میں سے پانچ چیزیں ارکان ہیں کہ اگر عمداً یا سہواً کم و زیاد ہو جائیں، تو نماز باطل ہے اور باقی چیزیں رکن نہیں ہیں، صرف اس صورت میں نماز باطل ہوگی کہ ان میں عمداً کمی وزیادتی کی جائے۔

ارکان نماز

ارکان نماز حسب ذیل ہیں: ۱۔ نیت

۲۔ تکبیرۃ الاحرام

۳۔ قیام ۔ تکبیرۃ الاحرام کے وقت پر قیام اور متصل بہ رکوع

۴۔ رکوع

۵۔دو سجدے

ا۔نیت '' :نیت '' سے مراد یہ ہے کہ انسان نماز کو قصد قربت سے، یعنی خدائے متعال کے حکم کو بجا لانے کے لئے انجام دے ۔ضروری نہیں ہے کہ نیت کو دل سے گزارے یا مثلاًزبان سے کہے '' : میں چار رکعت نماز ظہر پڑھتا ہوں قربۃً الی اللہ ''

۲۔تکبیرۃ الاحرام: اذان واقامت کہنے کے بعد، نیت کے ساتھ ''اللہ اکبر '' کہنے سے نماز شروع ہوتی ہے اور چونکہ اس تکبیر کے کہنے سے کچھ چیزیں جیسے کھانا پینا ،ہنسنا اور قبلہ کی طرف پشت کرنا،حرام ہو جاتی ہیں،اس لئے اسے تکبیرۃالاحرام کہتے ہیں ۔اور مستحب ہے کہ تکبیرۃالاحرام کہتے وقت ہاتھوں کو بلند کریں،اس عمل سے خدائے متعال کی بزرگی کو مد نظر رکھ کر غیر خدا کو حقیر سمجھ کر چھوڑ دیں

۳۔قیام: تکبیرۃ الاحرام کہتے وقت میں قیام اور قیام متصل بہ رکوع ،رکن ہے ،لیکن حمد اور سورہ پڑھتے وقت قیام اور رکوع کے بعد والا قیام رکن نہیں ہے .اس بناء پر اگر کوئی شخص رکوع کو بھول جائے اور سجدے میں پہنچنے سے پہلے اسے یاد آجائے اسے کھڑا ہونے کے بعد رکوع میں جانا چاہئے ، لیکن اگر جھکے ہوئے رکوع کی حالت میں ہی سجدہ کی طرف پلٹے،تو چونکہ قیام متصل بہ رکوع انجام نہں پایا ہے اس لئے اسکی نماز باطل ہے ۔

۴۔رکوع: نمازی کو قرائت کے بعد اس قدر جھکنا چاہئے کہ ہاتھ گھٹنوں تک پہنچ جائیں اور اس عمل کو رکوع کہتے ہیں ۔رکوع میں ایک مرتبہ ''سبحان ربّی العظیم وبحمدہ ''یا تین مرتبہ '' سبحان اللہ '' کہنا چاہئے ۔رکوع کے بعد مکمل طور پر کھڑا ہونا چاہئے اس کے بعد سجدے میں جانا چاہئے ۔

۵۔ سجدہ '' :سجدہ '' یہ ہے کہ پیشانی ،دونوں ہتھیلیاں ،دونوں گھٹنے اور دونوں پاؤں کے انگوٹھوں کے سرے کو زمین پر رکھے اور ایک مرتبہ '' سبحان ربّی الاعلی و بحمدہ '' یا '' سبحان اللہ '' تین مرتبہ پڑھے۔اس کے بعد بیٹھے اور سجدہ میں جاکر مذکورہ ذکر پڑھے۔جس چیز پر پیشانی رکھتا ہے وہ زمین یا زمین سے اگنے والی چیز ہونی چاہئے،کھانے پینے،پوشاک اور معدنی چیزوں پر سجدہ جائز نہیں ہے ۔

تشہد وسلام: اگرنمازدورکعتی ہے، تو دو سجدے بجالانے کے بعد کھڑا ہو جائے اور حمد و سورہ کے بعد قنوت بجالائے پھر رکوع اور دو سجدوں کے بعد تشہد پڑھے پھر سلام پڑھ کر نماز تمام کرے۔

اگر نماز تین رکعتی ہوتو تشہد کے بعد اٹھے اور صرف ایک بار حمدیا تین مرتبہ سبحان اللہ و الحمد للہ و لا الہ اِلاَّ اللہ و اللہ اکبر پڑھے، پھر رکوع ، دو سجدے، تشہد اور سلام پڑھے۔اور اگر نماز چار رکعتی ہے تو چوتھی رکعت کو تیسری رکعت کی طرح بجالا کر، تشہد کے بعد سلام پڑھے ۔ ا۔ حمد و سورہ کے بعد ہاتھوں کو اپنے چہرے کے روبرو بلند کرکے قنوت میں جو بھی ذکر چاہے کہے، مثلاً : ''ربنا آتنا فی الدنیا حسنۃ و فی الاخرۃ حسنۃ و قنا عذاب النار ''

۲۔ تشہد سے مراد یہ ہے کہ ان جملات کو کہے : ''اشہد ان لا الہ الا اللہ و حدہ لا شریک لہ واشہد ان محمد اً عبدہ و رسولہ، اللھم صل علی محمد وآل محمد ''۔

۳۔ سلام کو اسطرح بجالائے: السلام علیک ایّھا النَّبی و رحمۃ اللہ و برکاتہ، السَّلام علینا و علی عباد اللہ الصالحین، السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ.

نماز آیات

چارچیزوں کی وجہ سے نماز آیات واجب ہوتی ہے: ا۔ سورج گہن۔

۲۔ چاند گہن۔ چاہے کچھ حصے کو گہن لگا ہواو رکوئی اس سے خوفزدہ بھی نہ ہو۔

۳۔ زلزلہ۔ اگرچہ کوئی نہ ڈرے۔

۴۔ بادلوں کی گرج اور بجلی کی کڑک اور سیاہ و سرخ آندھی وغیرہ، اس صورت میں کہ اکثر لوگ ڈر جائیں۔

نماز آیات پڑھنے کا طریقہ

نماز آیات دو رکعت ہے اور ہر رکعت میں پانچ رکوع ہیں اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ انسان نیت کے بعد تکبیر کہے اور حمد او رایک مکل سورہ پڑھے پھر رکوع میں جائے، پھر رکوع سے کھڑا ہوجائے،اور دوبارہ حمد اور ایک سورہ پڑھے پھر رکوع بجالائے یہاں تک کہ پانچ مرتبہ رکوع بجالائے اور پانچویں رکوع سے اٹھنے کے بعد دو سجدے بجالائے پھر کھڑے ہو کر دوسری رکعت کو پہلی رکعت کے مانند بجالاکر تشہد اور سلام کے بعد نماز تمام کرے۔

نماز آیات کا دوسرا طریقہ: انسان نیت اور تکبیر اور سورہ حمد پڑھنے کے بعد ایک سورہ کی آیات کو پانچ حصوں میں تقسیم کرکے اس کے ایک حصہ کو پڑھ کررکوع میں جائے، رکوع سے اٹھ کر سورہ حمد پڑھے بغیر سورہ کا دوسرا حصہ پڑھے اور پھر رکوع بجالائے اور اسی طرح پانچویں رکوع سے پہلے سورہ کو ختم کرکے پھر رکوع بجالائے اس کے بعد دوسجدے بجالائے پھر دوسری رکعت کو پہلی رکعت کے مانند بجالاکے نماز کو ختم کرے۔

مسافر کی نماز

مسافر کو چھ شرائط کے ساتھ چاررکعتی نماز کو دو رکعت پڑھنا چاہئے:۱۔ اس کا سفر آٹھ فرسخ سے کم نہ ہویا چار فرسخ جائے او رچارفرسخ واپس آئے۔

۲۔ ابتداء سے آٹھ فرسخ سفر کرنے کا ارادہ رکھتا ہو۔

۳۔ راستہ میں اپنے قصد کو نہ توڑے۔

۴۔ اس کا سفر گناہ کے لئے نہ ہو۔

۵۔ سفر اس کا پیشہ نہ ہو۔پس اگر کسی کا پیشہ سفر ہو (جیسے ڈرائیور) تو اسے نماز پوری پڑھنی چاہئے مگر یہ کہ دس روز اپنے گھر میں رہے، تو اس صورت میں تین بار سفر کرنے پر نماز قصر پڑھے۔

٦۔ حد ترخص تک پہنچ جائے،یعنی اپنے وطن یا دس دن تک قیام کی جگہ سے اس قدر دور چلا جائے کہ شہر کی دیواروں کو نہ دیکھ سکے اور اس شہر کی اذان کو نہ سن سکے۔

نماز جماعت

مستحب ہے کہ مسلمان پنجگانہ نمازوں کو جماعت کی صورت میں پڑھے اور نماز جماعت کا ثواب فرادیٰ پڑھی جانے والی نماز کے کئی ہزار گنا ہے۔

نماز جماعت کی شرائط

١۔ امام جماعت بالغ، مؤمن، عادل اور حلال زادہ ہونا چاہئے، نماز کو صحیح پڑھتا ہو اور اگر ماموم مرد ہے تو امام کو بھی مرد ہونا چاہئے۔

٢۔ امام اور ماموم کے درمیان پردہ یا کوئی اور چیز حائل نہ ہو جو امام کو دیکھنے میں رکاوٹ بنے، لیکن اگر ماموم عورت ہو تو اس صورت میں پردہ یا اس کے مانند کسی چیز کے ہونے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

٣۔ امام کی جگہ ماموم کی جگہ سے بلند نہ ہو، لیکن اگر بہت کم (چار انگلیوں کے برابر یا اس سے کم) بلند ہو تو کوئی حرج نہیں ہے۔

۴۔ ماموم کو امام سے تھوڑا پیچھے یا اس کے برابر ہونا چاہئے۔

نماز جماعت کے احکام

۱۔ ماموم حمد و سورہ کے علاوہ ساری چیزیں خود پڑھے، لیکن اگر اس کی پہلی یا دوسری رکعت ہو اور امام کی تیسری یا چوتھی رکعت ہو تو اسے حمد و سورہ کو بھی پڑھنا چاہئے اور اگر سورہ پڑھنے کی وجہ سے امام کے ساتھ رکوع میں نہ پہنچ سکے تو صرف حمد پڑھ کر خود کو رکوع میں امام کے ساتھ پہنچا دے اور اگر نہ پہنچ سکا تو نماز کو فرادی کی نیت سے پڑھے۔

۲۔ ماموم کو رکوع، سجود اور نماز کے دوسرے افعال امام کے ساتھ یا اس سے تھوڑا بعد انجام دینا چاہئے، لیکن تکبیرۃ الاحرام کو قطعاً امام کے بعد کہے۔

۳۔ اگر امام رکوع میں ہو اور اس کی اقتداء کرے اور رکوع میں پہنچ جائے، تو اس کی نماز صحیح ہے اور ایک رکعت حساب ہوگی۔

روزہ

دین مقدس اسلام کے فروع دین میں سے ایک ''روزہ'' ہے۔ ہر مکلف پر واجب ہے کہ وہ رمضان المبارک میں روزہ رکھے یعنی پروردگار عالم کے حکم کی اطاعت کرتے ہوئے صبح کی اذان سے مغرب تک ،روزہ کو باطل کرنے والی چیزوں (مفطرات روزہ) سے پرہیز کرے۔

روزہ کو باطل کرنے والی چیزیں

چند چیزیں روزہ کو باطل کرتی ہیں ،وہ حسب ذیل ہیں: ا۔کھانا اور پینا،اگرچہ اس چیز کا کھانا اور پینا معمول نہ ہو،جیسے مٹی اور درخت رس۔

۲۔خدا،رسول خداؐ اور آپ کے جانشینوں (ائمہ ھدیٰ) کی طرف جھوٹ کی نسبت دینا۔

۳۔غلیظ غبار کو حلق تک پہنچانا ۔

۴۔پورے سر کوپانی میں ڈبودینا ۔

۵۔قے کرنااگر عمداً ہو۔دوسرے مفطرات روزہ کے بارے میں مراجع کی توضیح المسائل کی طرف رجوع کیا جائے۔

اسلام میں جہاد

جہاد کے کلی مسائل ہر مخلوق کا اپنی ذات کادفاع کرنا اوراسی طرح اپنے منافع کادفاع کرناایک عام قانون ہے جوعالم خلقت میں بلا چون وچرااثابت ہے۔انسان بھی اپنی حیثیت سے اپنی ہستی اور منافع کادفاع کرتا ہے اوردوسروں کے مانند دفاع کی توانائیوں سے مسلح ہے تاکہ اپنے دشمن سے مقابلہ کر سکے ۔انسان اپنی خدادادجبلت اور فطرت سے قائل ہے کہ اسے اپنادفاع کرنا چاہئے اوراپنے اس دشمن کونابودکردینا چاہے جوکسی بھی وسیلہ سے اس کو نابود کرنے سے باز نہیں آرہا ہے۔

اسی طرح اگر کوئی شخص اس کے حیاتی منافع پر قبضہ کرنا چاہے تواسے دفاع کی غرض سے اٹھنا چاہئے اور ہر ممکن طریقے سے اس کو روکنا چاہئے ۔یہ فطری موضوع جوایک انسان کی فطرت میں ثابت اورپائدارہے ،اسی طرح انسانی معاشروں میں بھی ثابت و مستحکم ہے۔یعنی جودشمن معاشرے کے افراد یامعاشرے کی آزادی کے لئے خطرہ ہو،وہ اس معاشرے کی نظرمیں سزائے موت کا مستحق ہےاور جب سے انسان اور انسانی معاشرے ہیں یہ فکران میں ثابت اوربرقرار ہے کہ ہرفرداورمعاشرہ اپنے جانی دشمن کے بارے میں ہرقسم کا فیصلہ کرسکتا ہے اوررد عمل دکھا سکتا ہے ۔اسلام بھی ۔جوایک اجتماعی دین ہے اور توحید کی بنیاد پر استوار ہے ۔حق اور عدالت کے سامنے تسلیم نہ ہونے والوں کواپنا جانی دشمن جانتا ہے اورانھیں نظام بشریت میں مخل جان کران کے لئے کسی قسم کی قدر وقیمت اوراحترام کا قائل نہیں ہے اور چونکہ خود کو عالمی دین جانتا ہے اس لئے اپنے پیروؤں کے لئے کسی ملک اور سرحدوں کی محدودیت کا قائل نہیں ہےاور جو بھی شرک کے عقیدہ میں مبتلا ہو اور واضح منطق اور حکیمانہ پند و نصیحت کو قبول نہ کرتا ہو اور حق اوراحکام الہیٰ کے سامنے ہتھیار نہ ڈالتا ہو،تو اسلام اس کے ساتھ جنگ کرتا ہے تاکہ وہ حق وعدالت کے سامنے ہتھیار

ڈال دے ۔ مختصر یہ کہ جہاد کے سلسلہ میں اسلام کے قوانین بھی یہی ہیں اور وہ مکمل طور پراس روش کے مطابق ہیں جو ہرانسانی معاشرہ کی اپنی فطرت کے مطابق اپنے جانی دشمنوں کے بارے میں ہے ۔اسلام بدخواہ دشمنوں کے پروپیگنڈوں کے باوجود،تلوار کا دین نہیں ہے،کیونکہ اسلام کی روش سلاطین کی روش نہیں ہے کہ جن کی دلیل و منطق صرف تلواراور سیاسی حربے ہوتے ہیں ،بلکہ اسلام ایک ایسا دین ہے،جس کا بانی خدائے متعال ہے ،جواپنے آسمانی کلام میں لوگوں کے ساتھ منطق وعقل کی بنیاد پر بات کرتا ہے اوراپنی مخلوقات کو اس دین کی طرف دعوت دیتا ہے جوان کی فطرت کے مطابق ہے ۔

جس دین کی عمومی تحیت،سلام ہواور اس کا عمومی پروگرام قرآن مجید کے نص کے مطابق ''والصلح خیر[1]''ہو،وہ ہرگز تلوار کا دین نہیں ہوسکتا ۔پیغمبراسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں،جب اسلام کی نورانیت نے تمام حجازکو منور کررکھا تھا اور مسلمان اہم جنگوں اور سخت مقابلوں میں مبتلا تھے ،تو اس وقت قتل ہونے والے مسلمانوں کی تعداد دوسوسے زیادہ نہ تھی اور قتل ہونے والے کفار کی تعداد ایک ہزارتک نہیں پہنچی تھی ۔کتنی بے انصافی ہے کہ ایسے دین کوتلوار کادین کہا جائے ۔

اسلام میں جنگ کے مواقع

اسلام ،جن کے ساتھ جنگ کرتا ہے ،وہ حسب ذیل چند گروہ ہیں: ۱۔مشرکین: مشرکین یعنی وہ لوگ جو توحید،نبوت اورمعاد کے قائل نہیں ہیں ۔ان کو پہلے اسلام لانے کی دعوت دیتا ہے تاکہ کسی قسم کا شک و شبہ اور بہانہ باقی نہ رہے،دین کے حقائق کو ان کیلئے واضح کرکے تشریح کرتا ہے پس اگرانہوں نے قبول کیا تودوسرے مسلمانوں کے بھائی اور نفع ونقصان میں برابر ہوں گے،اور اگر قبول نہ کیا اور حق وحقیقت کے واضح ہونے کے باوجود تسلیم نہ ہوئے تو اسلام ان کے مقابلہ میں اپنادینی فریضہ ''جہاد''کوانجام دیتا ہے ۔

۲۔اہل کتاب:اہل کتاب ''یہود ،عیسائی اور مجوسی ہیں''اسلام ان کوصاحب دین اورصاحب کتاب آسمانی جانتا ہے۔یہ لوگ توحید ، نبوت مطلقہ اورمعاد کے قائل ہیں ان لوگوں کے ساتھ بھی مشرکین جیسا سلوک کرنا چاہئے ،لیکن چونکہ اصل توحید پر عقیدہ رکھتے ہیں

[1] نساء،۱۲۷۔

،لھذا جز یہ ادا کر کے اسلام کی پناہ میں آ سکتے ہیں یعنی اسلام کی سرپرستی کو قبول کریں اوراپنی آزادی کی حفاظت کریں اوراپنے دینی احکام پر عمل کریں ۔تو دوسرے مسلمانوں کی طرح ان کی جان ،مال اورعزت محترم ہوگی اور اسکے عوض میں اسلامی معاشرہ کو کچھ مال ادا کریں گے ،لیکن ان کو اسلام کے خلاف پروپیگنڈے،دین کے دشمنوں کی مدد اوردوسرے ایسے کام انجام نہیں دینا چاہئے جو مسلمانوں کے نقصان میں ہو ۔

۳۔بغاوت اورفساد برپا کرنے والے: بغاوت اور فساد برپا کرنے والے یعنی وہ مسلمان جواسلام و مسلمین کے خلاف مسلحانہ بغاوت کرکے خونریزی کریں،اسلامی معاشرہ ان کے ساتھ جنگ کرتا ہے تاکہ وہ ہتھیارڈال کرفساد اوربغاوت سے ہاتھ کھینچ لیں ۔

۴۔دین کے دشمن:دین کے دشمن جودین کی بنیاد کو ویران کرنے یاحکومت اسلامی کو نابودکرنے کے لئے حملہ کریں ،تو تمام مسلمانوں پرواجب ہے کہ دفاع کریں اوران کے ساتھ کافرحربی کا سلوک کریں ۔اگراسلام ا ور مسلمین کی مصلحت کاتقاضا ہو تواسلامی معاشرہ اسلام کے دشمنوں کے ساتھ وقتی طور پر جنگ بندی کا معاہدہ کرسکتا ہے ،لیکن یہ حق نہیں ہے کہ ان کے ساتھ ایسا دوستانہ رابطہ برقرار کرے کہ ان کے گفتاروکردار مسلمانوں کے افکارواعمال پر منفی اثرڈال کرانھیں خراب کر دیں ۔

جہاد کے بارے میں اسلام کا عام طریقہ

اسلامی معاشرہ پر فرض ہے کہ اگر جہاد کے شرائط موجودہوں تو،ان کفار سے راہ خدا میں جنگ کریں جن کی سرحد ملی ہوئی ہے، اورہر مسلمان بالغ،عاقل،صحت منداورجس کے ہاتھ پاؤں اورآنکھ صحیح و سالم نہ ہوں،پرجہادواجب کفائی ہے۔اسلام کے لشکرپر فرض ہے کہ جب دشمن کے ساتھ مقابلہ پر آئے ،تودینی حقائق کو ان کے لئے اس طرح بیان اورواضح کرے کہ کوئی ابہام باقی نہ رہے اوران کو حق کی طرف دعوت دے اورصرف اس صورت میں جنگ کا اقدام کرے کہ حق کے واضح ہونے کے بعد بھی وہ دین کوقبول نہ کریں ۔اسلام کے سپاہی کو دشمنوں پرپانی بند نہیں کرنا چاہئے اوردشمن پر شب خون نہیں مارنا چاہئے دشمن کی عورتوں ،بچوں

،ناتواں بوڑھوں اور دفاع کی قدرت نہ رکھنے والوں کو قتل نہیں کرنا چاہئے ،دشمن کے برابر یا دوگنا ہونے کی صورت میں میدان جنگ سے فرار نہ کرے ۔اگر ہم اسلام کے جنگی طریقہ کو ترقی یافتہ ملتوں کے جنگی طریقوں سے مواز نہ کریں، جو ہر خشک وتر کو جلادیتے ہیں اور کسی کمزوراور بیچارہ کے حال پر رحم نہیں کرتے،تو واضح ہو جائے گا کہ اسلام کس قدر انسانیت کے اصول کا پابند ہے ۔

حکومت،قضاوت اور جہاد کیوں مردوں سے مخصوص ہے ؟معاشرے کے حساس ترین اجتماعی امور کہ ،جن کی باگ ڈور صرف عقل واستدلال کے سپردکی جانی چاہئے اوران میں جذبات واحساسات کی کسی صورت میں مداخلت نہیں ہونی چاہئے ، وہ حکومت،قضاوت اور جنگ کے شعبے ہیں ۔ کیوں کہ مملکت کے امور کو چلانے اور ،معاشرے میں پیدا ہونے والی دشمنیوں کو حل کرنے میں ہزاروں ناقابل برداشت واقعات اور طرح طرح کی چہ می گوئیوں اور جان ، مال،عزت و ابرو کی دھمکیوں جیسے گوناگوں مسائل سے دوچار ہوناپڑتا ہے کہ جس کو نہایت قوی اور مستقل مزاج افراد کے علاوہ کوئی طاقت برداشت نہیں کر سکتی کہ اوران تمام مسائل سے چشم پوشی کرکے صبر نہیں کیا جاسکتاہے،اورگوناگوں مخالفتوں کے درمیان اجتماعی عدالت کو نافذ نہیں کیا جاسکتا ہے ،جو اس عہدہ کا حامل ہو اسے دوست ودشمن ،بڑے اور بھلے،چاپلوس اوربد گو ئی کرنے والے اورعالم وجاہل کوایک نظرسے دیکھنا چاہئے اوراپنے خواہشات نفسانی کے برعکس حکومت کرنی چاہئے اور فیصلہ دینا چاہئے ۔بدیہی ہے کہ جس کے وجود میں جذبات کا غلبہ ہو تا ہے وہ اس کام کو انجام دینے کی توانائیاں نہیں رکھتا ہے ۔جب جذبات حکومت اور قضاوت سے عاجز ہوں گے تو جنگ کے شعبہ میں بدرجہ اولیٰ نامناسب ہوں گے کیونکہ دوسرے اجتماعی امور کے برعکس جنگ میں ہر خشک وتر کو جلا دیتے ہیں جنگی سپاہی اور دشمن کے شیر خوار بچے کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے ۔

اسلام کا جنگی طریقہ عدالت کی بنیاد پر استوار ہے، البتہ اس قسم کی کا طریقہ جذبات کے غلبہ سے عمل میں نہیں لایا جاسکتا ہے، کیونکہ اگر جنگ کے وقت جذبات اور ہمدردی کی بناپر قطب موافق کی طرف مائل ہوا تو ضرورت سے زیادہ نرمی اختیار کرکے شکست کھائے گا اور اگر قطب مخالف کی طرف مائل ہوا، تو حد سے تجاوز کرکے، گنہگاراور بے گناہ کویکساں سمجھ کر انسانی اصول و ضوابط کو پامال

کرے گا۔اس سلسلہ میں اسلام کے نظریہ کی حقانیت کی بہترین دلیل یہ ہے کہ مغربی ممالک نے مدتوں سے عورتوں کو معاشرے میں مردوں کے دوش بدوش قرار دیا ہے اور تعلیم و تربیت سے ان کی نشو نما کرتے ہیں او راب تک حکومت کے عہدوں، عدلیہ کے عالی مقامات اور جنگی سرداروں کے عہدوں پر مردوں کے مقابلہ میں عورتوں نے کوئی قابل توجہ ترقی نہیں کی ہے۔ البتہ خانہ داری او ربچوں کی تربیت کے کاموں میں، کہ جن کا سرچشمہ جذبات اور ہمدردی سے ہمیشہ پیش قدم رہی ہیں۔امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام نے ایک مختصر جملہ میں معاشرے میں عورت کی حیثیت و منزلت کو یوں بیان فرمایا ہے'':فان المرأۃ ریحانۃ و لیست بقہرمانۃ[۱]''

''بیشک عورت ایک خوشبودار پھول ہے نہ سورما''اور یہ ایک بہترین جملہ ہے جو اسلامی معاشرے میں عورت کی اجتماعی منزلت کی نشاندہی کرتاہے۔پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیشہ عورتوں کے بارے میں نصیحت فرماتے تھے، یہاں تک کہ آنحضرتؐ نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں جو آخری کلمہ فرمایا اور اس کے بعد آپؐ خاموش ہوگئے وہ یہ تھا'' :اللّٰہ اللّٰہ فی النساء[۲]''

امربالمعروف اور نہی عن المنکر اور مختلف قسم کی سزائیں

اسلام کی حیات و بقا سے مربوط ضرورتوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس کے قوانین کی مخالفتوں کو روکا جائے۔ اس ضرورت کو دور کرنے کے لئے دو امور سے استفادہ کیا گیا ہے :۱۔ سزا کے لئے قوانین کا وضع کرنا،جن کو اسلامی حکومت کے ذریعہ نافذ ہونا چاہئے اور اس طرح شرعی احکام کی مخالفت کو روکا جاسکتا ہے۔

۲۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر،اسلام نے اپنے تمام پیروٴں پرواجب کیا ہے کہ جب دیکھیں کہ کسی قانون پر عمل نہیں ہورہاہے، تو وہ آرام سے نہ بیٹھیں بلکہ خلاف ورزی کرنے والے کو اطاعت پر مجبور کریں اور اسے نافرمانی کرنے سے روکیں۔ مسلمانوں کے عام افراد، بادشاہ و رعایا، طاقتور و کمزور، مرد و عورت اور چھوٹے بڑے سب اس دینی فریضہ کو نافذ کرنے پرمامور ہیں اورخاص شرائط

[۱] وسائل الشیعہ ، ج ۱۴، ص ۱۲۰، باب ۸۷۔
[۲] بحار الانوار، ج ۳۲، ص ۵۳۰۔

کے ساتھ اس کام (امر بالمعروف و نہی عن المنکر) کو انجام دینا چاہئے۔ یہ اسلام کے شاہکاروں میں سے ایک شاہکار ہے کہ قانون کی خلاف ورزی کو روکنے کے لئے، دنیا کے مختلف کورٹ کچہری اور تھانوں سے بہتر اور قوی تر ہے۔

اسلام میں فیصلہ

مسائل عدلیہ کے کلیات شرعی طور پر جو صفتیں قاضی میں ہونی چاہئیں، حسب ذیل ہیں:۱۔ بالغ

۲۔عاقل

۳۔ اسلام

۴۔ عدالت،یعنی گناہان کبیرہ کو انجام نہ دے اور گناہان صغیرہ پر اصرار نہ کرے۔

۵۔ حلال زادہ

٦۔ علم،یعنی عدلیہ سے مربوط قوانین کو اپنے اجتہاد سے جانتا ہو،اگر دوسرے کے فتوی کے مطابق سنائے تو کافی نہیں ہے۔

۷۔یادداشت۔ یعنی بھولنے والا فیصلہ نہیں دے سکتا ہے۔

۸۔بینائی۔ اکثر فقہا کی نظر میں نابینا جج نہیں بن سکتا ہے۔

اگر قاضی میں مذکورہ صفات میں سے کوئی ایک صفت نہیں پائی جاتی ہو تو وہ خودبخود فیصلہ دینے کے منصب سے عزل ہوجاتاہے۔ قاضی (جج) کے فرائض اسلام کی مقدس شریعت میں، جو فیصلہ دینے کے منصب پر فائز ہو، اس کے لئے مندرجہ ذیل فرائض کا انجام دینا ضروری ہے:۱۔ لوگوں کے ایک دوسرے کے خلاف دعووں کے بارے میں فقہ کی کتابوں میں موجود قوانین کے مطابق فیصلہ دینا۔

۲۔ یتیموں اور دیوانوں کی سرپرستی کرنا، اگر ان کے باپ یا دادا نے ان کے لئے کوئی سرپرست معین نہ کیا ہو۔

۳۔ عمومی اوقاف اور مجہول المالک اموال کی حفاظت کرنا۔

۴۔ احمقوں کے مال کی دیکھ بھال کرنا۔

۵۔ دیوانہ پن اور مفلس ہونے کا حکم جاری کرنا اور حکم جاری کرنے کے بعد مفلس کے مال کی حفاظت کرنا۔

۶۔ خیانت کرنے کی صورت میں وصی کو بدل دینا۔

۷۔ وصی کے ساتھ ایک امین کو بھی رکھنا، جب وصی اکیلے ہی ذمہ داری کو نبھا نہ سکے۔

۸۔ اگر کوئی اپنا قرض ادا نہ کر سکے تو اسے مہلت دینا۔

۹۔ ممکن ہونے کے باوجود واجب نفقہ دینے سے اجتناب کرنے والوں پر ذمہ داری عائد کرنا۔

۱۰۔ اس کے حوالہ کئے گئے اسناد اور امانتوں کا تحفظ کرنا۔

۱۱۔ شرعی حدود جاری کرنا۔

۱۲۔ شرعاً معین شدہ افراد کو جیل بھیجنے کا حکم جاری کرنا۔

فیصلہ کرنے کی اہمیت

اسلام میں ''قاضی'' کے لئے معین کئے گئے فرائض کی تحقیقات سے فیصلہ کرنے کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اسی لئے قاضی اپنے فیصلہ میں جذبات سے کام نہیں لے سکتا ہے اور رشوت لینے کا، یہاں تک کہ بر حق افراد سے بھی، سخت منع کیا گیا ہے۔ اس

کے علاوہ اسے ان افراد کے درمیان فرق نہیں کرنا چاہئے جو اس کے پاس رجوع کرتے ہیں ۔امیرالمؤمنین حضرت علی علیہ السلا م ''مالک اشتر'' کے نام لکھے گئے ایک حکم نامہ میں فیصلہ کے بارے میں فرماتے ہیں '': لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے کے لئے ایک ایسے شخص کا انتخاب کرنا جو دعویٰ دائر کرنے والوں کے رجوع کرنے سے تھک کر دل تنگ نہ ہو جائے اور کاموں کی رسیدگی میں مکمل طور پر صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتا ہو اور امور کے بارے میں فیصلہ دینا اس کے لئے مشکل نہ ہو ۔

دعوی ،کرنے والے اسے خوار اور حقیر نہ سمجھیں امور کے مشکلات کے بارے میں تحقیقات اوردقت کرے اور کسی کام کو سر سری طور پر انجام نہ دے ،اگر کیس اس کے لئے واضح ہے تو لوگوں کی چاپلوسی ،دھمکی اور طمع و لالچ دلانے کے اثر میں نہ آئے اور حکم الہیٰ کو کسی شک وشبہہ کے بغیر اظہار کر کے نافذ کرے اور لوگوں کے مال پر طمع کرنے سے پرہیز کرے ،چونکہ اس قسم کے لوگ کم پائے جاتے ہیں اسلئے ان کی اہم اور سنجیدہ ذمہ داری کے پیش نظر مناسب تنخواہ معین کرے تاکہ وہ اپنی آبرومند انہ زندگی میں دوسروں کے محتاج نہ رہیں اور رشوت لینے کے لئے کوئی بہانہ باقی نہ رہے اور انھیں فیصلہ سنانے کی آزادی دینا تاکہ دوسروں کی بد گوئی اور چالبازیوں سے محفوظ رہیں ۔''

گواہی

مرداور عورت کی گواہی

جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا کہ استدلال کی قدرت مرد میں اورجذبات کی قدرت عورت میں زیادہ ہوتی ہے،اس لئے اسلام میں دوعورتوں کی شہادت ایک مرد کی شہادت کے برابرہے ۔خدائے متعال اپنے کلام پاک میں فرماتا ہے: (...واستشهدوا شهیدین من رجالکم فان لم یکونا رجلین فرجل وأمراتان ممن ترضون من الشّهداء ان تضلّ احدٰ هما فتذکر احدٰهما الاخریٰ...)[1]... ''اوراپنے مردوں میں سے دوگواہ بناؤ اوردومرد نہ ہوں توایک مرداوردوعورتیں تاکہ ایک بھکنے لگے تودوسری یاددلادے ۔ ''

گواہی کے کلیات

تنہا وہ عام راستہ کہ جس کے ذریعہ تمام حالات میں حوادث پر قابو پایاجاسکتا ہے،گواہی کو برداشت کرنا اور اس کو انجام دیناہے اور دوسرے وسائل جیسے ''لکھنا''اور ''فنی وسائل''جو حوادث کو ضبط کرنے اور شکل و اعتراف کو استحکام بخشنے کے لئے فراہم کئے گئے ہیں،عام نہیں ہیں اور انسان کے اختیار میں نہیں ہیں۔اس لئے،اسلام نے اس بہت سادہ اور طبیعی وسیلہ کو اہمیت دی ہے اورحکم دیاہے کہ لوگ اس راستہ سے حوادث پر قابو حاصل کریں اور ضرورت کے وقت گواہی دیں۔

گواہ کی شرائط

۱۔ بالغ ہو،اس بناپر نابالغ بچے کی گواہی قبول نہیں ہے، صرف جو بچہ دس سال کی عمر تک پہنچاہو،اگر اس نے گناہ نہ کیا ہو،تو وہ زخم لگانے کے بارے میں گواہی دے سکتا ہے۔

۲۔ دیوانہ او راحمق نہ ہو۔

---

[1] بقرہ،۲۸۲

۳۔ مسلمان ہو، لیکن اگر وصیت کرتے وقت مسلمان گواہ تک رسائی ممکن نہ ہو تو کافر ذمی (اہل کتاب جو اسلام کی پناہ میں ہو) کی گواہی قابل قبول ہے۔

۴۔ عادل ہو، پس فاسق اور جھوٹی گواہی دینے والے کی گواہی قبول نہیں ہے مگر یہ کہ وہ توبہ کرکے اس پر ثابت قدم رہے۔

۵۔ حلال زادہ ہو، اس لحاظ سے حرام زادہ کی گواہی قابل قبول نہیں ہے۔

٦۔ اس پر الزام نہ ہو، اس بنا پر اس شخص کی گواہی پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا ہے جو دعوے کے موضوع میں غرضمند ہو۔

۷۔ یقین رکھتا ہو، اس بنا پر جو حدس و یقین حس کے طریقہ سے حاصل نہ ہوا ہو، اس پر گواہی نہیں دی جا سکتی ہے اور اگر جھوٹی گواہی کی وجہ سے کسی کے نقصان میں کوئی حکم جاری ہوا ہو، تو گواہ ضامن ہے اور اس کی تنبیہ کی جانی چاہئے اور اس کے جھوٹ کو بھی لوگوں میں اعلان کرنا چاہئے۔

اقرار

اقرار کی اہمیت: معاشرے میں پامال اور ضائع ہونے والے حقوق کو زندہ کرنے کے بارے میں ''اقرار'' کی اہمیت محتاج بیان نہیں ہے۔ کیونکہ عدلیہ جس کا کام انتہایی تلاش و کوشش، دلائل کو جمع کرنے کے لئے محنت و مشقت، قرائن، گواہوں کی گواہی اور حدس واندازہ سے انجام دیتی ہے، اسے ''اقرار'' کے ذریعہ آسان ترین اور واضح ترین صورت میں دو جملوں میں انجام دیا جاتا ہے۔

اسلام میں انفرادی نقطہ نظر سے بھی اقرار کی بہت اہمیت ہے، کیونکہ اقرار کا سرچشمہ وہ فطرت ہے کہ اسلام کی تمام سعی و کوشش اس کو زندہ کرنے اور اسے عملی جامہ پہنانے میں صرف ہوتی ہے اور وہ ایک ایسے انسان کی حق پرستی کی فطرت ہے جس کے مقابلہ میں ہوا و ہوس پرستی قرار پائی ہے۔

خدائے متعال اپنے کلام پاک میں پیروان اسلام سے مخاطب ہو کر فرماتا ہے: (یا ایہا الذین آمنوا کونوا قوّامین بالقسط شہداء للہ و لو علی انفسکم او الوالدین و الاقربین[1]) ''اے ایمان والو! عدل و انصاف کے ساتھ قیام کرو اور اللہ کے لئے گواہ بنو چاہے اپنی ذات یا اپنے والدین اور اقربا ہی کے خلاف کیوں نہ ہو''۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں '': حق بات کہو اگرچہ اپنے نقصان میں ہو[2]۔''

اقرار کے معنی اور اس کی شرائط

''اقرار'' شرع و شریعت میں ایک ایسا قول ہے کہ کہنے والا دوسرے کا حق اپنے اوپر ثابت کرتا ہے، جیسے کہتا ہے: ''میں ایک ہزار روپئے کا فلاں شخص کا مقروض ہوں''۔ اقرار کرنے والے کے لئے بالغ، عاقل اور صاحب اختیار ہونا شرط ہے، اس بناء پر بچہ، دیوانہ، مست، بیہوش، سوئے ہوئے اور مجبور شخص کا اقرار صحیح نہیں ہے۔

شفعہ

اگر دو آدمی، دو گھر یا کسی اور ملکیت کے مشترک مالک ہوں اور ان میں سے ایک اپنے حصہ کو کسی تیسرے شخص کے ہاتھ بیچ دے، تو اس کا دوسرا شریک حق رکھتا ہے کہ اسی عقد اور اسی قیمت پر اس کے حصہ کو لے لے، اس حق کو ''شفعہ'' کہتے ہیں۔ واضح ہے کہ اسلام میں یہ حق کمپنیوں کے تسویہ اور شرکاء کے تصرفات کی وجہ سے رونما ہونے والے نقصانات اور خرابیوں کو دور کرنے کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ اکثر یہ اتفاق پیش آتا ہے کہ ملکیت میں تازہ شریک کے تسلط سے صاحب شفعہ کو نقصان پہنچتا ہے، یا سلیقوں میں اختلاف کی وجہ سے اختلافات اور کشیدگیوں کا ایک سلسلہ وجود میں آتا ہے، یا مالکیت میں آزادی (صاحب شفعہ) شریک کے لئے وئی فائدہ رکھتی ہو بغیر اس کے کہ بیچنے والے شریک کے لئے کوئی نقصان ہو۔

شفعہ، زمین، گھر، باغ اور دیگر غیر منقولہ اموال کے لئے ثابت ہے اور منقولہ اموال میں شفعہ نہیں ہے۔

---

[1] نساء، ١٣٥
[2] میزان الحکمۃ، ج ٢، ص ٤٦٨۔

مرد اور عورت کا طبقہ

خالق کائنات نے نوع بشر کو دوسرے جاندار مخلوقات کے مانند نر و مادہ میں تقسیم کیا ہے اور اس طرح اس نوع کی بقاء کا تنہا ضامن تناسل و توالد کا سلسلہ جاری رکھا ہے ۔ مرد اور عورت،اس کے باوجود کہ نسل پھیلانے کے لئے دو مختلف نظاموں سے مسلح ہیں،ان میں سے ہرایک،ایک انسان کی مکمل فطری توانائیاں رکھتا ہے اور یہ انسان کی ذاتی خصوصیتوں میں بھی برابر ہیں۔ان دونوں صنفوں کی تنہا خصوصیت جو سماج میں جداگانہ امتیازات کا سرچشمہ ہوسکتی ہے ، وہ یہ ہے کہ :مرد کی صنف میں غور و خوض کی خاصیت زیادہ قوی ہوتی ہے اور عورت کی صنف میں جذبات اور ہمدردیاں زیادہ ہوتی ہیں ۔اورانہی خصوصیات کی وجہ سے،معاشرے میں ان دونوں میں سے ہر ایک نے مخصوص فرائض کو اپنے ذمہ لیکر معاشرہ کو چلاتے ہیں ۔اگر یہ اپنی ذمہ داریوں سے ہاتھ کھینچ لیں تو معاشرہ ٹھپ ہوکر رہ جائے گا ۔

اسلام نے جواحکام ان دو صنفوں کے لئے وضع کئے ہیں،ان میں کلی طورپر ہرایک کی صفتوں اور خصوصیتوں کو مد نظر رکھا گیا ہے اور مشترک قوانین میں اسی نوعی اشتراک کومد نظر رکھ کران دونوں صنفوں کو حتی الامکان نزدیک لایا گیاہے ۔یہ جاننے کے لئے کہ اسلام نے اپنی حقیقت بینی کی بناپر ،ان دوصنفوں کے اختلافات کو دور کرنے کے لئے کیسے موثر قدم اٹھائے ہیں اوربالخصوص عورتوں کے حالات میں بہتری اورآسودگی لانے کے لئے کیسے قوانین بنائے ہیں، ہمیں اسلام سے قبل عورتوں کے عام حالات سے آگاہ ہونا چاہئے اور اس سلسلہ میں ایک تحقیق کریں اور ماضی کے ترقی یافتہ اورغیر ترقی یافتہ معاشروں میں جو برتاؤ عورتوں کے ساتھ ہوتا تھا اسے مد نظر رکھیں پھر عورتوں کے بارے میں اسلام کے وضع کئے گئے قوانین کی تحقیق کریں ۔

اسلام سے پہلے معاشرے میں عورت

الف:قبائلی معاشرے میں عورت قدیم ملتوں میں جب ان کا طرز زندگی قانونی یادینی نہیں تھا اورصرف قومی آداب ورسوم کے مطابق زندگی بسر کرتے تھے،توعورت،انسان شمار نہیں ہوتی تھی بلکہ اس کے ساتھ ایک پالتوجانور جیسا سلوک کیا جاتا تھا ۔انسان جب

آغاز سے پالتو جانوروں کو یکے بعد دیگرے اپنا اسیر بنا کر ان کی تعلیم و تربیت کرتا تھا ،ان کی حفاظت اور ان کی زندگی کے لئے بے پناہ محنت کرتا اور رنج و تکلیف اٹھاتا تھا،تو یہ سب اسلئے نہیں تھا کہ انھیں انسانیت کی حیثیت سے پہچانے یا انھیں اپنے معاشرے کا ایک عضو قرار دے اور ان کے لئے کچھ حقوق کا قائل ہو جائے بلکہ وہ ان کے گوشت ،کھال ،اون ،دودھ، سواری، سامان ڈھونے اور دیگر فوائد سے بہرہ مند ہونے کے لئے تھا ۔اس لئے ان جانوروں کی بقاء اور زندگی کے لئے ،کچھ وسائل جیسے خوراک اور رہائش وغیرہ فراہم کرتا تھا ،لیکن یہ محنت و مشقت ان کے ساتھ ہمدردی کی بنا پر نہیں ہوتی تھی بلکہ اپنے فائدے کے لئے ہوتی تھی۔

انسان ان جانوروں کا دفاع کرتا تھا اور اجازت نہیں دیتا تھا کہ کوئی انھیں مار ڈالے یا انھیں اذیت پہنچائے اور اگر کوئی ان پر تجاوز کرتا،تو وہ اس سے انتقام لیتا تھا ،لیکن یہ سب اس لئے تھا کہ خود کو ان کا مالک جانتا تھا اور اپنے حقوق کی حفاظت کرنا چاہتا تھا نہ یہ کہ ان حیوانات کے لئے کسی حق کا قائل تھا ۔ عورت کو بھی اسی طرح اپنے استفادہ کے لئے چاہتا تھا ۔عورت کی معاشرے میں رکھوالی کرتا تھا اور اس کا دفاع کرتا تھا ،جو اس پر تجاوز کرتا اسے سزا دی جاتی تھی،

لیکن نہ اس لئے کہ وہ انسان ہے یا معاشرے کا عضو شمار ہوتی ہے یا کسی حق و احترام کی حقدار ہے ،بلکہ اس لئے کہ زندہ رہے اور مرد کے جنسی خواہشات کا کھلونا بنی رہے اور اہل خانہ یعنی مردوں کے لئے کھانا پکائے اور تیار کرے ،ساحل نشین قوموں کے لئے مچھلی پکڑے،سامان ڈھوئے،گھر کا کام کرے اور ضرورت کے وقت بالخصوص قحط سالی اور مہمان نوازی کے موقع پر اس کے گوشت سے غذا تیار کی جائے ۔باپ کے گھر میں بھی عورت کی یہی حالت تھی یہاں تک کہ اسے شوہر کے حوالہ کیا جاتا تھا ،لیکن نہ اسکے اپنے اختیار و انتخاب سے،بلکہ ماں باپ کے حکم سے وہ بھی ایک قسم کا بیچنا تھا نہ کہ ازدواج عہد و پیمان۔عورت،باپ کے گھر میں،باپ کے ماتحت اور شوہر کے گھر میں،شوہر کے ماتحت اور اس کی تابع ہوتی تھی اور ہر حالت میں صاحب خانہ کے زیر نظر اور اسکی مرضی کے مطابق زندگی گزارتی تھی ۔صاحب خانہ اسے بیچ سکتا تھا یا اسے کسی کو بخش سکتا تھا یا دوسرے مقاصد کے لئے جیسے عیاشی یا بچہ پیدا کرنے یا خدمت کرنے کے لئے عاریت،قرض یا کرایہ پر دوسروں کو دے سکتا تھا اگر اس سے کبھی کوئی غلطی سرزد ہوتی تو اسے ہر

طرح کی سزا دینے کا حق تھا،یہاں تک کہ قتل تک کر سکتا تھا،اوراس کے بارے میں کسی بھی قسم کی ذمہ داری کا احساس نہیں ہوتا تھا

۔

ب ۔ عورت،ترقی یافتہ سلطنتی معاشرے میں:ترقی یافتہ سلطنتی معاشرہ،جیسے،ایران،مصر،ہندوستان اور چین کہ جو وقت کے بادشاہوں کی مرضی پر چلتا تھا اوراسی طرح متمدن معاشرہ جیسے کلدہ ،روم اور یونان جہاں کے لوگ قانونی حکومت کی زندگی بسر کرتے تھے،اگر چہ عورت کی حالت دوسرے معاشروں سے بہتر تھی اور کلی طورپرمالکیت سے محروم قرار نہیں دی جاتی تھی ،لیکن پھر بھی مکمل آزادی نہیں رکھتی تھی جس گھر میں عورت زندگی گزارتی تھی اس کا سر پرست جیسے باپ ، بڑا بھائی یاشوہر اس پر مطلق حکومت کرتا تھا ۔یعنی اسے حق ہوتا تھا کہ جس کے ساتھ چاہے اس کا عقد کرے یاعاریت و کرایہ پر دیدے یاکسی کو بخش دے اورخاص کر (خطاسرزدہونے پر) اسے قتل کرسکتا تھا یاگھر سے نکال سکتا تھا ۔

بعض ملکوں میں عورت فطری رشتہ داری سے محروم تھی اورمرداپنی محرم عورتوں سے شادی کرسکتا تھا۔ بعض دوسرے ممالک میں ،عورت باضابطہ اورقانونی رشتہ دار شمار نہیں ہوتی تھی،اور میراث کی حقدار نہیں ہوتی تھی ۔

بعض جگہوں پر کئی مرد ایک عورت سے شادی کرتے تھے اورزمانہ جاہلیت میں بعض عرب قومیں اپنی بیٹیوں کوزندہ دفنا تے تھے ،عورت کو منحوس جانتے تھے ۔اگر اس پر کوئی زیادتی اور ظلم ہوتا تواسے عدالت میں جاکر شکایت کرنے اوراپنادفاع کرنے کا حق نہیں تھا اوراسے گواہی دینے کا حق بھی نہیں تھا ۔خلاصہ یہ کہ اس معاشرے میں عورت ایک کمزور عضوشمار ہوتی تھی جسے مرد کی سرپرستی میں زندگی بسر کرنا ہوتی تھی ۔اسے ہرگز اپنے ارادہ سے فیصلہ کرنے ،کام اورپیشہ کے انتخاب میں آزادی نہیں تھی ۔بلکہ ایک چھوٹے بچے کے مانند تھی جسے بالغ ہونے تک کسی کی سرپرستی میں زندگی بسر کرنا پڑتی ہے فرق صرف یہ تھا کہ یہ عورت کبھی بالغ نہیں ہوتی تھی !عورت ایک جنگی اسیر کے مانند تھی کہ جب تک آزاد نہ ہوجائے دشمن کی غلامی میں رہتا ہے اور اس کے کام

وکوشش سے استفادہ کیا جاتا ہے،اس کے مکروفریب سے ہوشیار رہتے ہیں،فرق یہ تھا کہ عورت کو اس اسیری سے آزاد ہونے کی کبھی امید نہیں ہوتی تھی ۔

ج:عورت دینی معاشرہ میں: دینی معاشروں میں بھی عورت پر جو کچھ دوسرے معاشروں میں گزرتی تھی۔کوئی خاص فرق نہیں ہوتا تھا اوراس کے لئے کسی قسم کے حق کے قائل نہ تھے ۔ یہودیوں کی موجودہ توریت نے عورت کوموت سے زیادہ تلخ بتایاہے اور کمال سے مایوس شمار کیا ہے ۔رسول گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے پہلے،فرانس میں عیسائی پادریوں کا ایک اجتماع منعقد ہوا،جس میں عیسائی پادریوں نے عورتوں کی حالت پر مفصل بحث و تحقیق کے بعد حکم صادرکیا کہ'' : عورت ایک انسان ہے لیکن مرد کی خدمت کے لئےپیدا کی گئی ہے ۔ ''!ان تمام معاشروں میں،اولادباپ کی تابع ہوتی تھی نہ ماں کی اوران کے نسب کی بنیاد باپ سے تشکیل پاتی تھی نہ ماں سے ،صرف چین اورہندوستان کی چند جگہوں پرکئی شوہر کرنے کارواج تھا،بچے ماں کے تابع ہوتے تھے اوران کے نسب کی بنیاد مائیں تشکیل دیتی تھیں ۔

خلاصہ

اسلام سے پہلےپوری دنیا میں تاریخ کے مختلف ادوار میں انسانی معاشروں میں، عورت کو معاشرے کاایک سرگرم عضوشمار نہیں کیا جاتا تھا اور وہ استقلال وآزادی کی مستحق نہیں تھی اور ہمیشہ ایک کمزوراور محکوم مخلوق شمار ہوتی تھی اور وہ خود بھی زمانہ کے گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنی انسانی خصلتوں کو کھوکرکے اپنے لئے کسی قسم کی اجتماعی شخصیت کو تصور نہیں کرسکتی تھی ۔

لفظ ''عورت'' ذلت،خواری پستی اور بیوقوفی کے معنی دیتا تھا ۔ہرزبان کے ادبیات کے نظم ونثر میں عورت کے بارے میں بہت سی ناشایستہ باتیں اور خرافات پائے جاتے ہیں جو ماضی کے معاشروں میں عورت کے بارے میں روارکھے جانے والے نظریہ کی عکاسی کرتے ہیں ۔

عورت کے بارے میں اسلام کا نظریہ

جس دن اسلام کا سورج بشریت کے افق پر طلوع ہوا ، اس وقت عورت کی سماجی حالت وہی تھی جو خلاصہ کے طور پر بیان کی گئی ۔ اس زمانہ کی دنیا میں عورت کے بارے میں چند غلط اور خرافات پر مشتمل افکار اور ظالمانہ طرز عمل کے علاوہ کچھ نہیں تھا ۔لوگ (حتی خود عورت کا طبقہ)عورت کے لئے کسی مقام یا حق کے قائل نہیں تھے اوراسے ایک پست مخلوق سمجھتے تھے جو شریف انسان (مرد)کی خدمت کے لئے پیدا کی گئی ہے ۔اسلام نے پوری طاقت کے ساتھ ان افکار کی مخالفت کی اور عورت کے لئے حسب ذیل حقوق مقرر فرمائے : ا۔عورت ایک حقیقی انسان ہے اورانسان کے نرومادہ جوڑے سے پیدا کی گئی ہے اورانسان کی ذاتی خصوصیات کی حامل ہےاورانسانیت کے مفہوم میں مرد کو اس پر کوئی امتیاز حاصل نہیں ہے۔خدائے متعال اپنے کلام پاک میں فرماتا ہے : (یایھا النّاس اِنا خلقنکم من ذکرِوانثی [1]) ''انسانو!ہم نے تم کوایک مرداورایک عورت سے پیدا کیاہے ''۔کئی دوسری آیتوں میں فرماتا ہے : (بعضکم من بعض [2]) ''تم سب ہم جنس ہو ''

٢۔عورت،مرد کے مانند معاشرہ کا عضو ہے اورقانونی شخصیت کی مالک ہے ۔

٣۔عورت چونکہ فطری رشتہ دار ہے اسلئے سرکاری اورقانونی طورپر بھی رشتہ دار ہے ۔

٤۔بیٹی ،اولاد ہے جس طرح بیٹا اولاد ہے، اسلئے بیٹیاں بیٹوں کی طرح اولاد ہیں ،اس لحاظ سے عورت بھی مرد کی طرح اپنے سببی اور نسبی رشتہ داروں جیسے باپ اورماں سے میراث پاتی ہے ۔

٥۔ عورت فکری آزادی کی مالک ہے اوراپنی زندگی میں ہر قسم کا فیصلہ کر سکتی ہے اور شرعی حدود میں اپنی مرضی کے مطابق اپنے لئے شوہر منتخب کر سکتی ہے اور باپ یا شوہرکی ولایت اور سرپرستی میں رہے بغیر آزادی کے ساتھ زندگی گزار سکتی ہے اورہر جائز

---

[1] حجرات،١٣

[2] آل عمران ،١٩٥

پیشہ کو منتخب کر سکتی ہے ۔عورت عمل کے میدان میں مستقل ہے اوراس کا کام اورکوشش محترم ہے اور وہ مالک بن سکتی ہے اوراپنی دولت وثروت کو مرد کی سر پرستی اورمداخلت کے بغیر تصرف کر سکتی ہے اوراپنے انفرادی واجتماعی مال اورحقوق کادفاع کر سکتی ہے اور دوسروں کے حق میں یاخلاف گواہی دے سکتی ہے ۔وہ جنسی آمیزش کے مسئلہ کے علاوہ (جس میں ازدواجی زندگی کے معاہدہ کے مطابق اپنے شوہر کی اطاعت کرنا ضروری ہے)اپنے شوہر کے لئے کوئی دوسرا کام انجام دے تو وہ قابل قدر ہے۔

٦۔مرد کو عورت پر حکم چلانے اور ظلم کرنے کا کوئی حق نہیں ہےاور ہر ظلم جومردوں کے بارے میں مقدمہ چلا کرقابل سزا ہے وہ عورتوں کے بارے میں بھی مقدمہ چلانے اور سزا دینے کے قابل ہے۔

٧۔عورت معنوی دینی شخصیت کی مالک ہے اوراخروی سعادت سے محروم نہیں ہے ،وہ ویسی نہیں ہے جیساکہ اکثرادیان اورمذاہب عورت کوایک شیطان کے مانند،رحمت خداوندی سے مایوس تصور کرتے ہیں ۔ خدائے متعال اپنے پاک کلام میں فرماتا ہے : (من عمل صٰلحاً من ذکر او انثی و ہو مؤمن فلنحیینہٗ حیٰوۃ طیبۃ ولنجزینّھم اجر ہم باَحسنِ ماکانوا یعملون[1]) ''جو شخص بھی نیک عمل کرے گاوہ مرد ہو یاعورت بشرطیکہ صاحب ایمان ہو ہم اسے پاکیزہ حیات عطاکریں گے اورانھیں ان اعمال سے بہتر جزادیں گے جو وہ زندگی میں انجام دے رہے ہیں ''(...انّی لااضیع عمَ عامل منکم من ذکر اوانثی[2]...) ''میں تم میں سے کسی بھی عمل کرنے والے کے عمل کوضائع نہیں کروں گا چاہے وہ مرد ہو یاعورت ''...درج ذیل آیہ شریفہ کے مطابق ممکن ہے ایک عورت تقوی اوردین کی بدولت ہزاروں مردوں پرامتیاز اور فوقیت حاصل کرے : (یاَیہا النّاس انا خلقنٰکم من ذکر وانثی و جعلنٰکم شعوباً وقبائل لتعارفوا انّ اکرمکم عند اللّٰہ اتقٰکم[3]...) 'انسانو!ہم نے تم کوایک مرداورایک عورت سے پیدا کیاہے اورپھر تم میں شاخیں اورقبیلے قرار دیئے ہیں

[1] نحل،٩٧
[2] آل عمران ،١٩٥
[3] حجرات ،١٣

تاکہ آپس میں ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ بیشک تم میں سے خدا کے نزدیک زیادہ محترم وہی ہے جوزیادہ پرہیز گار ہے ''...

نکاح

نکاح کے مسائل اوراحکام

اسلامی تعلیمات میں نکاح اورازدواجی زندگی کے موضوع کو کافی اہمیت دی گئی ہے ۔اس کی اہمیت اس حدتک ہے کہ پیغمبراسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں :نکاح میری سنت ہےاور جو بھی میری سنت پر عمل نہ کرے،اسے اپنے آپ کو مجھ سے نسبت نہیں دینی چاہئے اوروہ اپنے آپ کومسلمان شمارنہ کرے[1]۔

نکاح کے احکام

دین اسلام میں نکاح کی دو قسمیں ہیں :۱۔''دائمی نکاح''،یہ وہ نکاح ہے کہ عقد جاری ہونے کے فوراًبعد میاں،بیوی کارشتہ ہمیشہ کے لئے برقرار ہوجاتا ہے۔یہ رشتہ صرف طلاق کے ذریعہ توڑا جاسکتا ہے ۔اس ازدواج میں مرد کو مہر کے علاوہ بیوی کی حیثیت کے مطابق اس کی زندگی کے اخراجات اداکرنے ہوتے ہیں اور کم از کم چار راتوں میں سے ایک رات کو اس کے ساتھ گذارے بیوی اس سلسلہ میں شوہر کے تقاضا کو مسترد نہیں کرسکتی ہے ۔

۲۔موقت نکاح جسے ''متعہ''کہا جاتا ہے ۔یہ نکاح،ایک محدود اور معین مدت کے لئے میاں،بیوی کے درمیاں رابطہ کوپیدا کرتا ہے اورجوں ہی مدت ختم ہوئی یامرد نے باقی مدت کو بخش دیا تو طلاق کے بغیر میاں،بیوی کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے ۔اس ازدواج میں نکاح دائم کے احکام میں سے کوئی حکم نہیں پایا جاتا ہے،مگر یہ کہ عقد کے وقت شرط کی گئی ہو ۔

---

[1] بحارالانوار،ج۱۰۳،ص۲۲۰ح۲۳۔

نوٹ:نکاح موقت ''متعہ'' اسلام میں جائزہے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں رائج تھا ،یہاں تک کہ دوسرے خلیفہ نے بعض وجوہات کی بنا پر اس پرپابندی لگادی ،اس لئے اہل سنت اسے جائز نہیں جانتے ،لیکن شیعوں کے نزدیک جائز ہے اوراسے اسلام کے شاہکاروں میں سے ایک جانتے ہیں ،کیونکہ معاشرے کی ضرورتوں کے ایک اہم حصہ کو۔جس کودوسرے راستہ سے روکنا ممکن نہیں ہے دور کرتا ہے اور عمومی عفت کا بہترین حامی اورضامن ہے ۔ امیرالمؤمنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں'' :اگرموقت نکاح کو ممنوع نہ قرار دیا گیا ہوتا تو شقی اوربد بخت کے علاوہ کوئی زنانہ کرتا''[1]

جن کے ساتھ نکاح کرنا حرام ہے

اسلام میں بعض عورتوں کے ساتھ رشتہ داری اورنسبی رشتہ کی وجہ سے نکاح کرنا حرام اورممنوع ہے، اور وہ حسب ذیل ہیں:

١۔ماں ،دادی،نانی اور جتنا سلسلہ اوپر چلا جائے ۔

٢۔بیٹی،نواسی اورجتنا سلسلہ نیچے چلاجائے۔

٣۔پوتی اورجتنا سلسلہ نیچے چلاجائے۔

٤۔بہن،بھانجی اورجتنا سلسلہ نیچے چلاجائے۔

٥۔ بھتیجی، بھتیجی کی بیٹی اورجتنا سلسلہ نیچے چلا جائے ۔

٦۔پھوپھی

٧۔خالہ

نوٹ: جوعورتیں نسبی رشتہ کی وجہ سے مردپر حرام ہیں وہی عورتیں ایک شیرخوار بچہ کو دودھ پلانے سے حرام ہوجاتی ہیں ۔بعض

[1] وسائل الشیعہ ،ج١٤،ص٤٣٦،باب متعہ ۔

عورتیں سببی رشتہ (دامادی)کی وجہ سے مرد پر حرام ہوجاتی ہیں،وہ حسب ذیل ہیں: ۱۔بیوی کی ماں اور اسکی دادی ونانی اور جتنا سلسلہ اوپر چلا جائے ۔

۲۔بیوی کی بیٹیاں،اگر مرد نے اس بیوی سے ہمبستری کی ہو۔

۳۔باپ کی بیوی،اگرچہ باپ نے اس کے ساتھ ہمبستری بھی نہ کی ہو۔

۴۔ بیٹے کی بیوی،اگرچہ بیٹے نے اس کے ساتھ ہمبستری بھی نہ کی ہو۔

۵۔بیوی کی بہن ۔جب تک بیوی زندہ اور مرد کے عقد میں ہو ۔

۶۔بیوی کی بھتیجی اور بھانجی، جبکہ بیوی سے اجازت نہ لی ہو،لیکن بیوی کی اجازت سے حرام نہیں ہیں ۔بعض عورتیں دوسرے وجوہا ت سے مرد پر حرام ہوجاتی ہیں :

۱۔شادی شدہ عورت۔

۲۔پانچویں عورت،جس مرد کے چار دائمی عقد والی بیویاں ہوں ۔

۳۔کافر عورت،لیکن یہودی اور عیسائی کے مانند اہل کتاب ہو تو اس کے ساتھ موقت عقد کیا جا سکتا ہے ۔

عقد کا ولی

دین اسلام میں، مرد اور عورت اگر بالغ ہوں تو اپنا شریک حیات انتخاب کرنے میں آزاد و مستقل ہیں ۔لیکن نابالغ بیٹی اور بیٹے کے ولی ان کے باپ ہیں،اس معنی میں کہ باپ اپنی نابالغ بیٹی کا عقد کسی لڑکے سے کر سکتا ہے اور اپنے نابالغ بیٹے کا عقد کسی لڑکی سے کر سکتا ہے ۔

اولاد کے حقوق اور تبعیت

۱۔اگر شادی شدہ عورت سے کوئی بچہ پیدا ہو تو یہ بچہ اس کے شوہر کا ہے،چنانچہ وہ بچہ دائمی بیوی ہو تو شوہر اپنا بچہ ہونے سے انکار نہیں کر سکتا ہے۔

۲۔اگر بچہ اپنی زندگی کا خرچ پورا نہ کر سکتا ہو ،تو اسکے ماں باپ کو اس کے اخراجات کو پورا کرنا چاہیئے اور چنانچہ ماں باپ اپنے اخراجات پورے نہ کر سکتے ہوں تو ان کے اخراجات ان کے فرزند کے ذمہ ہیں ۔

اسلام میں متعدد بیویاں

شریعت اسلام کے مسلمات میں سے ہے کہ مرد ایک ساتھ چار بیویاں رکھ سکتا ہے۔ اس حکم کے فلسفہ کو سمجھنے کے لئے درج ذیل نکات پر توجہ کرنا ضروری ہے : ا۔یہ حکم،اختیاری احکام میں سے ہے اور واجبی و حتمی حکم نہیں ہے،یعنی مسلمان مرد پر واجب نہیں ہے کہ چار بیویاں رکھے بلکہ ایک ہی وقت میں دو یا تین یا چار بیویاں رکھ سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ،چونکہ ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے میں شرط یہ ہے کہ ان کے درمیان عدالت کی رعایت کرے اور یہ کام بہت مشکل ہے اور ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے ۔ اس لئے اس کام کے لئے قدم اٹھانا اپنے لئے استثناء حالت پیدا کرنا ہے ۔

۲۔بشر کی ضرورتوں میں سے ایک تناسل و توالد اور آبادی بڑھانا ہے ۔ خالق کائنات نے اسی غرض سے انسان کو مرد اور عورت میں تقسیم کیا ہے.اسلام بھی چونکہ دین فطرت ہے اس لئے اس نے انسان کی ضرورتوں کو مد نظر رکھا ہے اسی لئے ازدواج کا حکم دیا ہے اور چونکہ مرد اور عورت میں تناسل اور توالد صلاحیت کے لحاظ سے ، فرق ہے،اس لئے متعدد شادیاں جائز کی ہیں ۔

اب ہم اختلاف کی علتیں بیان کرتے ہیں : الف: کلی طور پر عورت نو سال کی عمر میں ازدواج کی صلاحیت پیدا کرتی ہے جبکہ مرد کے لئے یہ استعداد پندرہ سال میں پیدا ہوتی ہے۔ نتیجہ کے طور پر اگر ہم کسی معین سال کو مد نظر رکھ کر لڑکے اور لڑکیوں کی ولادت کو

(اکثر لڑکیاں لڑکوں سے زیادہ ہوتی ہیں) درج کریں گے اور بعد والے سالوں کی ولادتوں کو اس پر اضافہ کریں گے تو سولھویں سال ہر لڑکا جوازدواج کی شرعی صلاحیت پیدا کرے گا اس کے مقابلہ میں سات لڑکیاں ازدواج کی صلاحیت پیدا کریں گی ۔اگر لڑکوں کے ازدواج کی عمر جو معمولاً بیس سال سے اوپر ہے، کو مد نظر رکھیں ،تواکیسویں سال میں ہرایک لڑکے کے مقابلہ میں دولڑکیاں شادی کے لائق ہوں گی اور پچیسویں سال میں کہ عام طور پر شادی اسی عمر میں کردی جاتی ہے ۔ ہردس لڑکوں کے مقابلہ میں سولہ لڑکیاں شادی کے لائق ہو جائیں گی ۔ب۔ عورت غالباً پچاس سال کی عمرمیں بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت کھودیتی ہے جبکہ مرداپنی طبیعی عمر کے آخری دنوں تک یہ صلاحیت رکھتا ہے ۔

ج۔اعدادوشمار کے مطابق نوزاد لڑکوں کی موتیں نوزادلڑکیوں سے زیادہ ہوتی ہیں اور عورتوں کی اوسط عمر مردوں کی نسبت زیادہ ہے کیونکہ گوناگوں عوامل کی وجہ سے عورتوں کی نسبت مردوں میں موتیں زیادہ ہوتی ہیں ۔اسی طرح (اعدادوشمار کے مطابق)مرد کی عمرغالباً عورت کی عمرسے کم ہوتی ہے ۔یہی وجہ ہے کہ معاشرہ میں ہمیشہ بیوہ عورتیں ،بیوی کے بغیر مردوں سے زیادہ ہوتی ہیں ۔ اس بات کا بہترین ثبوت یہ ہے کہ اسلامی معاشرے میں متعدد شادیوں کی رسم صدیوں تک باقی تھی اور باوجود اس کے کہ بعض لاابالی اورفاقد عدالت مردوں نے بھی یہ کام انجام دیا ہے ،لیکن کبھی کوئی مشکل یاعورتوں کی کمی کا مسئلہ پیش نہیں آیا ہے ۔ کہتے ہیں:چونکہ متعدد شادیوں کا مسئلہ عورت کی فطرت کے خلاف ہے،چوں کہ اس کے جذبات کو مجروح کرتا ہے یہاں تک کہ بعض اوقات اسے انتقام لینے پر مجبور کرتا ہے اور مرد کی زندگی خطرہ میں پڑجاتی ہے ۔

ایسا سوچنے والوں نے اس حقیقت میں غفلت برتی ہے کیوں کہ مذکورہ مخالفت عادت سے مربوط ہے نہ اسکی فطرت اور طبیعت سے،کیونکہ اگراس کی بنیاد فطرت پر ہوتی تومتعدد شادیوں کا کام عملاً کبھی واقع ہی نہ ہوتا ۔کیونکہ جوعورتیں کسی مرد کی دوسری ،تیسری یا چوتھی،بیوی بنتی ہیں ،وہ عورتوں کے اسی طبقہ سے تعلق رکھتی ہیں جوکہ اپنی مرضی اور رغبت سے شادی شدہ کسی مردسے شادی کرنے پرآمادہ ہوتی ہیں۔

اگر یہ کام انکی فطری اور طبیعی جذبات کے خلاف ہوتا، توہرگزایسی چیز کوقبول نہ کرتیں ،چنانچہ اگرازدواج میں کسی عورت سے یہ شرط کی جائے کہ اسے تنہازندگی گزارنا ہوگی اور کسی سے بات نہیں کرے گی ،توچونکہ یہ کام اسکی فطرت کے خلاف ہے ،اس لئے ہرگز وہ اس شرط کوقبول نہیں کرے گی۔ اسکے علاوہ دین اسلام میں اس مشکل کوحل کرنے کے لئے ایک راستہ موجود ہے ،وہ یہ کہ عورت ازدواج کے وقت،عقدلازم کے ضمن میں شرط رکھ سکتی ہے کہ اس کا شوہردوسری شادی نہ کرے اوراس طرح اس کا سد باب کر سکتی ہے ۔ اولاد کی میراث کا مسئلہ بھی دوسری صورت میں منظم کیا جاسکتا ہے،مثلاً حکومت کو مرد کاوارث قراردیں اورمعاشرے کے فرزندوں اورنوزاد بچوں کی تربیت حکومت کے ذمہ چھوڑکر بچوں کو پرورش گاہ اورنرسریوں میں پالا جائے ۔

اگرچہ یہ طریقہ انسانی معاشروں میں استثنائی طورپر انجام پاتا ہے ،لیکن ایک ناقابل تغیرقانون کی حیثیت سے جاری رہنے کی ہرگز صلاحیت نہیں رکھتا،کیونکہ،یہ طرزعمل، مختصر زمانہ میں ،انسانی جذبات، غمخواری ،مہرومحبت اورقوی خاندانی ہمدردی۔جونسل کی ایجاد کے لئے انسان کا اصلی محرک ہے کونابود کرکے رکھدیتاہے اورنتیجہ کے طورپرنسل بڑھانے کے موضوع کولوگوں میں خاص کرعورتوں میں کہ واقعاً ایام حمل کے دوران ناقابل برداشت تکلیفیں اٹھاتی ہیں ایک بیہودہ عمل دکھاتا ہے اورمہرومحبت والے خاندان کوایک تاریک زندان میں تبدیل کردیتا ہے ۔

ایسے حالات کے رونماہونے کی وجہ سے تناسل وتوالد کاراستہ بالکل بندہوجاتا ہے اورخاندان جوحقیقت میں شہری معاشرہ کو تشکیل دیتاہے نابود ہوکررہ جاتاہے،اورخاندان کی تشکیل اورتناسل وتوالدفنی وسائل اورسیاسی فریب کاریوں کے ذریعہ انجام پاتے ہیں،جیسے بچہ پیداکرنے والوں کے لئے بڑے بڑے انعامات کااعلان کرنایاسخت قوانین نافذ کرناوغیرہ ۔بدیہی ہے کہ اس قسم کی حالت،جوفطرت کے ساتھ سازگار نہیں ہوتی،پائدار نہیں ہے ۔ اس کے علاوہ واضح ہے کہ اس صورت میں ،انسان کی زندگی ایک وحشتناک شکل میں تبدیل ہوکرخشک وبے لذت ہوگی اورحقیقت میں ،انسان کی زندگی کاماحول مویشیوں سے زیادہ پست اوردرندوں کے ماحول سے زیادہ خطرناک ہوگا ۔

طلاق (میاں بیوی کی جدائی): میاں بیوی کے شرعی رابطہ کے ختم ہونے کے بعد، ایک دوسرے سے جدا ہوکر ازدواجی حقوق کے قوانین کی پابندی سے آزاد ہونے کو ''طلاق'' کہتے ہیں ۔ طلاق کا قانون اسلام کا ایک ناقابل انکار امتیاز ہے جو وہ مسیحیت اور چند دیگر ادیان پر رکھتا ہے اور انسانی معاشرے کی ایک ضرورت کو پورا کرتا ہے، کیونکہ بے شمار ایسے مواقع پیش آتے ہیں کہ میاں اور بیوی کے اخلاق آپس میں سازگار نہیں ہوتے اور پیار و محبت کا ماحول ایک میدان جنگ میں تبدیل ہوجاتا ہے اور ان کے درمیان مصالحت ممکن نہیں ہوتی، اس صورت میں اگر میاں بیوی کا رشتہ توڑنے کے قابل نہ ہوتا تو میاں بیوی کو عمر بھر ایک بد بختانہ زندگی گزارنا پڑتی جو کہ در حقیقت ایک شعلہ ور جہنم ہے اور تلخی و محرومیت کے ساتھ نامناسب جسمانی اذیتیں برداشت کرنا پڑتیں اور اس مطلب کی بہترین مثال یہ ہے کہ عیسائی حکومتیں بھی عام ضرورتوں کے پیش نظر آخر کار ''طلاق'' کو قانونی حیثیت دینے پر مجبور ہوئیں ۔

اسلام میں طلاق کا اختیار مرد کو دیا گیا ہے، البتہ اس حکم میں مرد اور عورت کی فطری حالت کو مدنظر رکھا گیا ہے، کیوں کہ اگر طلاق کا اختیار عورت کے ہاتھ میں ہوتا، چونکہ عورت مرد سے زیادہ جذبات کی اسیر ہوتی ہے، اسلئے میاں بیوی کا رابطہ ہمیشہ کمزور پڑتا اور تشکیل پایا ہوا خاندان متزلزل ہوکر آسانی کے ساتھ بکھر جاتا ۔ اسکے باوجود دین اسلام میں ایسی راہیں موجود ہیں کہ عورت بھی طلاق کے حق سے استفادہ کر سکتی ہے، اپنے شوہر سے معاشرت کے ضمن میں دور اندیشی کے پیش نظر عقد نکاح کے وقت شرط رکھے کہ اگر احتمالی مشکلات میں سے کوئی مشکل پیش آئے تو طلاق جاری کرنے کی وکالت کا حق ہوگا یا یہ شرط رکھے کہ اگر شوہر بلا وجہ اسے طلاق دے تو اس پر اس کے مشکلات کو حل کرنے کی ذمہ داری ہوگی ۔ اسلامی شریعت نے اگرچہ طلاق کو قانونی حیثیت دی ہے، لیکن اس کی غیر معمولی اور زبردست مذمت کی ہے اور بہت نصیحت کی ہے کہ اگر مسئلہ اضطرار کی حد تک نہ پہنچے تو مرد اپنی بیوی کو طلاق نہ دے اور ازدواجی رشتہ کو نہ توڑے ۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے'' : خدائے متعال کے نزدیک ناپسند و منفور ترین

چیزوں میں سے ایک طلاق ہے"[1] اسی لئے اسلام میں طلاق کے لئے چند مشکل قوانین وضع کئے گئے ہیں، جیسے طلاق دوعادل افراد کے سامنے انجام پانا چاہئے اوران دنوں میں ہو کہ عورت اپنی عادت کے ایام میں نہ ہواور مردنے ان دنوں اس سے ہمبستری نہ کی ہو۔ اسی طرح مقرر ہوا ہے کہ اگر طرفین کے درمیان کوئی اختلاف یانزاع پیدا ہوجائے تودوافراد کوحکم قرار دیں تاکہ میاں بیوی کے درمیان مصالحت کرائیں اورصرف اس صورت میں طلاق دی جائے کہ جب مصالحت کی تمام کوششیں نا کام ہوجائیں ۔

طلاق صحیح ہونے کی شرائط

اپنی بیوی کو طلاق دینے والے مرد میں درج ذیل شرائط ہونی چاہئیے :

۱۔بالغ ہو۔

۲۔عاقل ہو ۔

۳۔اپنی اختیار سے طلاق دے ۔

۴۔طلاق دینے کا قصد رکھتا ہو ۔ اس بنا پر نابالغ،دیوانہ یاطلاق دینے پر مجبور شخص یامذاق میں صیغۂ طلاق پڑھنے والے کا طلاق صحیح نہیں ہے ۔

۵۔طلاق کے وقت،عورت خون حیض کوسے پاک ہونا چاہئے اور پاک ہونے کے بعد شوہر نے اس کے ساتھ ہم بستری نہ کی ہو ۔

۶۔طلاق اپنے مخصوص صیغوں میں پڑھا جائے اوردو عادل کے سامنے انجام پائے ۔

---

[1] وسائل الشیعہ ،ج۱۵ ص۲۶۶ باب ۔

طلاق کی قسمیں

طلاق کی دو قسمیں ہیں : ا۔طلاق رجعی :یہ وہ طلاق ہے کہ مرد اپنی اس بیوی کو طلاق دے کہ جس کے ساتھ ہم بستری کی ہو ۔اس صورت میں مرد طلاق کا عدہ تمام ہونے سے پہلے رجوع کرکے نئے عقد کے بغیر ازدواجی رابطہ کو پھرسے بر قرار کرسکتا ہے ۔

۲۔طلاق بائن :یہ وہ طلاق ہے،کہ جس میں طلاق جاری ہونے کے بعد مرد رجوع کرنے کا حق نہیں رکھتا ہے ۔اس کی چند قسمیں ہیں :الف:عورت کے ساتھ مرد کے ہمبستری ہونے سے پہلے دیا جانے والا طلاق ۔ ب:یائسہ عورت کی طلاق یعنی وہ عورت جس میں بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت موجود نہ ہو ۔

ج:اس عورت کی طلاق جس کی عمر ابھی نو سال تمام نہ ہوئی ہو ۔ مذکورہ تین قسم کے طلاقوں میں عدہ نہیں ہے ۔

د :اس عورت کی طلاق جس کو تین مرتبہ طلاق دی گئی ہو۔اس طلاق میں اس کے علاوہ کہ مرد رجوع نہیں کرسکتا ہے،اسے پھرسے اپنے عقد میں بھی نہیں لاسکتا ہے مگر یہ کہ یہ عورت کسی دوسرے مرد کے عقد دائمی میں آجائے اوراس سے ہم بستری کی جائے پھر وہ مرد اسے طلاق دیدے یا مرجائے تو اس صورت میں عدہ تمام ہونے کے بعد پہلا شوہر اس کے ساتھ پھرسے عقد کرسکتا ہے۔

ھ ۔طلاق خلع:اس عورت کی طلاق جو اپنے شوہر کو پسند نہیں کرتی ہے اوراپنا مہر یا کوئی اورمال اسے بخش کر اس سے طلاق حاصل کرے ،اس کو ''خلع'' کہتے ہیں ۔اس طلاق میں جب تک بیوی اپنے شوہر کو بخش دئے گئے مال کا مطالبہ نہ کرے ،اس وقت تک مرد رجوع نہیں کرسکتا ہے ۔طلاق مبارات:یہ وہ طلاق ہے کہ میاں بیوی ایک دوسرے کو نہ چاہتے ہوں اور بیوی مرد کو کچھ مال دے اوراس کے مقابلہ میں وہ اسے طلاق دے ۔اس طلاق میں بھی جب تک بیوی اپنے اداکئے ہوئے مال کا مطالبہ نہ کرے،مرد رجوع کرنے کا حق نہیں رکھتا ہے ۔

ز ۔نواں طلاق:ان شرائط کے ساتھ جو فقہ کی کتابوں میں تفصیل سے بیان ہوئے ہیں،اس طلاق کے بعد عورت مرد پر ہمیشہ کے لئے حرام ہوجاتی ہے اور کسی صورت میں اس کے ساتھ دوبارہ ازدواجی رشتہ برقرار نہیں کرسکتا ہے ۔

عدت کے احکام اور اس کی قسمیں

جس عورت نے اپنے شوہر کے ساتھ ہم بستری کی ہو اور ازدواج کے رشتہ کو مستحکم کیا ہو،اگر اس کا شوہر اسے طلاق دیدے ،تو اسے ایک معین مدت تک عدہ رکھنا چاہئے،یعنی اس مدت میں ازدواج کرنے سے پرہیز کرے ۔اس کام کے دو اہم نتائج ہیں :

اول یہ کہ:نطفوں کے مخلوط ہونے سے بچایا جاسکتا ہے ۔

دوسرے یہ کہ:ممکن ہے اس مدت کے دوران میاں،بیوی اپنی جدائی سے پشیمان ہوکر رجوع کریں ۔عدہ کی مدت کے دوران مرد کو بیوی کے اخراجات کو اداکرنا چاہئے اور اسے اپنے گھر سے نہ نکالے ۔اوراگریہ چوتھی بیوی تھی تو عدہ تمام ہونے تک دوسری عورت سے عقد نہ کرے ۔اگر طلاق مرد کی مہلک بیماری کے دوران انجام پائے تو اس کے ایک سال کے اندر مرنے کی صورت میں،بیوی اس کے ترکہ سے میراث لینے کی حقدار ہے ۔

عدت کی قسمیں عدہ کی تین قسمیں : ا۔حاملہ عورت کا عدہ

۲۔غیر حاملہ عورت کا عدہ

۳۔عدہ وفات

ان کی تفصیل حسب ذیل ہے : ا۔اگر حاملہ عورت کو طلاق دی جائے تواس کا عدہ بچہ کی پیدائش یا اسکے ساقط ہونے تک ہے۔اس بناپر اگر طلاق دینے کے ایک گھنٹہ بعد اسکا بچہ پیدا ہو جائے تو وہ دوسرا شوہر کرسکتی ہے۔

۲۔جو عورت حاملہ نہ ہو اور اس کی عمر پورے نو سال ہو یا یائسہ نہ ہو،جبکہ اس کے شوہر نے اس کے ساتھ ہم بستری کی ہو اور حیض کے علاوہ دنوں میں طلاق دی ہو تو اسے اتنا انتظار کرنا چاہئے کہ دوبار حیض دیکھے اور پاک ہو جائے اور جوں ہی تیسرے حیض کو دیکھے گی اس کا عدہ تمام ہو جائے گا۔

۳۔جس عورت کا شوہر مر جائے اور وہ حاملہ نہ ہو تو اسے چار مہینے دس دن عدہ رکھنا چاہئے۔اگر حاملہ ہو تو اسے بچے کی پیدائش تک عدہ رکھنا چاہئے لیکن اگر چار مہینے دس دن گزرنے سے پہلے، بچہ پیدا ہو جائے تو اسے اپنے شوہر کے مرنے کے دن سے چار مہینے دس دن تک انتظار کرنا چاہئے اور اسے ''عدہ وفات'' کہتے ہیں۔

اسلام میں غلامی

شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ جب سے انسان پیدا ہوا ہے یہ فکر اس کے ہمراہ تھی کہ انسان کو بھی دوسری اشیاء کے مانند اپنی ملکیت قرار دے سکتا ہے۔ قدیم مصر،ہندوستان،ایران،عربستان،روم،یونان،یورپ اور امریکہ کے تمام ممالک میں غلام بنانے کا رواج تھا اور یہ رواج یہودیوں اور عیسائیوں میں بھی عام تھا اسلام نے بھی اس میں کچھ تبدیلیاں لاکر اسے جائز قرار دیا ہے۔

برطانیہ کی حکومت پہلی حکومت تھی جس نے غلامی کی روش کی مخالفت کی اور ۱۸۳۳ء میں سرکاری طور پر غلامی کے طرز عمل کو منسوخ کیا۔اسکے بعد یکے بعد دیگرے دوسرے ممالک نے بھی اس روش کی پیروی کی۔یہاں تک کہ سنہ ۱۸۹۰ء میں 'بروکسل'' میں منعقد ایک میٹنگ میں ایک عمومی قانون کی حیثیت سے غلامی ممنوع قرار دی گئی اور اس طرح دنیا سے غلام کی خرید و فروخت ختم ہو گئی۔

غلام بنانے کے طریقے: ایسا لگتا ہے کہ یہ قدیم رسم انسان میں من مانی اور بے حساب رائج نہیں تھی کہ جو بھی چاہتا کسی دوسرے کو اپنی ملکیت میں لے لیتا ،بلکہ غلامی مندرجہ ذیل راہوں میں سے کسی ایک راہ سے انجام پاتی تھی :۱۔جنگ وفتح:قدیم الایام سے

اگر دو جانی دشمنوں میں سے ایک،دوسرے پر فتح پاکر بعض افراد کو اسیر بناتا تھا ،تو وہ ان جنگی اسیروں کے لئے کسی انسانی احترام کا قائل نہیں ہوتا تھابلکہ اپنے لئے ان کے ساتھ ہر طرح کا برتاؤ کرنے کا حق سمجھتا تھا ۔یعنی قتل کرڈالے یا بخش دے یاآزاد کرے یا غلاموں کی حیثیت سے اپنے پاس رکھے اور ان سے استفادہ کرے ۔

۲۔تولید وتربیت :خاندان کے باپ،خاندان کے سر پرست ہوتے تھے اور اپنی اولاد کو اجتماعی شخصیت کے مالک نہیں جانتے تھے بلکہ انھیں خاندان کے تابع اور محض اپنی ملکیت سمجھتے تھے اور خود کو ان کے بارے میں ہر قسم کا فیصلہ کرنے کا مستحق سمجھتے تھے ۔اس لحاظ سے ضرورت کے وقت اپنی اولاد کو بیچ دیتے تھے اوراسی اصل کی بنیاد پر کبھی عورتوں کو بھی بیچ دیتے تھے ۔

۳۔طاقت ور لوگ جواپنے آپ کودوسروں سے بلند سمجھتے تھے :ایسے افراداپنے حکم کولوگوں کانظم ونسق چلانے میں نافذ العمل جانتے ہوئے انھیں اپنا غلام شمار کرتے تھے ۔یہاں تک کہ بہت سے قدرتمند بادشاہ اپنے کو خدائی کے قابل جان کر لوگوں کواپنی پرستش کرنے پر مجبور کرتے تھے ،یہ افراد لوگوں کو اپنا غلام بنانے میں مطلق العنان تھے اوراپنے ماتحتوں میں سے جس کو بھی چاہتے،اسے اپنا غلام بناتے تھے۔

غلامی کے بارے میں اسلام کا نظریہ

سلام نے اپنی اولاد اور عورتوں کوبیچنے کے ذریعہ اورزبردستی اورغنڈہ گردی کے ذریعہ غلام بنانے سے منع کیا ہے ۔اسلام کی نظرمیں ہرانسان جوانسانیت کے راستہ پرگامزن ہے اورکم ازکم انسانیت کے اصول کا دشمن نہ ہو،وہ آزاد ہے اور کوئی شخص اسے اپنا غلام نہیں بنا سکتا ۔لیکن جوانسانیت کا جانی دشمن ہے اور جان بوجھ کر انسانیت کے اصول کے سامنے تسلیم نہیں ہوتا ہے اوراپنی پوری طاقت سے اسے نابود کرنے پر تلا ہوا ہے ،وہ ہرگز انسانی احترام کا مستحق نہیں ہے اوراسے اپنے ارادہ وعمل میں آزاد نہیں ہونا چاہئے اورغلامی اس کے سواکچھ نہیں ہے کہ انسان کے عمل وارادہ کی آزادی اس سے سلب کی جائے اوردوسرے کا ارادہ اس

پر حکومت کرے اسی عالمی اصول پر جو ہمیشہ دنیا والوں کی طرف سے مورد تائید قرار پایا ہے کفار حربی سے لئے گئے جنگی اسیروں کو غلامی یعنی انھیں ارادہ و عمل کی آزادی سلب کرنے کی سزا دیتا ہے کیونکہ وہ انسانیت کے حقیقی دشمن ہیں۔اسلام جو سلوک جنگی اسیروں کے ساتھ روا رکھتا تھا ،وہ وہی سلوک ہے جسے دوسرے بھی روا رکھتے ہیں ۔جب کوئی ملت جنگ کے بعد فاتح ملت کے سامنے کسی قید وشرط کے بغیر ہتھیار ڈالتی ہے ،تو جب تک ان کے درمیان باقاعدہ صلح بر قرار نہ ہو تب تک اسے ارادہ و عمل کی آزادی سے محروم کرنے کی سزادی جاتی ہے ۔ان ملتوں کا اسلام کے ساتھ جوتنہا اختلاف ہے،وہ یہ ہے کہ اسلام اسے ''غلامی'' کے نام پر یاد کرتا ہے اور یہ قومیں اس لفظ کو استعمال کرنے سے پہلوتہی کرتی ہیں ۔البتہ جس روش کووہ زندہ اور معاشرے کے لئے راہنما جانتے ہیں اپنی تعلیمات کی بنیاد کو نام گزاری کی بنیاد پر استوار نہیں کرنا چاہئے ۔

اسلام اور دوسرے نظریات کی تحقیق

گزشتہ بحث سے معلوم ہوتا ہے کہ غلامی کو منسوخ کرنے والی عام قرارداد نے بجائے اس کے کہ اسلام کے کام میں کوئی گرہ لگائے ،ایک گرہ کو کھول دیا ہے ۔ حقیقت میں یہ قرار داد دین اسلام کے قوانین کی ایک دفعہ کا نفاذ ہے کیونکہ اس طرح عورتوں اور بچوں کو بیچنے کا موضوع ختم ہوا ہے ،اور یہ وہی چیز ہے جسے چودہ سو سال پہلے اسلام نے منسوخ کیا تھا ۔

اسلام نے جنگی اسیروں کی غلامی کا جو راستہ کھلا رکھا ہے ،وہ اس لئے ہے کہ انسان کو ہمیشہ اس حکم کی ضرورت ہے ،اور یہ کبھی ختم نہیں ہوگا ۔تنہا چیز جسے اسلام نے ''غلامی'' کا نام دیا ہے وہ یہی جنگی اسراء ہیں ۔

لیکن دوسرے لوگ ''غلامی'' کے نام کو زبان پر لائے بغیر عملاً ''غلامی'' کی رسم کو مستحکم کررہے ہیں ،اور جو استفادہ صدر اسلام میں مسلمان (جنگی اسیروں)غلاموں سے کرتے تھے وہی استفادہ آج کی حکومتیں جنگی قیدیوں اور جنگ میں شکست کھائی ملتوں سے کرتے ہیں ۔

غلاموں کے ساتھ اسلام کا سلوک

اسلامی قوانین کے تحت،اسیر کئے گئے کفار حربی، ممکن ہے مسلمانوں کے سرپرست اورحاکم کے حکم سے آزاد کئے جائیں یابطور غلام رکھے جائیں ۔جنگ ہوازن میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کئی ہزار عورتوں اور بچوں کوایک ساتھ آزاد کیا ۔جنگ بنی المصطلق میں مسلمانوں نے کئی ہزاراسیروں کوآزادکیا ۔ اسلام میں،غلام،گھرکے اعضاء کے مانند ہیں،گھرکے دوسرے اعضاء کے ساتھ جیسا سلوک کیا جاتا ہے ویساہی برتاؤان کے ساتھ بھی کیا جانا چاہئے ۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غلاموں کے ساتھ بیٹھتے تھے اور ایک ساتھ کھانا کھاتے تھے ۔ امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام دو کرُتے خریدتے تھے،ان میں سے بہتر اپنے غلام کودیتے تھے اور معمولی کرُتے کو خودپہنتے تھے ۔

حضرت امام رضا علیہ السلام اپنے غلاموں اورکنیزوں کے ساتھ ایک دسترخوان پر کھانا کھاتے تھے ۔ اسلام حکم دیتا ہے کہ غلاموں کے ساتھ مہربانی سے پیش آئیں،ان کے ساتھ سختی نہ کریں، گالیاں نہ دیں اور جسمانی اذیتیں نہ پہنچائیں اورضرورت کے وقت ان کے ازدواج کے وسائل فراہم کریں یاخود ان کے ساتھ ازدواج کریں ۔خدائے متعال اس سلسلہ میں فرماتا ہے : (...بعضکم من بعض...)[1] ''سب ایک پیکر کے اعضاء ہیں''اسلام میں،غلام،اپنے مالک کی اجازت سے یادوسرے راستہ سے،مالک بن سکتے ہیں اور جس مال کے وہ مالک بن جائیں،آزادی کے بعدان کے لئے کسی قسم کا ننگ و عار نہیں ہے،جیسے کہ غلامی کے زمانہ میں بھی نہیں تھا کیونکہ اسلام میں بزرگی اور فضیلت کا معیارصرف تقویٰ ہے لوگوں میں سب سے زیادہ پرہیزگار شخص کو سب سے بہتر جانتا ہے۔اسلام کی نظرمیں ایک باتقوی غلام ہزاربے تقوی آزاد لوگوں سے بہترہے ۔ اسلام کی بعض عظیم شخصیتیں جیسے سلمان فارسی اوربلال حبشی آزاد کئے گئے غلام تھے.اسلام نے غلام کوآزاد کرنے کے مسئلہ کو ہمیشہ مد نظر رکھاہے اور اس کام کے لئے مختلف راستے کھولے ہیں منجملہ جرمانہ اور بعض گناہوں کا کفارہ غلاموں کی آزادی کے لئے قراردیا ہے،

[1] نساء ,۲۵

اس کے علاوہ غلاموں کو آزاد کرنے کی بہت تاکید کی گئی ہے اور اسے اہم مستحبات میں قرار دیا ہے تاکہ اس طرح ہر سال بہت سے غلام آزاد ہو کر آزاد معاشرے کے عضو بن سکیں ۔ نتیجہ یہ تھا کہ اسلام حتی الامکان غیر اسلامی معاشروں (کفار حربی) سے ایک گروہ کو جنگی اسیروں کی صورت میں پکڑتا تھا اور انھیں حق وعدالت کے معاشرے میں داخل کرتا تھا ،ان کی تعلیم و تربیت کرتا تھا ،پھر مختلف راستوں سے آزاد کر کے اسلامی معاشرے کا حصہ بناتا تھا ۔اس لحاظ سے جو شخص بھی جنگی اسیر ہوتا تھا ،آزاد ہونے تک غلام رہتا تھا ۔اگر وہ مسلمان ہونے کے فوراً بعد آزاد ہوتا ،تو اس صورت میں ممکن تھا ہر اسیر ہونے والا کافر، ظاہراً مسلمان ہو جاتا، اور اس طرح اپنے آپ کو نجات دلاتا اور تھوڑی ہی دیر کے بعد پھر سے اپنی سابقہ حالت کی طرف پلٹ جاتا ۔

غصب

جو شخص کسی کے مال کو زبردستی اس سے چھین کر ،مالکیت کے اسباب میں سے کسی سبب کے بغیر اسے اپنا مال قرار دے یا کسی دوسرے کے مال پر زبردستی قبضہ کر کے استفادہ کرے ،اگرچہ اسے اپنا مال قرار نہ دے ،اس عمل کو شرعاً ''غصب'' کہتے ہیں ۔ لہذا،تسلط جمانے کے کسی جائز سبب جیسے بیع ،اجارہ اور اجازت کے بغیر کسی دوسرے کے مال پر قبضہ جمانے کو غصب کہتے ہیں ۔یہاں پر معلوم ہوتا ہے کہ غصب،ایک نامناسب کام ہے جو مالکیت کی خصوصیت کی بنیاد کو پامال کرتا ہے ۔

جس قدر مالکیت کی خصوصیت کی بنیاد معاشرے کے زندہ اور پائیدار رہنے میں موثر ہے اسی قدر غصب معاشرے کو برباد کر کے اس کی ترقی کو روکتا ہے ۔ اگر یہ طے پا جائے کہ معاشرے کے اثر و رسوخ رکھنے والے افراد قانون کی اجازت کے بغیر کمزوروں اور اپنے ماتحتوں کی کمائی پر قبضہ جمائیں تو خصوصیت اور مالکیت اپنے اعتبار کو کھودے گی ۔ ہر ایک اپنے سے کمزور لوگوں کے خصوصی حقوق کے بارے میں اسی طرز فکر پر عمل کرے گا اور ماتحت اور کمزور لوگ بھی اپنی محنت و مشقت کی کمائی کی حفاظت کے لئے ہر ممکن اقدام کر کے عزت و شرافت فروشی پر مجبور ہوں گے ۔اور نتیجہ میں انسانی معاشرہ غلاموں کے خرید و فروخت کے ایک بازار میں تبدیل ہو کر رہ جائے گا اور قوانین و ضوابط اپنے اعتبار سے گر جائیں گے اور ان کی جگہ پر ظلم و ستم جانشین ہوگا ۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے غاصب کے لئے سخت قوانین وضع کئے ہیں اور غصب کو گناہ کبیرہ شمار کیا ہے۔ قرآن وسنت کی نص کے مطابق،شرک کے علاوہ ہر قسم کے گناہ کو خدا کی طرف سے بخش دئے جانے کا احتمال ہے ۔اور ہر گناہ حتی شرک بھی توبہ کے ذریعہ قابل عفو و بخشش ہے ۔لیکن جس کی زندگی کے ریکارڈمیں دوسروں کے حقوق کے بارے میں غصب اور ظلم وستم درج ہو،تواس کے لئے کسی بھی صورت میں حقدار سے بخشش حاصل کئے بغیر خدا کی پوچھ گچھ اور سزا سے بچنے کی اُمید نہیں ہے ۔

غصب کے بعض احکام

۱۔ غاصب پر واجب فوری ہے کہ غصب کیاگیا مال ،مالک کو لوٹادے ،وراگروہ زندہ نہ ہوتواسے اس کے وارثوں کے حوالہ کردے ،اگرچہ اس مال کا واپس کرنا غاصب کے لئے کافی نقصان کا سبب بنے ۔مثال کے طور پر کسی کاپتھریا لوہے کا ایک ٹکڑا غصب کر کے اپنے مکان کی بناء میں نصب کرے جواس کے لاکھوں برابر قیمت پر تعمیر ہوئی ہو ،تو مکان کوگراکر اس پتھر اورلوہے کے ٹکڑے کو نکال کراس کے مالک کو لوٹادے ،مگر یہ کہ اس کا مالک اس کی قیمت حاصل کرنے پر راضی ہو جائے ۔یااس کے مانند کسی نے دس من گندم غصب کرکے دس خروارجوسے مخلوط کیا ہو ،اگر گندم کامالک اس کی قیمت لینے پرراضی نہ ہو جائے تواسے عین گندم کو جوسے جدا کرکے مالک کو واپس کرنا چاہئے ۔

۲۔اگر غصب کئے گئے مال میں کوئی نقص پیدا ہوجائے،توعین مال کو واپس کرنے کے علاوہ نقصان کی تلافی بھی کرنا چاہئے ۔

۳۔اگر غضب کیاگیا مال تلف ہو جائے تواس کی قیمت اداکی جانی چاہئے۔

۴۔اگر غاصب، غصب کئے گئے مال کے کسی حصہ کو ضائع کردے، تو چاہے اس نے خوداس سے استفادہ نہ کیا ہو تو بھی وہ اس مال کے منافع کا ضامن ہے،جیسے،کسی نے کرایہ کی گاڑی کو غصب کرکے کئی دن تک اسے گیرج میں رکھاہو ۔ اسی طرح اگرغاصب ،غصب کئے گئے مال میں اضافہ کردے،جیسے ایک بھیڑکو غصب کرنے کے بعداسے اچھی گھاس کھلا کرفربہ بنادے تواس اضافہ میں

کوئی حق نہیں رکھتا ہے البتہ اگرمذکورہ اضافہ منفصل ہویعنی ایک زمین کو غصب کرکے اس میں کا شتکاری کرکے زراعت حاصل کرے تو غصب کیا ہوامال اجرت کے ساتھ مالک کولوٹادے اورزراعت غاصب کی ہوگی ۔

لُقطہ:جوبھی مال پایا جائے اوراسکا مالک معلوم نہ ہواسے ''لقطہ'' کہتے ہیں: ۱۔جومال پایا جائے اوراس کا مالک معلوم نہ ہو،اگراس کی قیمت ایک مثقال[1] چاندی سے کم ہو،تواسے اٹھاکر خرچ کیا جاسکتا ہے اوراگراس کی قیمت ایک مثقال چاندی سے زیادہ ہو تواسے نہیں اٹھانا چاہئے اوراٹھانے کی صورت میں عادی راہوں سے ایک سال تک اس کے مالک کو ڈھونڈنا چاہئے اورمالک کو ڈھونڈ لینے کی صورت میں اس کے حوالہ کرنا چاہئے اوراس کامالک نہ ملاتواس مال کواسکی طرف سے کسی فقیر کوصدقہ دینا چاہئے ۔

۲۔اگرکسی مال کوایک ایسی ویران جگہ میں پایاجائے جس کے باشندے نابود ہوچکے ہوں یاغاراور اس بنجر زمین میں پایاجائے کہ جس کا کوئی مالک نہ ہو۔ تو پایاگیا مال پانے والے کا ہے ،اوراگرمال ایسی زمین میں ملے جو کسی کی ملکیت ہو تو اس کے گزشتہ مالکوں سے دریافت کیا جانا چاہئے ،اگرانہوں نے اس کو چھپایاہو توعلامت ونشانی بتانے کی صورت میں دیا جائے ورنہ یہ مال پانے والے کا ہے ۔ بنجر زمینوں کوآباد کرنا ایسی زمین کوآباد کرنا جس سے استفادہ نہیں ہوتاتھا (خواہ وہ زمین کبھی آباد نہیں تھی ،یا کبھی آباد تھی لیکن وہاں کے باشندوں کے معدوم ہونے کی وجہ سے غیرآباداوربے فائدہ رہی ہو یامرغ زاروں یانرسل زاروں کے مانند)۔بہر حال زمینوں کوآباد کرنااسلام میں نیک کام شمارہوتا ہےاور مالکیت کا سبب بننے کے علاوہ اخروی ثواب بھی رکھتا ہے۔

پیغمبراکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے کہ'' : جو کوئی شخص کسی بنجرزمین کوآباد کرے ،وہ زمین اس کی ہے[2]۔''

حضرت امام جعفرصادق علیہ السلام سے روایت نقل کی گئی ہے کہ'' :اگر کوئی گروہ کسی بنجر زمین کوآباد کرے ،تووہ اولویت کا حق رکھتا ہےاوروہ اس زمین کا مالک ہے[3]۔ ''اسلام میں،بنجر زمینوں کا مالک خدا،رسول خداؐاورامامؑ ہے (اسلامی حکومت سے مربوط

---

[1] تقریباًساڑھے تین گرام۔
[2] میزان الحکمۃ،ج۱،ص۹۴ ۔
[3] میزان الحکمۃ،ج۱،ص۹۴ ۔

ہیں)اورانفال میں شمار ہوتی ہیں ۔بنجر زمینوں کو مندرجہ ذیل شرائط سے آباد کرکے ان کا مالک بن سکتے ہیں ،اوراگرکئی افراد ملکیت کا قصد کریں توجو پیش قدمی کرے گا وہ اولویت کا حق رکھتاہے:۱۔امامؑ یاان کے نائب کی اجازت سے ۔

۲۔کسی دوسرے شخص نے پہلے اس کی پتھروں سے نشاندہی یاحدبندی نہ کی ہو۔

۳۔دوسروں کی ملکیت کے حدود سے متصل نہ ہو،جیسے نہر کے اطراف کنویں کے پشتے میں اور کھیت کی سرحد سے ملی نہ ہو۔

۴۔خالی زمین،جیسے خراب شدہ مسجدیا اوقاف،عام مسلمانوں کی زمین جیسے کوچے اور سڑکیں نہ ہوں۔

نوٹ:تعمیر اور آباد کرنا ایک عرفی مفہوم ہے،اس لئے جب عرف کہے: ''ایک شخص نے فلاں زمین آباد کی ہے'' ،مالکیت تحقق پاتی ہے ۔البتہ آباد کرنا بھی مختلف مقاصد کے پیش نظر مختلف ہے ۔چنانچہ کھیتی باڑی میں ہل چلانے سے آباد کرنا عمل میں آتا ہے اور عمارت بنانے میں دیوار بنانے سے ثابت ہوتا ہے ،یہاں تک کہ حاضر لوگوں میں سے ہرایک کھدائی اوراستخراج کے بغیر اس سے استفادہ کرسکتا ہے،ہرایک کے لئے جائزہے کہ ضرورت کے مطابق اس سے استفادہ کرے اور اگران کااستفادہ کرنا کھدائی اوراستخراج اوردیگر فنی کاموں پر منحصر ہو ،جیسے سونا اورتانباوغیرہ تو جو محنت ومشقت سے کھدائی وغیرہ کرکے استخراج کرے وہی مالک ہوگا۔ بڑی نہریں مسلمانوں میں مشترک ہیں اسی طرح دریا اور برف وباران کاپانی جو پہاڑوں سے بہہ کر نیچے آتا ہے ،جو بھی ان کے نزدیک اورآگے ہو وہ دوسروں پر مقدم ہے ۔

تخصیص اور مالکیت کی اصل

یہی عقیدہ کہ انسان زمین کو اپنی ملکیت سمجھتا ہے ،اسے اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ اس کے مظاہر سے آسانی کے ساتھ استفادہ کرے ۔مثلاًاس کازلال پانی پیئے،میٹھے میوے اورحیوانوں کا گوشت کھائے ،پہاڑوں کے درّوں میں درختوں کے سائے میں آرام کرے ،یاصنعت ۔یعنی مادہ پرانجام دی سرگرمیوں کواپنی مرضی کے مطابق استعمال میں لائے ۔البتہ اگرصرف چند افراد زمین پرایسی

زندگی گزارتے کہ آپس میں کوئی ٹکراو نہ ہوتا توہرگز کوئی مشکل پیش نہ آتی ،لیکن افراد کا جمع ہونا اور ان کا باہم زندگی گزارنا جوانسان کی اجتماعی شہری زندگی کی بنیاد ہے ،کہ ہرفرد زمین اوراس کے مظاہرکو اپنی ملکیت سمجھ لے تو،قدرتی طورپر لوگوں کے درمیان ٹکراؤاورشدید تصادم کاسبب بن جائے گا ،جب ہر شخص اپنی ضرورت کو پورا کرنے کی تلاش وکوشش کرے گا،تودوسرے اسے اپنی آزادی وآسائش میں مخل سمجھتے ہوئے اس کے لئے رکاوٹ ایجاد کریں گے،کیونکہ انسان اپنی زندگی کو ہرقیمت پر جاری رکھنے کے لئے مجبور ہے۔اس لئے پہلے ''اصل تخصیص'' کے نام پر ایک اصل وقانون وضع کیاگیاتاکہ اجتماعی ٹکراؤاورتصادم کو روکا جائے ۔اس اصل کوقابل احترام سمجھا گیا ہے ۔اس اصل و قانون کے مطابق،انسان جس چیز کواپنی سعی وکوشش سے حاصل کرے وہ اس کا مالک ہےاوردوسروں کواس پر طمع ولالچ کرکے اس کے لئے رکاوٹ پیدا کرنے کا حق نہیں ہے۔

اس کے بعد ''اصل مالکیت'' کے نام پرایک اوراصل وضع کرکے اسے قابل احترام سمجھا گیا ہے کہ اس کے مطابق انسان اپنی کوششوں سے حاصل کی گئی چیزوں پراپنی مرضی سے تصرف کرسکتا ہے ۔

یہ اصل حقیقت میں ''اصل تخصیص'' کو مکمل کرنے والی ہے ۔کیونکہ ''اصل تخصیص''دوسروں کی خلل اندازی کوروکتی ہے اوریہ اصل اس چیز کی مالکیت کے لئے ہر قسم کے تصرف کو جائز بنادیتی ہے ۔

اسلام نے مالکیت کی اصل کومحترم جاناہے اورپیغمبراسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی معروف حدیث (الناس مسلطون علی اموالھم [1]) میں مالک کے اپنے مال پر مکمل تسلط کی تائید فرمائی ہے ۔اس قانون کے مطابق انسان جس طرح چاہے اپنے مال کو استعمال کرسکتا ہے ،اس کی حفاظت کرسکتا ہے ،کھاسکتا ہے ،پی سکتا ہے ،بخش سکتا ہے ،بیچ سکتا ہے اوراسی طرح دوسرے جائز تصرفات انجام دے سکتا ہے،لیکن جوتصرفات ممنوع اور معاشرہ کی مصلحت کے خلاف ہیں مالک کوان کاہرگزاختیار نہیں ہے ۔

---

[1] عوالی اللئالی،ج۱،ص۴۵۷ ۔

مالک اپنے مال پروہ تصرف نہیں کرسکتا ہے جواسلام و مسلمین کے نقصان میں ہو یا اسراف اور فضول خرچی سے اپنے مال کونابود نہیں کرسکتا ہے،یا اپنے سونے اورچاندی کے سکوں کوجاری نہ رکھ کر خزانہ کے طورپر جمع نہیں کرسکتا ہے ۔ اصل مالکیت،اہم ترین اصل ہے جوانسان کواپنی آرزوتک پہنچاتی ہے اور قوانین کی رعایت کے سایہ میں انفرادی آزادی کوامکان کی آخری حد تک فراہم کرتی ہے ۔ جتنامال کی نسبت انسان کاتسلط یا اس کے کار وکوشش کے بارے میں اسکا اختیارکم ہوجائے گااتنی اس کی آزادی سلب ہو جائے گی اور اس کا استقلال نابود ہوجائے گا اور اگراصل تسلط بالکل نابودہو جائے ،توحقیقت میں ایک زندہ مخلوق سے اس کی اصل آزادی چھین لی جائے گی۔

اصل مالکیت کے دو تتمے

مالک کا اپنی ملکیت پر مکمل تسلط اور اس کے ہر جائز تصرف میں مطلوب آزادی ،ممکن ہے دوراستوں سے خطرہ میں پڑ جائے:

۱۔دوسروں کی طرف سے تجاوز کی وجہ سے،جیسے کوئی اس کی ملکیت پر قبضہ کرکے اس کے لئے استفادہ کے راستہ کو مسدود کر دے۔

۲۔اس راستہ سے کہ دوسرے ایسا کام انجام دیں جس سے مالک کونقصان پہنچے۔ دین اسلام نے مذکورہ خطرات کو روکنے کے لئے دومزیداصلوں کووضع کیا ہے کہ اصل مالکیت خود بخود حاصل ہوتی ہے کہ حقیقت میں یہ دواصلیں اسکے نفاذاور حفاظت کی ضامن ہیں:

الف:اصل ضمان :اسلام اس اصل کے مطابق حکم دیتا ہے کہ جو بھی دوسرے کے مال کوپائے ،وہ اسکا ضامن ہے یعنی اس کو وہ مال مالک کو لوٹادینا چاہئے اوراگر ضائع ہوجائے تو اسکے مانند یاقیمت اداکرے اس حکم کی دلیل ،پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ حدیث ہے'' :علی الید ماأخذت حتی تؤدي''ب:قائدہ لاضرر: اس قائدہ کو حدیث نبوی (لاضررولاضرار فی الاسلام)سے استدلال کیا جاتاہے ۔اس قائدے کے مطابق اگر اسلام کا کوئی بھی حکم جاری کرنے میں کسی شخص کوبعض مواقع پرمالی یاجانی نقصان پہنچائے،تو وہ حکم اس مورد میں، جاری نہیں ہوگا۔جن چیزوں کو ملکیت بنایاجاسکتا ہےدین مقدس اسلام میں ان چیزوں کوملکیت بنایا جاسکتیں ہے: ا۔قابل توجہ فائدہ ہو،مثال کے طور پر حشرات قابل ملکیت نہیں ہیں ۔

۲۔مذکورہ فائدہ حلال ہو،اس بناء پر جوئے کے وسائل،موسیقی کے آلات اوران کے مانند،جن کا حلال فائدہ نہیں ہے،کسی کی ملکیت نہیں ہو سکتے۔

ا۔احکام ضمان کے دو حکم :الف:اگر کوئی شخص کسی دوسرے شخص کی ملکیت کو غصب کرے،یعنی مالک کی اجازت کے بغیر اسے اپنے قبضہ میں لے لے یا مالک کو اپنی ملکیت میں تصرف کرنے نہ دے ،اسلام کے حکم کے مطابق فوراًاسے مالک کوواپس کرے اوراگر یہ ملکیت ضائع ہو جائے تو اسکے مانند یا اس کی قیمت اداکرے اور اگر غصب کرنے کی وجہ سے مال کے مالک کو کوئی نقصان پہنچے توغاصب اس کا ذمہ دار ہے ۔

ب:اگر کوئی شخص مالک کی اجازت کے بغیر اس کے مال میں تصرف کرے ،لیکن مالک کو بھی تصرف کرنے میں رکاوٹ نہ ڈالے۔تو خود مال اگرتلف ہوجا ئے تو اس کے مانندیاقیمت مالک کودے، ضمان کے احکام ومسائل بہت زیادہ ہیں ،تفصیلات جاننےکیلئے فقہی کتابوں کی طرف رجوع کریں ۔

۳۔مذکورہ حلال فائدہ کسی فردیاچندافراد کی تخصیص کے قابل ہو ۔اس بناء پر مساجد،عام سڑکیں اور ان کے مانند چیزیں ،جو معاشرے کے تمام لوگوں سے مربوط ہوتی ہیں ،کسی خاص شخص کی ملکیت نہیں بن سکتی ہیں ۔ جن چیزوں سے انسان مالک بن سکتا ہے ما لک بننے کے لئے،انسانی معاشرے میں بہت سے وسائل موجود ہیں ،لیکن ان میں سے بعض جیسے جوا ،شرط لگانا،سودخواری اور رشوت ،چونکہ معاشرے کیلئے مضر ہیں ،اس لئے اسلام نے ممنوع فرمایا ہے ۔لیکن دوسرے وسائل مانند بیع،اجارہ ،ھبہ اورجعالہ، جومعاشرے کے لئے مفید ہیں ،ان میں کچھ اصلاح کر کے انھیں قبول کیاہے اور کلی طورپر اسلام کی نظر میں مالک بننے کے دو وسیلے ہیں : ا۔وہ جس کے انجام دینے میں کوئی لازم ہو جیسے :خرید وفروخت کہ اس کوانجام دینے کے لئے عقدبیع پڑھنایا لین دین کا ہونا ضروری ہے۔

۲۔وہ جس میں کسی عمل کی ضرورت نہیں ہے ،جیسے:وفات کہ اس کے ذریعہ مالک کا مال وارثوں کو منتقل ہوتا ہے اور اس میں کسی لفظ یا عمل کی ضرورت نہیں ہے ۔ میراث اور نکاح کے احکام کی اہمیت کے پیش نظر ہم ان سے مربوط کلی مسائل بیان کرتے ہیں۔

کھانا پینا

دین مقدس اسلام میں ،ہر وہ چیز جو کھانے اور پینے کے قابل ہو،حلال ہے لیکن چند استثنائی چیزوں کے علاوہ ،کہ ان میں سے بعض قرآن مجید میں اور بعض احادیث پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں بیان ہوئی ہیں۔ مذکورہ استثنائی چیزیں جن کا کھانا اور پینا حرام ہے،دو قسم کی ہیں :

جان دار اور بے جان ۔

پہلی قسم :حیوانات

حیوانات تین قسم کے ہیں :دریائی، خشکی،اورپرندے۔

الف۔ دریائی حیوانات :پانی میں رہنے والے حیوانوں میں صرف آبی پرندے اور چھلکے دار مچھلیاں حلال گوشت ہیں اور باقی جیسے سانپ مچھلی،سگ مچھلی،مگرمچھ ،سمندری کتا اور سور وغیرہ حرام ہیں ۔

ب۔خشکی کے حیوانات :خشکی کے حیوانات دو قسم کے ہیں :(پالتواور جنگلی) پالتو جانوروں میں ،بھیڑ،بکری،گائے اوراونٹ حلال گوشت ہیں ۔اسی طرح گھوڑا،خچر اورگدھا حلال ہیں ،لیکن ان کا گوشت کھانا مکروہ ہے اور ان کے علاوہ جیسے کتااو بلی حرام ہیں ۔ جنگلی حیوانوں میں گائے،بیڈھا،جنگلی بکری ،جنگلی گدھااورہرن حلال گوشت ہیں اورباقی درندے اور ناخن دار حیوانات ،جیسے :شیر چیتا ،بھیڑیا ،لومڑی،گیڈر اور خرگوش،حرام گوشت ہیں۔

ج۔پرندے :پرندوں میں سے جن کے پوٹا اور ،سنگ دانہ ہو یا اڑتے وقت پر مارتے ہوں اورناخن نہ رکھتے ہوں ، جیسے پالتومرغی ،کبوتر ،فاختہ ،اورتیتر حلال گوشت ہیں اور باقی حرام گوشت ہیں اورٹڈی کی ایک خاص قسم حلال گوشت ہے ان کی تفصیلات کے لئے توضیح المسائل کی طرف رجوع کیا جائے۔

نوٹ: گوشت کے حلال ہونے کے بارے میں جن حیوانوں کانام لیاگیا ،اس میں تزکیہ کی شرط ہے یعنی توضیح المسائل میں دی گئی تفصیل اور طریقہ سے ذبح کرنا ۔

دوسری قسم :بے جان اشیاء

بے جان چیزیں دو قسم کی ہیں : الف ۔ جامد (ٹھوس) ب ۔ سیال چیزیں الف :جامد چیزیں ا ۔ ہر حیوان کا مردار خواہ حرام گوشت ہو یاحلال گوشت،اس کا کھانا حرام ہے ۔اسی طرح نجس چیزیں ،جیسے:حرام گوشت حیوانوں کا فضلہ اور وہ کھانے کی چیزیں جونجاست کے ملنے سے نجس ہوگئی ہوں کا کھانا حرام ہے۔

۲۔ مٹی

۳۔ مہلک زہر

۴۔وہ چیزیں جن سے انسان فطری طورپر متنفر ہو،جیسے حلال گوشت حیوان کا فضلہ اور اس کی ناک کاپانی اورجوکچھ اس کی انتڑیوں سے نکلتا ہے ۔اسی طرح حلال گوشت حیوان کے بدن کے اجزاء میں سے پندرہ چیزیں حرام ہیں (تفصیل کے لئے توضیح المسائل کی طرف رجوع کیا جائے)ب: سیال چیزیں ا۔ مست کرنے والی ہر رقیق چیز،اگرچہ کم ہی ہو اس کا پینا حرام ہے۔

۲۔ حرام گوشت حیوانات کا دودھ ،جیسے سور ،بلی اور کتا ۔

۳۔ خون جہندہ رکھنے والے حیوان کا خون۔

۴۔ نجس مائعات، جیسے خون جہندہ رکھنے والے حیوانوں کا پیشاب اور منی وغیرہ۔

۵۔ وہ مائعات جن میں نجاستوں میں سے کوئی ایک مل گئی ہو۔

نوٹ: کھانے پینے کی حرام چیزیں اس وقت حرام ہیں جب اضطرار نہ ہو اور اضطرار کی صورت میں (جیسے: اگر کوئی شخص حرام غذا نہ کھائے تو بھوک سے مر جائے گا، بیمار پڑنے یا بیماری کے شدید ہونے سے ڈرتا ہو یا کمزور ہو کر سفر میں اپنے ہمسفروں سے پیچھے رہ کر ہلاک ہوجائے گا) کھانے پینے کی حرام چیزوں میں سے اس قدر کھانا جائز ہے کہ اس کا اضطرار دور ہوجائے. لیکن جو چوری کے لئے یا اسلامی حکومت کے خلاف بغاوت کرنے کے لئے وطن سے باہر آکر مضطر ہوجائے تو اس کیلئے جائز نہیں ہے۔

ایک اہم یاد دہانی: حفظان صحت کی رعایت، انسان کے بنیادی فرائض میں سے ہے کہ ہر انسان خدا داد شعور کے ذریعہ تھوڑی توجہ سے اس کے بارے میں معلوم کرسکتا ہے۔ حفظان صحت پر مختلف قسم کے کھانے پینے کی چیزوں کے اثرات بھی بالکل واضح ہیں۔ اس کے علاوہ یہ چیزیں انسان کی روح واخلاق اور اسی طرح اس کے اجتماعی میل ملاپ پر بھی قابل توجہ اثرات ڈالتی ہیں۔ ہمیں ہرگز اس میں شک وشبہ نہیں ہے کہ مست انسان کی نفسیاتی حالت اور اس انسان کی حالت ایک جیسی نہیں ہوتی جو ہوش میں ہے۔ اور ان کی اجتماعی گردش بھی ایک جیسی نہیں ہے۔

یا اگر کوئی شخص مثلاً نفرت آمیز چیزوں کو کھانے کی عادت کرے، اور اس عادت سے جو اثر اس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں پیدا ہوگا، وہ عام افراد کے لئے قابل برداشت نہیں ہے۔ یہاں پر انسان اپنی خدا داد فطرت سے سمجھتا ہے کہ اسے اپنے کھانے پینے میں کم وبیش محدودیت کا قائل ہونا چاہئے، ہر کھانے والی چیز کو نہ کھالے اور ہر پینے والی چیز کو نہ پی لے۔ آخر کار ہر نگلنے والی چیز کو نہ نگل لے۔ خدائے متعال نے اپنے کلام پاک کی نص کے مطابق زمین پر موجود ہر چیز کو انسان کے لئے خلق کیا ہے اور

خدائی متعال خود ،انسان اورانسان کی ضروریات زندگی کی چیزوں کا محتاج نہیں ہے اوراپنی مخلوقات کے فائدہ ونقصان کے بارے میں سب سے زیادہ دانااور بیناہے۔انسان کی خیر وسعادت کے لئے کھانے اور پینے کی چیزوں میں سے بعض کوحلال اوربعض کو حرام قراردیا ہے ۔ بعض ان محرمات کوحرام قراردینے کا فلسفہ ،سادہ اوربے لاگ سوچ رکھنے والوں کے لئے واضح ہے اوربعض حکمتیں علمی بحثوں کے ذریعہ تدریجاً واضح ہوئی ہیں اور جن چیزوں کے حرام ہونے کا فلسفہ ہمیں ابھی تک معلوم نہیں ہوسکا ہے،ان کے بارے میں نہیں کہا جاسکتا ہے کہ وہ ہرگز ہمارے لئے واضح نہیں ہوں گی اور اگرواضح بھی نہ ہوں تب بھی نہیں کہا جاسکتا ہے کہ ان میں کوئی فلسفہ نہیں ہے۔

بلکہ اس کے پیش نظرکہ قوانین کا سرچشمہ خدائے متعال کا بے انتہا علم ہے ،اس لئے کہنا چاہئے کہ اس میں بہترین اورموثر ترین حکمت و مصلحت ہوگی اگرچہ ہم اپنی تنگ نظری اور محدود علم کی وجہ سے اس کودرک کرنے سے عاجزاوربے بس ہیں ۔

میراث کے کلی مسائل

عالم طبیعت میں میراث کاموضوع،ایک کلی قانون ہے جو تحقیق کی توجہ کامرکز رہاہے اورہر ایک نسل اپنے اسلاف کی ذاتی خصوصیتوں کو میراث کے طور پر حاصل کرتی ہے، ''گندم ازگندم بروید جواز جو'' ۔

انسان بھی کسی حدتک اپنے اجداد کے اخلاق،صفات اور ان کے وجودی اوصاف کو میراث میں حاصل کرتے ہیں اسی ذاتی میل میلاپ اور ہماہنگی کا سبب ہے کہ انسان عام حالت میں اپنے رشتہ داروں کی نسبت ایک خاص دلچسپی کو محسوس کرتا ہے اوربالخصوص اپنی اولادکو اپنا جانشین سمجھ کران کی بقاکو بالکل اپنی بقاجانتا ہے اور قدرتی طورپر جو کچھ اس کی ملکیت ہے،جسے اس نے محنت وزحمت اور کام وکوشش کرکے حاصل کیا ہے اوراپنے لئے مخصوص کر رکھا ہے ،اسے اپنی اولاد کی ملکیت جانتا ہے،بلکہ اپنے رشتہ داروں کی ملکیت جانتا ہے ۔

اسلام بھی اسی فطری درک واحساس کے لحاظ اوراحترام کے پیش نظر انسان کے مال کواس کے مرنے کے بعد اس کے زندہ رشتہ داروں سے متعلق جانتا ہے اور میاں بیوی کو بھی جونسب اور ایک دوسرے کی زندگی میں شریک ہونے کے بانی ہیں رشتہ داروں میں شامل کرتا ہے ۔ پہلے طبقہ کونسبی وارث اوردوسرے طبقہ کوسببی وارث جانتا ہے ۔اس بناپر، مرنے والے کا مال،اس کے نسبی اور سببی وارثوں میں ایک معین قانون کے مطابق تقسیم ہوگا ،لیکن کچھ افراد ایسے ہیں جو میراث سے محروم ہیں ،یہاں پر ان میں سے دوافراد کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے :ا۔کافرکومسلمان کی میراث نہیں مل سکتی ہے ۔اس کے علاوہ اگر کوئی کافر مرجائے اوراس کے وارثوں میں کوئی مسلمان ہوتو اس کے کافر رشتہ دار میراث نہیں پائیں گے۔

۲۔قاتل،اگر کوئی شخص اپنے رشتہ داروں میں سے کسی کو قتل کردے تو قاتل اس کی میراث نہیں پائے گا،لیکن قاتل کی اولاد میراث سے محروم نہیں ہیں ۔

نسبی وارث(رشتہ دار)

نسبی وارث،رشتہ کے نزدیک اوردور ہونے اور رشتہ کا رابطہ ہونے یانہ ہونے کے سبب،تین طبقوں میں تقسیم ہوتے ہیں،کہ ہر طبقہ کے ہوتے ہوئے بعد والاطبقہ میراث نہیں پائے گا اوران تین طبقوں میں سے کسی ایک کے نہ ہونے کی صورت میں ،میراث ایک خاص ضابطہ کے تحت تقسیم ہوتی ہے،جس کابعد میں ذکر کیا جائے گا۔ خدائے متعال اپنے کلام پاک میں فرماتا ہے : (...و اولواالارحام بعضھم اولی ببعض...[1])... ''بعض رشتہ دار بعض دوسروں پر زیادہ اولویت رکھتے ہیں '' ...نیز اپنے کلام میں آٹھ آیتوں کے ضمن میں وارثوں کے طبقوں اور ان کے حصوں کو بیان فرمایا ہے :پہلاطبقہ مرنے والے کے باپ،ماں بیٹا اوربیٹی ،جو مرنے والے کے براہ راست رشتہ دار ہیں،مرنے والے کے کوئی بیٹااوربیٹی نہ ہونے کی صورت میں ان کا حصہ ان کی اولاد کو ملے گا ،لیکن جب تک مرنے والے کی اولادمیں سے کوئی ایک بھی ہوتو مرنے والے کی اولاد کی اولاد کومیراث نہیں ملے گی ۔ مثلاًاگرمرنے والے کے باپ،ماں اوراس

---

[1] انفال،۷۵

کے بیٹے کا ایک بیٹا اور بیٹی ہو تو، مرنے والے کے بیٹے کا حصہ مرنے والے کے بیٹے کے بیٹے اور بیٹی کو ملے گا اور ان میں تقسیم ہو گا اور اگر مرنے والے کے بیٹے کے بیٹے اور بیٹی کی کوئی اولاد ہو تو اسے کچھ نہیں ملے گا ۔

دوسرا طبقہ: مرنے والے کے دادا، دادی ،نانا ،نانی اور بھائی اور بہن ہیں ،جو ایک واسطہ سے (باپ یا ماں کے واسطہ سے) مرنے والے کے رشتہ دار ہیں ۔ اس طبقہ میں بھی بھائی یا بہن کی اولاد کو، ان کے ماں باپ کا حصہ، اگر وہ مر گئے ہوں، تو مرنے والے کے طور پر ملے گا ۔ اور جب تک بھائی اور بہن کی کوئی اولاد زندہ ہو تو اولاد کی اولاد کو میراث نہیں ملتی ہے۔

نوٹ: مرنے والے کے اگر پدری بھائی بہن بھی زندہ ہوں اور پدری و مادری بھائی بہن بھی زندہ ہوں تو اس کی میراث پدری بھائی بہنوں کو نہیں ملے گی ۔

تیسرا طبقہ: چچا، پھوپھی ،ماموں اور خالہ ہیں ،جو دو واسطوں سے (باپ یا ماں یا دادا یا دادی) مرنے والے کے رشتہ دار ہوتے ہیں ۔اس طبقہ میں بھی اولاد اپنے ماں باپ کی جگہ پر ہیں اور جب تک مرنے والے کے ماں باپ کی طرف سے ایک شخص بھی زندہ ہو تو باپ کے رشتہ داروں کو میراث نہیں ملتی ۔

میراث کے حصے

اسلام میں مذکورہ وارثوں میں سے ہر ایک کے میراث کے حصے، علم ریاضی کے مطابق نہایت توجہ اور دقت کے ساتھ منظم و مرتب کئے گئے ہیں اور تمام حصے تین قسم کے ہیں : ا۔ وہ ورثا ورء جن کی میراث کا حصہ نصف ،ایک تہائی اور اس کے مانند ہے ان کی عددی نسبت معین ہے ۔فقہ میں ان حصوں میں سے ہر ایک کو ''فرض'' کہتے ہیں اور یہ مجموعاً چھ ہیں: نصف ،ایک چوتھائی، آٹھواں حصہ ،دو تہائی ،ایک تہائی اور چھٹا حص[1]ہ ۔

---

[1] ترتیب وار ۲؍۱، ۴؍۱، ۸؍۱، ۳؍۲، ۳؍۱ اور ۶؍۱ ۔

۲۔ جولوگ رشتہ داری کی وجہ سے میراث پاتے ہیں، لیکن ان کا حصہ نسبت کے مطابق معین نہیں ہے ۔

میراث کے فرض

۱۔ نصف (۲؍۱) یہ تین وراثوں کے لئے ہے ۔ الف:شوہر،جبکہ اسکی بیوی مرگئی ہواوراس کے کوئی اولاد نہ ہو ۔

ب:بیٹی،اگر مرنے والے کی تنہا اولاد ہو ۔ ج:بہن ،مادری وپدری یاصرف پدری ہو،جب کہ میت کا کوئی اور وارث نہ ہو۔

۲۔ ایک چوتھائی (۴؍۱) یہ دو وارثوں کے لئے ہے : الف:شوہر،جب کہ اس کی بیوی مرگئی ہواوراس کے اولادہو۔

ب:بیوی،جب کہ اس کا شوہر مرگیا ہواوراس کے اولادنہ ہو۔

۳۔ آٹھواں حصہ (۸؍۱) یہ بیوی یا متعدد بیویوں کی میراث ہے،جبکہ مرنے والے کے اولاد ہو ۔

۴۔ دوتہائی (۳؍۲) یہ دووارثوں کے لئے ہے :الف:دوبیٹیاں یااس سے زیادہ ،جبکہ مرنے والے کے کوئی بیٹانہ ہو۔
ب:دو یا اس سے زیادہ پدری ومادری بہنیں یاصرف پدری بہن ہو،جبکہ مرنے والے کے کوئی بھائی نہ ہو۔

۵۔ ایک تہائی (۳؍۱) یہ بھی دو وارثوں کے لئے ہے ۔ الف:ماں،جبکہ مرنے والی اولاد کے اولاداورمتعدد بھائی نہ ہوں۔

ب:مادری بہن اور بھائی جبکہ ایک سے زیادہ ہوں ۔

۶۔ چھٹا حصہ (۶؍۱)اوریہ تین وارثوں کے لئے ہے :الف:باپ،اگر میت کی اولاد زندہ ہو۔ ب:ماں،اگر مرنے والے کی اولادزندہ ہو۔ ج:مادری بہن یابھائی جبکہ منحصر بہ فرد ہو۔

ماں باپ کی میراث

۱۔اگر مرنے والے کا وارث صرف اس کا باپ یا ماں ہو تو میت کا تمام ترکہ اس کی ماں یا باپ کی میراث ہے ۔

۲۔اگر مرنے والے کے وارث اس کے ماں باپ اور اس کی اولاد ہوں تو اس کے ماں باپ میں سے ہر ایک ،چھٹا حصہ (۱٫۶) لیں گے اور باقی اس کی اولاد کا ہو گا ۔

۳۔اگر مرنے والے کے وارث باپ اور ماں ہوں ،اور اسکی کوئی اولاد نہ ہو تو اگر مرنے والے کے چند بھائی ہوں تو،اگر چہ اس کے بھائی میراث نہیں پاتے،لیکن اس صورت میں چھٹا حصہ (۱٫۶) ماں کا اور باقی مرنے والے کے باپ کا ہو گا ۔اور اگر مرنے والے کے کوئی بھائی نہ ہو تو اس صورت میں ماں کا حصہ ایک تہائی (۱٫۳) اور باپ کا حصہ دو تہائی (۲٫۳) ہو گا ۔

اولاد: ۱۔اگر مرنے والے کا وارث ایک بیٹا یا ایک بیٹی ہو تو تمام ترکہ اسی کا ہے اور اگر کئی بیٹے یا کئی بیٹیاں ہوں تو مال مساوی طور پر ان کے درمیان تقسیم ہو گا اور اگر مرنے والے کے بیٹے اور بیٹیاں ہوں تو ہر بیٹے کو بیٹی کے دو برابر حصہ ملے گا ۔دادا،دادی اور نانا،نانی۔

۲۔اگر میت کے وارث دادا اور دادی ہوں،تو دو حصے دادا اور ایک حصہ دادی کو ملی گا ۔اور اگر میت کے وارث نانا اور نانی ہوں تو ان کے درمیان میت کا مال مساوی طور پر تقسیم ہو گا ۔اور اگر میت کے وارث دادا،دادی اور نانا،نانی ہوں تو مال کو تین حصوں میں تقسیم کیا جائے گا ان میں سے دو حصے دادا ،دادی کو اسطرح کہ دادا کو دادی کے دو برابر دیا جائے گا ۔اور ایک حصہ نانا اور نانی کو مساوی طور پر تقسیم کر کے دیا جائے گا ۔

۳۔اگرمرنے والے کے وارث اجداداور بھائی بہن ہوں ،چنانچہ وہ بھائی یابہن مادری یاپدری یاپدری ومادری ہوں توایک تہائی اجداد کواورباقی دوتہائی بھائی بہنوں کو ملے گا ۔لیکن اگر بھائی بہن میں بعض پدری ومادری اوربعض دوسرے صرف پدری ہوں تومادری بھائی یابہن کوکچھ نہیں ملیگااور باقی ماندہ دوحصے پدری ومادری یاپدری بھائی اوربہن کوملے گا ۔

چچا اور پھوپھی :۱۔اگرمرنے والے کے وارث چچا یا پھوپھی ہوں توسب مال ان کو ملے گا اوراگرکئی چچایا کئی پھوپھیاں ہوں تو ان میں مساوی طورپر مال تقسیم ہوگااوراگرچچااورپھوپھی ہوں اورسب پدری ومادری یاپدری یامادری ہوں تو چچا کودوحصے اورپھوپھی کوایک حصہ ملے گا اوراگربعض پدری ومادری ہوں اوربعض پدری اوربعض مادری ہوں،تواس صوت میں اگرچچااورپھوپھی مادری ہوں تو ایک تہائی (۱۔۳)مال اوراگرزیادہ ہوں تو دوحصے اس کو ملیں گے اور باقی پدری ومادری چچااور پھوپھی کوملے گا اورپدری چچاوپھوپھی کومیراث نہیں ملے گی ۔

۲۔اگرمرنے والے کے وارث پدرومادری چچایا پھوپھی اورپدری چچایاپھوپھی ہوں توپدری چچایا پھوپھی کو میراث نہیں ملے گی اورتمام مال پدری ومادری چچاوپھوپھی کوملے گا ۔

ماموں اورخالہ:ماموں اورخالہ جبکہ سب پدری ومادری ہوں ،اگرچہ بعض لڑکے اوربعض لڑکیاں ہوں،تو مال ان میں مساوی طور پر تقسیم ہوگااوراگربعض پدری ومادری یاپدری اوربعض مادری ہوں،تومادری ماموں اورخالہ کا حصہ ۱۔۶ہے جو ان میں مساوی طور پر تقسیم ہوگا اورباقی مال پدری ومادری یاپدری ماموں اورخالہ کوملے گا کہ ہرلڑکے کو لڑکی کے دوبرابر حصہ ملے گا ۔

میاں بیوی کی میراث

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ شوہر کی میراث جبکہ اس کی بیوی کے کوئی اولادنہ ہوتونصف ہے اوراگراس(فوت شدہ)بیوی یادوسری بیوی سے اولاد ہوتوایک چوتھائی ہے۔ اوربیوی کی میراث،اگر(فوت شدہ)شوہر سے کوئی اولادنہ ہو تو ایک چوتھائی

اوراگراس (فوت شدہ)شوہریادوسرے شوہرسے اولادہوتو اس کو۱/۸میراث ملے گی۔ لیکن جاننا چاہئے کہ بیوی زمین سے میراث نہیں پاتی ،بلکہ ۱/۴یا ۱/۸منقولہ اموال اوراعیان زمین ،جیسے عمارت، تعمیر اوردرختوں سے میراث پاتی ہے ،لیکن شوہربیوی کے تمام اموال سے میراث پاتاہے ۔

ولاء :اگرکسی مرنے والے کامذکورہ وارثوں میں سے کوئی ایک بھی نہ ہوتواس کی میراث ''ولاء'' کے ذریعہ انجام پائے گی ۔اور ولاءکی تین قسمیں ہیں کہ جو بالترتیب میراث حاصل کرتے ہیں:

۱۔ولائے عتق :وہ یہ ہے کہ کوئی اپنے غلام کوآزاد کرے ،چنانچہ وہ غلام مر جائے اور اس کا کوئی وارث نہ ہوتو اس کامالک اورمولاا سکے تمام ترکہ کاوارث بن جاتا ہے ۔

۲۔ولائے ضمان جریرہ: اگر کوئی شخص کسی شخص کے ساتھ عہد کرے کہ ''کسی کو قتل کرنے یا زخمی کرنے کی صورت میں جو جرمانہ اس پر کیا جائے گا،وہ اسے اس شرط پر اداکرے گا کہ اگراس کے مرنے کے بعداس کا کوئی وارث نہ ہوتواس کے ترکہ کولے لے گا ''اس صورت میں وہ اس کے تمام ترکہ کاوارث بنتا ہے ۔

۳۔ولائے امامت: یہ امامؑ کی سرپرستی ہے ۔امامؑ تمام مسلمانوں کا سرپرست ہےاوراگرکسی شخص کا کوئی وارث نہ ہو،تواس کاترکہ امامؑ کواورامامؑ کی غیبت میں ان کے نائب کو پہنچتا ہے۔ امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام ،لا وارثوں کے ترکہ کوان کے ہم شہریوں اورہمسایوں میں تقسیم فرماتے تھے۔

میراث کے احکام

۱۔باپ کے رشتہ داراورماں باپ کے رشتہ دارمیراث کوکچھ فرق کے ساتھ تقسیم کرتیں ہیں ،یعنی ہرمردعورت کے دوبرابرلیتا ہے ،لیکن ماں کے رشتہ داروں میں میراث مساوی طورپر تقسیم ہوتی ہے ۔

۲۔ وارثوں کے ہر طبقہ میں اولاد ،باپ اور ماں کی جگہ ہوتی ہے ،یعنی اگر ماں باپ نہ ہوں تو ان کی میراث کا حصہ ان کی اولاد لیتی ہے ،مثلاً اگر مرنے والے کے ماں باپ اور اس کی پوتی اور نواسہ ہو، تو ماں باپ میں سے ہر ایک کو مال کا ۱/۶ حصہ ملے گا اور باقی مال تین حصوں میں تقسیم ہوتا ہے اور ان میں سے دو حصے پوتے کو اور ایک حصہ نواسے کو ملے گا ۔

۳۔ اگر مرنے والے کے ایک بیٹا اور ایک پوتا ہو تو تمام میراث بیٹے کو ملے گی اور پوتے کو کچھ نہیں ملے گا ۔

۴۔ اگر وارثوں کے حصے اور فرض اصل ترکہ سے زیادہ ہو تو،کمی کو بیٹیاں اور باپ کے رشتہ دار برداشت کریں گے ۔ مثلاً اگر مرنے والے کے وارث شوہر،باپ ،ماں اور کئی بیٹیاں ہوں تو چونکہ شوہر کا حصہ ۱/۴ اور ماں باپ میں سے ہر ایک کا حصہ ۱/۶ اور بیٹیوں کا حصہ ۲/۳ ہے اور یہ مجموعاً ۱۳/۱۲ ہوتا ہے اسطرح ۱۳/۱۲ تمام ترکہ سے یعنی عدد واحد زیادہ ہوتا ہے ۔ اس صورت میں شوہر ،باپ اور ماں کا پورا حصہ ادا کرنے کے بعد باقی بچے مال کو بیٹیوں میں مساوی طور پر تقسیم کیا جانا چاہئے ۔ اور کمی ان سے متعلق ہوتی ہے ۔ اہل سنت اس صورت میں کمی کو ہر ایک حصہ دار کے حصہ سے کم کرتے ہیں اور اسے ''عول'' کہتے ہیں ۔

۵۔ اگر تمام حصے اصل مال سے کم ہوں یعنی عدد واحد کم ہو اس طرح کہ فرض اور حصوں کو ادا کرنے کے بعد کچھ مال بچے تو باقی ماندہ مال کو بیٹی یا باپ کے رشتہ داروں یعنی کمی کا خسارہ برداشت کرنے والے رشتہ داروں کے حصہ میں شامل کیا جاتا ہے ۔ مثلاً اگر مرنے والے کی وارث ماں اور ایک بیٹی ہو تو ماں کا حصہ ۱/۳ ہے اور بیٹی کا حصہ ۱/۲ اور اس صورت میں ۱/۶ حصہ مال باقی بچتا ہے اسے بیٹی کو دیا جاتا ہے ۔ لیکن اہل سنت اس بچے ہوئے مال کو باپ کے رشتہ داروں ۔ جو بعد والا طبقہ ہے ۔ کو دیتے ہیں اور اسے '' تعصیب'' کہتے ہیں ۔

مرد و عورت کے حصوں میں جزئی فرق

اسلام کی نظر میں مرد و عورت انسانی طبیعت اور حقوق و معنویت کے لحاظ سے مساوی ہیں۔ لیکن ان دونوں صنفوں میں سے ہر ایک میں اپنی مخصوص خصوصیات کی بنا پر کچھ فرق بھی ہے ۔ جیسے میراث میں عورت کا حصہ مرد کے حصہ کا نصف ہے اور دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے برابر ہے اور مرد ایک وقت میں چار بیویاں رکھ سکتا ہے لیکن عورت کو ایک شوہر سے زیادہ کا حق نہیں ہے اور طلاق کا حق مرد کو ہے اور حکومت،فیصلہ اور جہاد مردوں سے مخصوص ہے اور عورت کے اخراجات مرد کے ذمہ ہیں ۔ البتہ یہ جزئی فرق جو اسلام میں مرد اور عورت کے درمیان پایا جاتا ہے ، اس کا سبب ان کی مخصوص فطرت اور جذ بات ہیں۔ کیونکہ دونوں صنفوں میں انسانیت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے۔

مرد اور عورت میں جو واضح فرق ہے وہ یہ ہے کہ عورت کی فطرت میں جذبات اور ہمدردیاں مرد کی نسبت زیادہ ہوتی ہیں ۔ یہ بات ناقابل انکار ہے کہ تمام ناموس کی طرح اس حکم کے بھی استثنائی مواقع بھی ہیں، یعنی دنیا میں ایسی عورتیں بھی پیدا ہوئی ہیں کہ ان کی عقلی توانائی بہت سے مردوں سے کہیں زیادہ تھی ، لیکن عام طور پر مردوں کی اکثریت میں عقل وفکر کی توانائی زیادہ رہی ہے اور جذبات واحساسات عورتوں میں زیادہ رہے ہیں ۔ یہ بات طولانی تجربوں اور آزمائشوں کے بعد ثابت ہوئی ہے کہ اسلام میں مرد اور عورت کے حقوق میں جو فرق پایا جاتا ہے ،اس کی علت یہی فکر اور جذبات اور دیگر طبیعی اسباب ہیں ۔ ہم یہاں پر اجمالی طور پر ان میں سے بعض فرق کو بیان کرتے ہیں ۔

مرد اور عورت کی میراث میں فرق

اسلامی نقطۂ نظر سے ، میراث میں عورت کا حصہ ،مرد کے حصہ کا نصف ہے۔ لیکن دقیق تحقیق سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام کا دوسرا حکم، یعنی عورت کے اخراجات کو مرد برداشت کرے،اس کمی کی تلافی کرتا ہے ۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ روئے زمین پر موجود تمام مال و دولت ہر زمانہ میں نسل حاضر کی ملکیت ہوتی ہے اور میراث کے ذریعہ دوسری نسل پہنچتی ہے اور وہ اس سے استفادہ کرتی ہے۔

اس لئے، مرد اور عورت کے ایک حصہ اور دو حصہ لینے (جو اعداد و شمار سے تقریباً مساوی ہے) کے معنی یہ ہیں کہ دنیا کی پوری دولت کا دوتہائی حصہ مرد کا ہے اور ایک تہائی حصہ عورت کا ہے۔ لیکن چونکہ اسلام میں عورت کے اخراجات اور اس کی زندگی کے لوازم عدالت و مساوات کی بنا پر مرد کے ذمہ ہے، لہذا مال کا نصف حصہ مرد کو جو زیادہ دیا گیا ہے وہ عورت پر خرچ ہوتا ہے اور وہ عورت اپنے حصہ کو بھی اپنے اختیار سے خرچ کرسکتی ہے ۔پس روئے زمین کی دولت کا دوتہائی حصہ اگر چہ ہر زمانہ میں مرد کا اور ایک تہائی حصہ عورت کا رہا ہے، لیکن اخراجات کے لحاظ سے مسئلہ برعکس ہے ۔

پس حقیقت میں اسلام نے ملکیت کے لحاظ سے دنیا کے مال کا دوتہائی حصہ تدبیر، فکر و عقل نظام چلانے والے کے ہاتھ میں دیا ہے اور اس کا ایک تہائی حصہ جذبات اوراحساسات کے سپرد کیاہے ۔لیکن اخراجات کے لحاظ سے اس کا دوتہائی حصہ جذبات واحساسات کے سپرد کیا گیا ہے اور ایک تہائی حصہ فکر و عقل کے سپرد کیا گیاہے ۔بدیہی ہے کہ مال و دولت کے سلسلہ میں عقل کی توانائی جذبات اور احساسات سے زیادہ ہے اور جذبات اوراحساسات مال کو خرچ کرنے میں عقل کی زیادہ محتاج ہیں کیوں کہ یہ ایک نہایت عادلانہ و عاقلانہ طریقہ ہے کہ دنیا کی دولت کو دو مختلف طاقتوں یعنی عقل وجذبات میں تقسیم کردیا جائے تا کہ یہ دونوں طاقتیں راضی رہیں جو زندگی میں کلیدی کردار ادا کرتی ہیں ۔

بیع (خرید و فروخت) بیع کیا ہے؟

''بیع'' کے معنی کسی مال کو بیچنے یا کسی مال کو دوسرے مال سے بدلنے کے ہیں، اس صورت میں کہ مال کا مالک جسے ''بیچنے والا'' کہتے ہیں ،اپنے مال کی ملکیت سے ان پیسوں کے عوض دست بردار ہوجاتا ہے جو کہ ،دوسرا شخص یعنی ''خریدار'' ادا کرتا ہے۔اور ''خریدار''،بھی مال کے عوض بیچنے والے کو اپنے پیسے دیدیتا ہے ۔واضح رہے کہ ''بیع'' ایک عقد ہے اور اپنے وجود میں طرفین (بیچنے والے اور خریدنے والے) کا محتاج ہے ۔اس لئے اس میں عقود کے عام شرائط جیسے بلوغ، عقل، قصد اوراختیار ہونا چاہئے ۔

بیع عقد لازم ہے

بیع،عقود لازمہ میں سے ہے یعنی عقد کے منعقد ہونے کے بعد متعاقدین (بیچنے والے یاخریدار) میں سے کوئی اسے توڑ نہیں سکتا ۔لیکن چونکہ کبھی بیع کے منعقد ہو جانے کے بعد غفلت یا غلطی سے بیچنے والے یا خریدار کو دھوکہ ہو جاتا ہے اور وہ قابل اعتنا نقصان سے دوچار ہوتا ہے، لہذا ایسے مواقع پر بیع کا انجام عام مصلحتوں کے خلاف ہوتا ہے۔ دین اسلام نے اس خرابی سے بچنے کے لئے دواقدام کئے ہیں : اول: ''اقالہ''وہ یہ ہے کہ بیع انجام دینے والے طرفین میں سے ایک پشیمان ہوجائے اور مد مقابل سے معاملہ توڑنے کی درخواست کرے تو مستحب ہے اسے قبول کرکے معاملہ کو توڑدیا جائے ۔ دوم : ''خیار'' یہ ایک خاص اختیار ہے جس کے تحت معاملہ کرنے والا معاملہ کو توڑ سکتا ہے ۔مشہور ''خیارات'' حسب ذیل ہیں : ا۔خیار مجلس: جب تک عقد کی مجلس برخاست نہ ہوجائے معاملہ کے طرفین معاملہ کو توڑ سکتے ہیں ۔

۲۔خیار غبن : یہ ہے کہ عقد کے طرفین میں سے کسی ایک نے دھوکہ کھایا ہو اور معاملہ میں نقصان اٹھایا ہو۔مثلاًمال اس کی اصل قیمت سے کم میں بیچ دیاگیا ہو یا اصل قیمت سے زیادہ میں خریدا گیا ہو ۔تو اس صورت میں طرفین میں سے جس کو نقصان ہوا ہے وہ فوراً معاملہ کو توڑ سکتا ہے ۔

۳۔خیار عیب: اگر معاملہ طے پانے کے بعد،خریدار مال میں کوئی عیب پائے تو وہ معاملہ کوتوڑ سکتا ہے ۔یا قیمت کے تفاوت کو حاصل کر سکتا ہے ۔

۴۔خیار حیوان :حیوانوں،جیسے بھیڑ اور گھوڑے وغیرہ میں خریدار تین دن تک معاملہ توڑنے کا حق رکھتا ہے ۔

۵۔خیار شرط: اگر بیچنے والا یاخریدار یادونوں اپنے معاملہ میں کوئی شرط رکھیں،تو وہ شرط کی خلاف ورزی کی صورت میں معاملہ کو توڑ سکتے ہیں ۔

نقد،ادھار،اور سلم :پیسہ لینے اور مال دینے کے لحاظ سے ''بیع''کی چار قسمیں ہیں : ا۔معاملہ انجام پانے کے ساتھ ہی خود مال اور پیسے ادا کئے جائیں تو اس بیع کو ''نقد''کہتے ہیں۔

۲۔معاملہ انجام پانے کے وقت مال خریدار کے حوالہ کردیا جائے لیکن اس کی قیمت تاخیر سے ادا ہونا قرار پائے ،تو اس معاملہ کو ''ادھار'' کہتے ہیں ۔

۳۔دوسری قسم کے برعکس پیسے نقد ادا کئے جائیں لیکن مال کو بعد میں دینا قرار پائے تو اس بیع کو ''سلم ''کہتے ہیں ۔

۴۔پہلی قسم کے برعکس معاملہ طے ہونے کے بعد مال اور پیسے دونوں بعد میں ادا کرنا قرار پائے تو اس بیع کو ''کالی بہ کالی ''کہتے ہیں مذکورہ چار قسموں میں سے بیع کی پہلی تین قسمیں صحیح اور چوتھی قسم باطل ہے۔

منابع وماخذ کی فہرست

۱۔ قرآن مجید

الف :

۲۔ احقاق الحق،قاضی سید نوراللہ الحسینی المرعشی التستری،طبع،الخیام،قم ۔

۳۔ اصول کافی،مرحوم کلینی،دارالکتب الاسلامیہ،تہران ۔

۴۔ امالی،شیخ مفید،دفتر انتشارات اسلامی،قم ۔ ب :

۵۔ بحارالانور،علامہ مجلسی،دار احیاء التراث العربی،بیروت،لبنان۔ ت :

۶۔ تاریخ طبری،محمد بن جریر طبری،دارالمعارف،مصر۔

۷۔ تحف العقول،ابو محمد حسن بن علی بن حسین شعبۂ حرانی،دفتر انتشارات اسلامی قم ۔ س :

۸۔ سفینۃ البحار،شیخ عباس قمی،انتشارات فراہان،تہران۔ ش :

۹۔ شرح غرر الحکم،جمال الدین محمد خوانساری،مؤسسۂ انتشارات وچاپ،تہران۔ ع :

۱۰۔ عوالی اللئالی،محمد بن علی بن ابراھیم احسائی،مطبعۂ سید الشہداء علیہ السلام دانشگاہ قم،ایران۔ غ :

۱۱۔ غایتالمرام،صمیری بحرانی،دارالھادی،قم۔

۱۲۔ الغدیر،علامہ امینی،دارالکتب العربی،بیروت،لبنان۔

۱۳۔غرر الحکم،مترجم محمد علی انصاری،مؤسسۂ صحافی خلیج،ایران،قم۔ک :

۱۴۔کنز العمال،علامہ علاء الدین علی المتقی بن حسام الدین الھندی، مؤسسۃ الرسالۃ،بیروت۔ م :

۱۵۔محجۃ البیضا،ملا محسن کاشان،دفتر انتشارات اسلامی،قم ۔

۱۶۔مستدرک الوسائل ، حسین نوری طبرسی،افست مطبعۃ الاسلامیہ۔

۱۷۔مسند احمد بن حنبل،مکتب اسلامی دار صادر،بیروت۔

۱۸۔میزان الحکمۃ،محمد ری شہری،مکتب العلوم الاسلامی،قم۔ن :

۱۹۔نہج البلاغہ صبحی صالح۔

۲۰۔نہج البلاغہ فیض الاسلام۔

۲۱۔نہج الفصاحہ،مترجم،ابو القاسم پاینده،سازمان انتشارات جاویدان۔و :

۲۲۔وسائل الشیعہ،شیخ حرّ عاملی،مکتبۃ الاسلامیۃ،تہران۔ ی :

۲۳۔ینابیع المودہ،قندوزی، موسسۂ اعلمی۔